آج

خصوصی شمارہ

ہندی کہانیاں (۴)

۷۳

پھنیشور ناتھ رینو

مدرا راکھشس

اصغر وجاہت

پنکج بشٹ

ترتیب

اجمل کمال

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

آج

ادبی کتابی سلسلہ شمارہ 73

جنوری 2012

سالانہ خریداری:

پاکستان: ایک سال (چار شمارے) 800 روپے (بشمول ڈاک خرچ)

بیرون ملک: ایک سال (چار شمارے) 80 امریکی ڈالر (بشمول ڈاک خرچ)

بینک: میزان بینک، صدر برانچ، کراچی

اکاؤنٹ: City Press Bookshop

اکاؤنٹ نمبر: 0100513669

رابطہ:

پاکستان: آج کی کتابیں، 316 مدینہ سٹی مال، عبداللہ ہارون روڈ، صدر، کراچی 74400

فون: 35213916 35650623

ای میل: ajmalkamal@gmail.com

دیگر ممالک:

Dr. Baidar Bakht, 21 White Leaf Crescent, Scarborough.
Ontario M1V 3G1, Canada.
Phone: (416) 292 4391 Fax: (416) 292 7374
E-mail: bbakht@rogers.com

ترتیب

پھنیشور ناتھ رینو

9 اچھے آدمی

31 تھیسز والا

38 رسول مستری

49 رومانس سے خالی پریم کہانی کی تمہید

67 ٹیبل

89 لکیریں، دائرے

⊛

مدرا راکھشس

104 ہیرابائی ناچے گی

116 چوہے

129 سانچی بولو راجہ

138 رس کی

147 آسیب

159 ایک بندر کی موت

171 جلے مکان کے قیدی

Scanned with CamScanner

جنگ	192
ماتم پرسی	205
نی	214
خرگوش	224
کشتی	231

❁

اصغر وجاہت

سرگم کولا	242
آن کاڈر	252

❁

پنکج بشٹ

ایسٹ انڈیا کمپنی	262
کفر	270
گھیراؤ	278

نئی کتابیں

ثقافتی گھٹن اور پاکستانی معاشرہ

ارشد محمود

R s.200

روشن دان

(خاکے)

جاوید صدیقی

R s.200

لغات روزمرہ (تیسرا ایڈیشن)

اردو زبان میں غیر معیاری استعمالات کی
فہرست و تنقید کچھ مزید لسانی نکات کے ساتھ

شمس الرحمٰن فاروقی

Rs.400

اردو کا ابتدائی زمانہ

(تنقید و تحقیق)

(تیسرا ایڈیشن)

شمس الرحمٰن فاروقی

Rs.250

بوف کور

(ناول)

صادق ہدایت

فارسی سے ترجمہ: اجمل کمال

Rs.200

گمشدہ چیزوں کے درمیان

عالمی ادب سے انتخاب

(منتخب ترجمے)

محمد سلیم الرحمٰن

Rs.250

شہنشاہ

(ناول)

ریشارد کاپوشنسکی

انگریزی سے ترجمہ: اجمل کمال

Rs.200

زٹل نامہ

(کلیات)

جعفر زٹلی

مرتب: رشید حسن خاں

Rs.300

Scanned with CamScanner

سہ ماہی ادبی کتابی سلسلے "آج" کی اشاعت ستمبر 1989 میں کراچی سے شروع ہوئی اور اب تک اس کے 71 شمارے شائع ہو چکے ہیں۔ "آج" کے اب تک شائع ہونے والے خصوصی شماروں میں گابریئل گارسیا مارکیز، "سرائیوو سرائیوو" (بوسنیا)، نرمل ورما اور "کراچی کی کہانی" کے علاوہ عربی، فارسی اور ہندی کہانیوں کے انتخاب پر مشتمل شمارے بھی شامل ہیں۔

"آج" کی مستقل خریداری حاصل کر کے آپ اس کا ہر شمارہ گھر بیٹھے وصول کر سکتے ہیں اور "آج کی کتابیں" اور "سٹی پریس" کی شائع کردہ کتابیں 50 فیصد رعایت پر خرید سکتے ہیں۔
(یہ رعایت فی الحال صرف پاکستانی سالانہ خریداروں کے لیے دستیاب ہے۔)

چار شماروں کے لیے شرح خریداری (بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)
پاکستان میں: 800 روپے
بیرون ملک: 80 امریکی ڈالر

آج کے کچھ پچھلے شمارے محدود تعداد میں دستیاب ہیں

اس کے علاوہ ماہنامہ "شب خون" الہ آباد
کے بھی کچھ پچھلے شمارے محدود تعداد میں دستیاب ہیں

Scanned with CamScanner

ہماری کتابیں

ساری نظمیں
(کلیات)
ذی شان ساحل
Rs.750

وجہ بیگانگی
(غزلوں کا مجموعہ)
ذی شان ساحل
Rs.150

زندگی میرے پیروں سے لپٹ جائے گی
(نظمیں)
تنویر انجم
Rs.350

بے یقین بستیوں میں
(نظمیں)
علی اکبر ناطق
Rs.150

ریت پہ بہتا پانی
(شاعری)
قاسم یعقوب
Rs.160

مٹی کی کان
(کلیات)
افضال احمد سید
Rs.500

خودکشی کے موسم میں
(نظمیں)
زاہد امروز
Rs.120

سویرے کا سیاہ دودھ
(نظمیں)
جرمن شاعر پاؤل سیلان
ترجمہ: آفتاب حسین
Rs.150

مٹی کا مضمون
(نظمیں)
فرخ یار
Rs.150

رات
(نظمیں)
سعید الدین
Rs.50

Scanned with CamScanner

آج کی کتابیں

کراچی کی کہانی
(جلد اول و دوم)
ترتیب: اجمل کمال
Rs.1100

قرۃ العین حیدر کے خطوط
ایک دوست کے نام
ترتیب: خالد حسن
Rs.180

مرثیہ خوانی کا فن
(تنقید و تحقیق)
نیر مسعود
Rs.150

لغات روزمرہ
(تنقید و تحقیق)
شمس الرحمٰن فاروقی
Rs.250

منتخب مضامین
(تنقید و تحقیق)
نیر مسعود
Rs.280

ریت پر لکیریں
(انتخاب)
محمد خالد اختر
Rs.300

انیس
(سوانح)
نیر مسعود
Rs.375

مٹی کی کان
(کلیات)
افضال احمد سید
Rs.500

آئینۂ حیرت
اور دوسری تحریریں
سید رفیق حسین
Rs.375

کانکا کے افسانے
(افسانے)
نیر مسعود
Rs.70

Scanned with CamScanner

پھنیشورناتھ رینو

ہندی سے ترجمہ: شہاب الدین گیلانی

اچھے آدمی

اُجاگر نے دونوں کیتلیوں کو تازے چولھے پر چڑھا کر سامنے، پورب کی طرف دیکھا۔ رات سے ہی برسات کا موسم شباب پر ہے۔ سورج اُگا ہے یا نہیں، پتا نہیں چلتا۔ بادل ہلکی پروائی کے جھونکے پر اُمڈے آرہے ہیں۔ دور پھوہیا ورشا (ہلکی بارش) میں پیڑوں کی پتیاں چھپ رہی ہیں۔ سامنے — کھلا ہوا بڑا میدان! ہریالی پر بچھی ہوئی — پکی پیچ روڈ۔ نئی سڑک۔ اُجاگر کا جی نہ جانے کیوں اچانک ہلکا ہو گیا۔ من میں رات بھر اس پسنجر کی بولی چبھتی رہی تھی — چھی! چھی! — ''تم تو منہ دیکھ کر چائے میں چینی ڈالتے ہو۔ اُدھر پکوڑیوں میں بھی ہاتھ کی صفائی کا کھیل ہوتا ہے۔ کسی کو ہری مرچی اور ادرک کے ٹکڑے ڈال کر گرما گرمی پکوڑی دی جاتی ہے اور کسی کو سڑے پیاز اور باسی بیسن کی۔''

ضرور وہ پسنجر جوگ بنی یا فاربس گنج سے دارو پی کر چلا ہوگا۔ ایسا منہ پھٹ پسنجر اُجاگر نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

اجاگر نے پھر میدان کی طرف دیکھا۔

میدان کا داہنا حصہ پھوہیا ورشا میں ڈھک چھپ رہا ہے۔ سرکاری جنگل محکمے کے نئے بانس کے بن میں ہزاروں پتاکے (جھنڈے) اڑ رہے ہیں، مانو بانس کے نئے پودوں کی نئی 'کچیوں' کے ہر پتاکے، کاس کے صاف غالیچے، سب ڈھک گئے۔ دو ہی سال کے بعد یہ بانس کا جنگل بیجو بن بیجو کھنڈ ہو جائے گا۔

Scanned with CamScanner

[illegible] گاؤں [illegible] سب سے دکھنی چھور (کنارے) پر اونچی جگہ پر ہے۔ سامنے دور تک [illegible]۔ [illegible] ماری ہوئی زمین کوسی کی سوکھی اور بالو سے بھری دھارا تک اور بڑھ [illegible] سی تک پکی سڑک پچھلے سال ہی بن کر تیار ہوئی ہے۔ [illegible] پہلی بار [illegible] گھر تک [illegible] کے لیے ہی مڑ [illegible]۔ اجاگر کے گھر کو چھو کر پھر داہنی طرف مڑ گئی ہے۔

[illegible] ہوئی دھرتی کے گلے میں چندرہار کی طرح پڑی [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] (ماں) کے گلے میں پڑے چندرہار [illegible] [illegible] ست کیوں ہے؟ کیتلیوں میں چائے کا پانی کھول رہا ہے۔ ابھی [illegible] آخر بات کیا ہے؟"

[illegible] سے بیٹے کو پکارا۔ [illegible]

[illegible]

اندر سے کوئی آواز نہیں آئی۔

[illegible] اجاگر کا شعبہ — چائے [illegible] [illegible] سب ٹھیک ہے، لیکن آخر بات کیا ہے؟

[illegible] بس پڑاؤ ہے۔ قریب میں پچیس گاؤں [illegible] [illegible] سے آنے والی بس اور [illegible] [illegible] سے چلنے والی گاڑی کو ایک سے سوا گھنٹہ تک رک جاتا ہے۔ اسی [illegible] کے سامنے [illegible] پندرہ منٹ رکتی ہے۔

[illegible] کی دکان کے پکوڑوں اور چائے کا خوب نام ہو گیا ہے۔ [illegible] بھی تعریف کرتے ہیں۔

[illegible]

نہائی دھوئی پردیپ کمار کی ماں کو دیکھ کر اجاگر کا ہلکا جی اور بھی گدگدا اٹھا۔ گلاس میں گرم پانی ڈالتے ہوئے وہ مسکرایا۔ پردیپ کمار کی ماں بھی تنک مسکرائی۔ تو من کی بات کو وہ من میں اب نہیں رکھ سکا۔ بول پڑا: ''اب ریڈیو 'فٹ' کرانا ضروری ہے!''

کل تک اجاگر کی سمجھ میں دکان میں ایک دیوار گھڑی 'فٹ' کرنا ضروری تھا۔ آج اچانک ریڈیو کی بات سن کر پردیپ کمار کی ماں کو اچنبھا ہوا۔ وہ اچکچائی۔

اجاگر بولا، ''ریڈیو میں ایک ہی بات نہیں، تین تین بات ہے... من ہو تو گانا سنو، من ہو تو خبر سنو اور جاننا ہو تو 'ٹیم' بھی معلوم کرلو۔''

پردیپ کمار کی ماں نے کڑاہی چڑھا دی۔

آنگن سے آنکھیں ملتا ہوا پردیپ کمار نکلا۔ اجاگر نے پیار سے بلایا، ''ادھر آؤ بابو... بیٹا!''

ہر روز پہلے تین گلاس... سب سے پہلے پردیپ کمار کو، پھر پردیپ کمار کی ماں کو، اور تب خود... پردیپ کمار دن بھر میں پانچ گلاس چائے پیتا ہے۔

بسوں میں چڑھنے والے 'کچہریا پسنجر' ایک ایک کر آنے لگے۔ بیل گاڑی پر کوئی نئی دلہن ہے کیا؟ ساون بھادوں میں نیہر (میکے) جا رہی ہے۔ یہ سائیکل والا آکر پھر تنگ کرے گا۔ یہ سائیکل رکھنے کی ذمے داری اب اجاگر اپنے اوپر نہیں لے سکتا۔ تالا لگانے پر بھی نہیں۔

پہلی بس کی کشن پور کے بابو نے۔ ''چار آنے کے پکوڑے اور دو گلاس چائے۔ دودھ چینی برابر برابر۔ گلاس ذرا بڑھیا سے دھو کر۔''

پردیپ کمار کی ماں نے گھونگھٹ کے اندر سے ہی دیکھا۔ کشن پور کے بابو کی نظر اس کی کلائی سے لے کر بانہہ تک گدی ہوئی مچھلیوں پر ہے۔ کئی جوڑی مچھلیاں اچھل رہی ہیں۔

پردیپ کمار کی ماں نے بانہہ کی مچھلیوں کو آنچل کھینچ کر ڈھک دیا۔ کشن پور کے بابو نے کہا، ''پکوڑے ذرا اور کھرے گرم سے...''

چھنوٹے میں چھنے پکوڑوں کو پھر سے کھولتے ہوئے تیل میں ڈال دیا پردیپ کمار کی ماں نے۔ گیلی پروائی کے جھونکے میں گرم پکوڑوں کی سوندھی سوندھی سگندھ گاؤں میں دھیرے دھیرے پھیلنے لگی۔

Scanned with CamScanner

پکوڑے! چاء! چائے! اچھا!

گاؤں کا بوڑھا سنتوکھی سنگھ روز اسی وقت آتا ہے... روز! نیم بندھا ہوا ہے۔ بس۔ آکر بوہنی [illegible] ہو تو بڑے صبر کے ساتھ انتظار کرتا ہے۔ بوہنی ہوئی کہ اس کی ٹنکی بجی۔ "جے سری سیتا رام!"

آج بوہنی ہونے کے بعد بھی سنتوکھی سنگھ کی طرف دھیان نہیں دیا جا رہا ہے۔ سنتوکھی سنگھ [illegible] موضوع پر کوئی گپ شروع کر دیتا ہے۔ گپ یقینی طور سے کسی چوری ڈکیتی یا 'گھر گھسی' کی ہوتی۔ گھر گھسی میں پکڑے گئے چور کو 'چم چور' کہتے ہیں۔

آج سنتوکھی سنگھ نے پاس کے گاؤں میں ہوئی چم چوری میں پکڑے گئے کسی چم چور کی کہانی شروع کی۔

سنتوکھی سنگھ [illegible] بھی [illegible] لوگ جانتے ہیں۔ جاتی (برادری) والوں نے [illegible] سنتوکھی سنگھ [illegible] ہے۔ جاتی کا حقہ پانی چھوٹنے پر سنتوکھی سنگھ اب [illegible] اور اب تو پکوڑے چائے کھا پی رہا [illegible] سنتوکھی سنگھ [illegible] وفادار [illegible]۔ بہت بہت [illegible] اور [illegible] ہے [illegible] کوئی نئی واردات نہیں ہوتی ہے تب سنتوکھی سنگھ کوئی پرانی کہانی یوں ہی شروع کر دیتا ہے۔

لیکن آج کی کہانی تازہ ہے، جو کل رات کو ہی ہوئی ہے۔

[illegible] مسکراہٹ پیدا کرتے ہوئے اس بات کی تائید کی۔

"ہاں [illegible] رات میں [illegible] ہو رہا تھا، کیوں؟... سی کی..."

[illegible] گاؤں کے پنچوں نے [illegible] رفع دفع کر دیا ہے، سنتوکھی سنگھ کو یہ خبر بھی مل چکی ہے۔

[illegible] پنچ کی بات سے باہر کیسے جائے بیچاری۔

پردیپ کمار کی ماں نے پکوڑے نہیں دیے۔

[illegible] کہا: "سنتوکھی کاکا، پکوڑے گاڑی جانے کے بعد۔"

[illegible] سنتوکھی سنگھ نے [illegible] رکھنے والے [illegible] کی طرف کھسکا کر

پوچھا۔

پردیپ کمار کی ماں نے گھونگھٹ کے اندر سے ہی اجاگر کو اشارے سے پوچھو کہا۔ کیلے کے پتے پر گرم پکوڑے لاکر سامنے رکھ دیے اُجاگر نے۔ ادھر کئی دنوں سے سنتوکھی سنگھ اسی طرح تیور چڑھا کر باتیں کرنے لگا ہے۔

سنتوکھی سنگھ نے کشن پور کے بابو سے کہا: "راسو بابو، یہ سسری سڑک جب سے چالو ہوئی ہے، چوری چکاری اور بھی بڑھ گئی ہے۔ پہلے تو سالا گاؤں کے آس پاس کے ہی چور! کھیت چوری ڈکیتی کرتے تھے۔ اب تو ملیہاری گھاٹ کا چور سالا جوگ بنی آکر چوری کر جاتا ہے — راتوں رات — بے داغ!"

کشن پور کے بابو نے اعتراض کیا: "اس میں سڑک کا کیا قصور؟ بنا سڑک کے ہی کلکتے کے لوگ کٹیہار میں پاکٹ مارتے ہیں۔"

کشن پور کے بابو کو معلوم ہے۔ سڑک بنتے وقت علاقے میں کئی سڑک مخالف تحریکیں چلی تھیں۔ لوگوں کو ابھارنے کے لیے تحریک کے نیتاؤں نے اس بات پر سب سے زیادہ زور دیا تھا — سڑک کھلتے ہی کلکتیا پاکٹ ماروں سے لے کر پٹنہ کے ٹھگ دن دہاڑے گاؤں میں گھس کر دندناتے پھریں گے۔

کشن پور کے بابو نے اپنی کلائی پر بندھی گھڑی دیکھی، پھر کان کے پاس لاکر سنا۔ بس لیٹ ہے یا گھڑی بند ہے؟

اجاگر بولا: "دونوں طرف کی گاڑی آج لیٹ ہے۔ رات میں جوگ بنی کی طرف زور سے برکھا ہوئی ہے۔"

سنتوکھی سنگھ بولا: "پورب میں بھی ہوئی ہے۔"

جاگر کو چوری ڈکیتی کی کہانی ذرا بھی نہیں اچھی لگتی۔ تس پر آج چھ چوری کا قصہ۔

جاگر نے چھ چوری کے موضوع کو اچھی طرح بدلنے کے لیے بات کا سرا اپنے ہاتھ میں لے لیا: "پورب پچھم، اتر دکھن، سب طرف پانی برسا ہے۔ صرف اپنے علاقے میں..."

سنتوکھی سنگھ نے بیچ میں ہی کاٹ دیا: "ارے! اس علاقے میں کیا پانی برسے گا۔ سالا ان

Scanned with CamScanner

"ارے چودھری جہاں ہوتا ہے وہاں پانی برسے گا؟ بجلی گرے گی، ہڑ ہڑ یا بجلی!"

بادل گج گج گرجا۔ پردیپ کمار کی مائے گھونگھٹ کے نیچے ہنسی۔ "بادل نہیں، بس کی آواز!"

پردیپ کمار کی مائے کو پچھلے سال کی برسات کی بات یاد آئی۔ برسات میں پکوڑے اور چائے کی بکری بڑھ جاتی ہے۔ چھاتا دھوتی گروی رکھ کر بھی آدمی پکوڑے کھا کر چائے پیتا ہے۔

کشن پور کے بابو نے پلاسٹک پیپر کے بڑے تھیلے سے 'واٹر پروف' نکالا۔ ملیریا محکمے کے دوا چھڑکنے والے سے بہت پیروی کے بعد یہ برساتی ملی ہے۔ جھماجھم پانی پڑے لیکن کپڑے کا ایک سوت بھی نہیں بھیگتا۔

کشن پور کے بابو نے اٹھتے اٹھتے اجاگر کو صلاح دی: "ادھر چار ہاتھ اور بڑھا کر بیٹھنے کی جگہ بنا کر چھاؤں کیوں نہیں دیتے؟"

پردیپ کمار کی مائے نے ماتھے کے اوپر ساڑھی کھینچ کر اجاگر سے کچھ کہا۔ کشن پور کے بابو کی آنکھوں میں مندی ہوئی مچھلیاں پھر سے چلبلانے لگیں۔

اجاگر نے کہا، "راسو بابو، ایک گاڑی بانس کے بنا سب کام رکا ہوا ہے۔ آپ کے دربار میں ایک دن عرضی لے کر..."

کشن پور کے بابو نے دیکھا گھونگھٹ سے ایک جوڑی آنکھیں بھی کچھ کہہ رہی ہیں۔ بولے، "اچھی بات ہے، ایک دن آنا۔ ایک گاڑی کیوں، دو گاڑی بانس مل جائے گا۔"

اجاگر نے دانت نپور کر پردیپ کمار کی مائے کی طرف دیکھا۔ پردیپ کمار کی مائے نے آنکھوں سے ہی باتیں کیں، "میں نے کہا تھا نا، راسو بابو اچھے آدمی ہیں۔"

سنتو کھی سنتو بولا: "ایک گاڑی گھاس کیوں نہیں مانگی تم نے؟ آج راسو بابو کا دل دریا ہو گیا ہے۔"

بارش شروع ہوئی۔ دونوں طرف سے بس آئی۔ ایک ہی ساتھ!... پکوڑے، چائے، پیسے، سنے پیسے۔ اجاگر کو آج بات کرنے کی فرصت نہیں۔

"ایک پلیٹ پکوڑے، بنا مرچ کے۔"

پردیپ کمار کی مائے نے گھونگھٹ کے نیچے سے ہی کچھ کہا۔ وہ آج بنا مرچوں کے پکوڑے

Scanned with CamScanner

الگ سے کسی گاہک کے لیے نہیں بنا سکے گی۔

"لال گاڑی کے ڈرائیور جی مانگتے ہیں۔"

پردیپ کمار کی مائے بنا مرچ والا بیسن پھینٹنے لگی۔

لال گاڑی کا ڈرائیور اچھا آدمی ہے۔ مٹیھاری گھاٹ میں جہاز سے اترنے والے مسافروں کو بھی وہ اجاگر کی دکان کے پکوڑوں اور چائے کی تعریف سنا کر پھانس لاتا ہے۔

"بھائی، راستے میں کہیں چائے پینا اور پیسہ پھینکنا برابر ہے۔ چائے ناشتہ چل کر رکسول میں کیجیے گا۔ ایک بار چکھ کر دیکھیے گا تو پھر کبھی نہیں بھولیے گا۔ گرما گرم چائے اور کرارے پکوڑے!"

لال گاڑی کا ڈرائیور ایسی جگہ گاڑی لگاتا ہے جہاں سے پردیپ کمار کی ماں کی آنکھیں ترچھی نگاہ سے دیکھنے پر ٹکرا جاتی ہیں۔

گاڑی میں بیٹھے ہوئے مسافروں کی نظر دکان کے سامنے والے حصے پر ہی پڑتی ہے۔ جدھر پردیپ کمار کی مائے بیٹھتی ہے اُدھر بانس کی تیلیوں کی ٹٹی لگی ہوئی ہے — چھوٹی سی آڑ میں بیٹھی ہوئی پردیپ کمار کی مائے کا صرف ہاتھ دکھائی پڑتا ہے۔ پکوڑے ڈالتی ہوئی انگلیاں۔ چھنوٹے سے پکوڑے نکال کر برتن میں رکھتے وقت کانچ کی چوڑیاں میٹھے سُر میں بج اٹھتی ہیں۔

اُجاگر کو اِدھر اُدھر دیکھنے کی چھٹی کہاں!

گلاس، چینی، پانی، پتی، چمچ، پیسہ، گاہک۔

پکوڑوں کا بل لیتے وقت ایک بار وہ پردیپ کمار کی مائے کی طرف ضرور دیکھ لیتا ہے۔

"دیکھیے بھائی، ہلا گلا نہیں، شانتی سے ... شانتی سے!"

دونوں گاڑیاں آ کر چلی گئیں۔

پردیپ کمار کی مائے اٹھ کر اندر گئی۔ اُجاگر ریزگاریوں کا حساب کرنے لگا۔

سنتوکھی سنگھ کو ایک گلاس چائے اور چاہیے۔ زوروں کی بارش شروع ہوئی۔ اجاگر نے کہا،

"پانی گرم ہونے دیجیے۔"

اجاگر نے بچپن سے ہی چائے بنانے کا کام کیا ہے۔

Scanned with CamScanner

کمل دہ کے زمیندار کی ڈیوڑھی میں ہر کام کے لیے الگ الگ نوکر چاکر تھے — چائے بنانے والا، چلم سلگانے والا، تیل مالش کرنے والا، بھنگ گھوٹنے والا۔

کمل دہ سے زمینداری چلی گئی۔ لیکن اجاگر کے ہاتھ کا 'علم' ہاتھ میں ہی رہ گیا۔ اس علم سے اس نے من کی کامنا پوری کی۔ گھر میں لچھمی آئی...!

جب پورکاس کی اپنی آبائی زمین پر گھر بنا کر ایک 'روپ والی' گھرنی لانے کی خواہش اس کے من میں بچپن سے ہی گھر بنا کر بیٹھی تھی۔ کمل دہ کے چھوٹے بابو کی دلہن جیسی گھروالی مل جائے تو اجاگر ساری عمر صرف روپ پی کر رہ سکتا ہے۔

روپ والی دلہن!

بالو والی زمین کا کوپ (کنواں) اور گاؤں کی لڑکی کا روپ — دونوں برابر۔ بالو والی زمین سے کنویں کا پانی کتنا ٹھنڈا ہوتا ہے۔ ایک گھونٹ پی کر ہی آتما میں تراوٹ آ جائے۔ گاؤں کی لڑکی کا روپ بھی ایسا، دیکھ کر ٹھنڈک آ جاتی ہے آنکھوں میں۔ لیکن بالو والا کنواں دو سال میں بیٹھ جاتا ہے۔ گاؤں کا روپ سال لوٹتے ہی ڈھل جاتا ہے۔

اجاگر نے بھاگلپور، دربھنگہ اور پٹنہ جیسے شہروں میں گھوم گھوم کر نوکری کی۔ کہیں روپ کی جھلک نہیں ملی۔ سب نقلی — چکنی کلی پھار جیسی اوپر سے... اس کو بھلا روپ کہتے ہیں؟

شہر سے وہ روپ کی گٹھری لے آیا۔ من کی جھولی اس کی خالی ہی رہی۔

گاؤں کے ٹھگ والوں نے اجاگر کو ٹھگ کر بہت پیسہ کھایا۔ برادری کے پنچوں نے پان سپاری سے تا، پر پچ سو روپے جھٹک لیے — 'روپ والی' گھرنی نہیں ملی۔

لیکن اجاگر مایوس نہیں ہوا۔ کمل دہ کی چھوٹی دلہن نے ایک دن کہا تھا: ''اجاگر، چائے پکڑ کر تم اندر اس پری کو بھی پھسلا کر مٹھی میں کر سکتے ہو!''

اجاگر نے چھوٹی دلہن کی بات یاد کی اور ایک دن گھر سے نکل پڑا — کہیں چائے کی دکان پر نوکری بھی مل جائے، وہ کرنے کو تیار ہے۔

اجاگر اس (شہد) کو کیسے بھول سکتا ہے بھلا۔

کرسیلا اسٹیشن پر اتر کر وہ بہت دیر تک بیٹھا رہا۔

Scanned with CamScanner

کھیرا خریدکرکھاتے وقت اس کو بچپن کے ایک کھیل کی یاد آئی تھی۔ بچے کھیرے ککڑی کے بیج کو انگلیوں میں دبا کر کہتے: ''فلاں کی شادی کدھر ہوگی؟'' بیج چھٹک کر جس طرف گرے۔ اُدھر ہی، اُسی دِشا میں۔

اجاگر نے کھیرے کے ایک بیج کو انگلیوں میں دبا کر من ہی من میں کہا تھا: ''بیج جس طرف چھٹکے گا، میری ہونے والی خوبصورت دلہن اُدھر ہی ہوگی۔''

بیج اُتر کی طرف چھٹکا اور بنا کچھ سوچے بچارے وہ کرسیلا سے رانی گنج جانے والی بس پر جا بیٹھا تھا۔

کنڈکٹر نے پوچھا: ''کہاں جائے گا؟''

اجاگر کیا جواب دے؟ نہ جانے یہ گاڑی کہاں کہاں جاتی ہے! تب تک بغل کے مسافر نے بَرولی کا ٹکٹ مانگا اور اجاگر نے بھی برولی تک کا ٹکٹ کٹا لیا۔

گاڑی برولی پہنچ کر پکوڑوں والی سہوائن کی دکان کے سامنے رکی۔ برولی میں اترنے والے اتر گئے۔ اجاگر بیٹھا رہا۔ برولی گاؤں میں اتر کر وہ کیا کرے گا؟ وہ آنکھیں موند کر کچھ سوچ رہا تھا کہ کنڈکٹر نے اسے ٹھیل کر جگایا: ''اے، برولی آ گیا، اترو۔''

اجاگر نے اپنی جھولی سنبھالی اور نہ چاہتے ہوئے اترا۔

بس سے اترنے والے لوگ پکوڑے والی کی دکان پر تھوڑی دیر رکے اور جل پان کر کے چلے گئے۔ اجاگر چپ چاپ بغل میں ایک موڑھے پر بیٹھا رہا۔ بوڑھی سہوائن نے پکوڑوں کی کڑاہی اتار کر اجاگر سے پوچھا: ''کہاں جانا ہے؟''

اجاگر نے کھنسا کر جواب دیا: ''کہیں نہیں۔ ایک آنے کے پکوڑے ہم کو بھی چاہییں۔''

بوڑھی جھنجھلائی: ''اتنی دیر سے منھ سی کر بیٹھے رہے۔ اب کڑاہی اتارنے کے بعد ایک آنے کے پکوڑے! اب پکوڑے نہیں، اگر بینگنی پکوڑے کھانے ہیں تو بولو، چڑھاؤں کڑاہی؟... اری او سیتیا! کب تک بیٹھ کر بینگن کاٹے گی؟ اے، دے جا جتنا ہوا ہے۔ گاہک بیٹھا ہوا ہے یہاں۔''

جھونپڑے کے اندر سے اسی انداز سے پتلی آواز میں جواب آیا: ''کل سے میں کانا کیڑا بینگن نہیں کاٹوں گی۔ ایک ایک بینگن میں پانچ پانچ پلو (کیڑے)!''

بوڑھی نے سیتیا نامی لڑکی کو جھنجھلا کر ایک بھدی سی گالی دی۔

سیتیا سوپ میں بینگن کے ٹکڑے لے کر آئی۔ "میں روز تم سے کہتی ہوں موسی، پردیسی یاتری کے سامنے گالی مت بکا کرو۔"

اجاگر سیتا عرف سیتیا کا روپ دیکھ کر پہلے سے زیادہ ہو گیا تھا۔ ایک ایک پیسے میں پانچ پانچ پھلوری اور بینگنی بھری گالی سن کر اس کو لگی رہی تھی، سو سیتیا کو دیکھنے کے بعد ہی دور ہو گئی۔ . . . یہی ہے روپ! ایسا ہے روپ!

اس نے گلا صاف کیا۔ "ماتا رام، ایک آنے کی بینگنی نہیں، چار آنے کی۔"

بوڑھی بولی: "اوں! ای آدمی کا منہ رہ رہ کر بند ہو جاتا ہے۔ جو بولنا ہو، ایک ہی بار کیوں نہیں بولتے؟"

اجاگر خاموش رہا۔ لیکن گاہک کی طرف داری کرتے ہوئے سیتا بولی: "ایک بار بولے چاہے ہزار بار — تو اس طرح گاہک سے بات بات پر جھگڑا کرے گی تو ایک پل کی بینگنی بھی نہیں بکے گی۔"

بوڑھی کڑاہی میں بینگنی ڈالتی ہوئی بولی: "بڑی آئی ہے بھتار (شوہر) کی طرف داری کرنے والی!"

جب بوڑھی اور جوان عورتوں کی بات بات پر (لفظی جنگ) زور پکڑنے لگی تو اجاگر نے مردانگی دکھلائی: "چھی چھی، آپ لوگ اس طرح سے جھگڑتی ہیں کہ تو رکھیے اپنی بینگنی، ایسی بینگنی کون کھاتا ہے؟"

سیتا بولی: "لو، خفا ہو گئے؟ اچھا تو بیٹھ کر چار آنے کی بینگنی۔ دیکھوں کون کھاتا ہے؟"

بوڑھی بولی: "نہیں کھائے گا تو پیسہ کہاں سے جائے گا۔"

سیتا نے جا کر کھڑکی بند کر دی اور منہ کی بات منہ میں ہی رکھ کر اندر چلی گئی۔

اجاگر بیٹھ کر سوچتا رہا۔ چار آنے کی بینگنی وہ کھا سکے گا؟ یہ چنگیری بھر بینگنی؟

بوڑھی سیتیا سے پکارا: "اری او سیتیا، پتیل کہاں ہے؟ بینگنی تیرے سر پر دوں؟"

اجاگر بینگنی کھانے لگا۔ تب بوڑھی نے نرم لہجے میں کہا: "بھیا، برا مت ماننا، منہ جلی سیدھی بات کبھی سنتی ہی نہیں۔ ٹھہرو، میں پانی دوں۔"

بوڑھی کے اٹھنے سے پہلے ہی سیتا پانی لے آئی۔ "میں جانتی ہوں، اب گاڑی آنے کا وقت

ہوا تو تُو کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر چولھے کے پاس سے اٹھے گی ہی۔ کڑاہی اٹھا کر سڑک پر پھینک دوں گی، ہاں۔"

بوڑھی پھر بیٹھ گئی۔ وہ کوئی بھدی گالی زبان پر چڑھا رہی تھی کہ اجاگر نے ٹوک دیا: "یہاں ایک چائے کی دکان خوب چلے گی، ماتا رام۔"

سہاگن نے پوپلے منھ کو کچھ بھینچ کر پوچھا: "کیا چلے گی خوب؟"

"چائے کی دکان۔"

"کون کھولے گا؟"

"کوئی بھی کھولے، چلے گی خوب۔"

بوڑھی اب کڑھ کر بولی: "آگ لگے چائے کی دکان میں۔ ایک پکوڑے کے چولھے میں ہی میری ہڈی جل کر راکھ ہو رہی ہے۔" سیتا نے اس بار پھر اجاگر کو دیکھا۔ چائے کی دکان کی بات سن کر ہی اس نے ایسی نگاہ سے دیکھا ہے۔ اجاگر بولا: "چائے میں تھوڑا منافع ہے۔ چار آنے کے مال میں دو روپے منافع!"

"دو روپے!" بوڑھی موسی اور جوان سیتا نے ایک ہی ساتھ حیرت بھرے لہجے میں کہا: "دو روپے!"

بوڑھی کچھ لمحے چپ رہنے کے بعد بولی: "رہے دو بابا منافع۔ یہاں چائے کون پئے گا؟"

سیتا نے کہا: "ملنے پر سبھی پیے گا۔"

اجاگر بولا: "واجب بات۔"

بوڑھی نے تھوتھنا چمکا کر پوچھا: "میں پوچھتی ہوں چائے بنائے گا کون، تیرا بھتار (میاں) ایں؟"

سیتا نے اس بار پلٹ کر گالی دی: "میرا نہیں، تیرا۔"

'تیرا' گالی سن کر پوپلی بوڑھی ہنس پڑی۔ سیتا بھی ہنسی اور اجاگر کا کلیجہ زور سے دھڑک اٹھا۔

کچھ دیر تک چپ رہنے کے بعد اس نے تول کر بات شروع کی: "ہاں، چائے کی دکان تو مرد ہی چلا سکتا ہے۔"

Scanned with CamScanner

بوڑھی نے لمبی سانس لی۔ سیتا پھر آنگن سے اندر چلی گئی۔ اجاگر بہت دیر تک بوڑھی ماں کو تفصیل سے چائے کی دکان کے منصوبے کے بارے میں سمجھاتا رہا۔

دوسری گاڑی سے لوٹنے سے پہلے ہی اجاگر نے بوڑھی ماں سے ہنستی بولی سے موہ لیا۔ "ماتا رام! آپ لوگوں کی مرضی ہو تو میں آج ہی جا کر سامان لے آؤں۔"

"تمھارا گھر کہاں ہے؟"

"رنبیر پور۔"

"کون جات؟... ارے، تب تو برادری کے ہی نکلے۔"

بات پکی ہو گئی۔

اجاگر شہر بازار گیا اور چائے کی دکان کا سارا سامان خریدا۔ رات کی گاڑی سے ہی واپس ہوا۔ بوڑھی نے کہا، "ارے تم تو بڑی جلدی آ گئے۔ میں تو سمجھ رہی تھی۔ لونڈا کا ... رب پر ... رچلا گیا۔"

اندر سے سیتا نے جھڑکی دی، "موسی، تو بوڑھی ہوئی لیکن آدمی کو پہچاننا نہیں آیا۔"

چائے کا سامان دیکھ کر بوڑھی اور لوگ سب حیرت سے بڑی ہو گئیں۔ "اتنا سامان لگتا ہے چائے کی دکان میں؟"

رات میں سیتا نے اپنے ہاتھ سے بھات دال پروس کر کھلایا تھا — پہلی بار۔

پرانی باتیں یاد کر کے آج بھی اجاگر کا جی جھوم اٹھتا ہے۔ سیتا کی بولی، سیتا کی ہنسی، سیتا کا چہرہ ... دن رات ان کی آنکھوں میں سپنوں کی دنیا میں ہی رہتا تھا — روپ کی ... جیتا تھا۔

چائے کی دکان کھلی اور چل نکلی۔

چاروں گاؤں میں بات پھیل گئی۔ "بوڑھی مہوان کا ایک رشتے دار آیا ہے۔ چائے کی دکان کھولی ہے۔ اب جو گھر بیٹھے — چائے گرما گرم!"

بس کے ڈرائیور، کنڈکٹر چائے پی کر چلتے سے ایک زبان ہو کر تعریف کی، "کیا بڑھیا چائے بناتا ہے جوان! چلے گی دکان۔"

لیکن چائے کی دکان چھ مہینے بھی نہیں چل سکی۔ پانچویں مہینے میں ہی سیتا نے اجاگر کو اکسایا۔

"کیوں؟ تمھارا کلیجہ اتنا چھوٹا ہے؟ بوڑھی سے صاف صاف کہتے کیوں نہیں؟"

"اگر بوڑھی انکار کردے؟"

"بلا سے! پہلے کہہ کے دیکھو۔"

"اگر کہے، گھر جمائی رہنا پڑے گا؟"

"ابھی مان لینا۔ بعد میں پھر..."

بوڑھی سوئی آنکھ سے کم دیکھتی تھی اور کان سے ذرا کم سنتی تھی۔ لیکن بنا کچھ دیکھے سنے ہی وہ سب کچھ سمجھ چکی تھی۔ اس لیے جس دن اجاگر نے ہکلا تتلا کر اپنی بات رکھی، بوڑھی نے ایک بھدی گالی دی تھی: "سب بار ستو ان اور بھتار کے آگے دتّون' اب باقی ہی کیا رہا ہے۔ جو تجھے برتن میں اب کون پنڈت پروہت وید منتر پڑھے گا؟ خوب پیو گرما گرم چائے!"

بوڑھی سوائن اپنی پکوڑوں کی دکان پر بیٹھی آج بھی گالیاں دے رہی ہوگی، "اس مائی ملے نے آتے ہی چائے پلا کر اس موئی کو مٹھی میں کر لیا... دن رات گھسر پھسر میں نہیں دیکھ سکتی تھی۔ جواب دے دیا: تم لوگ اپنا راستہ دیکھو۔"

اور اسی کو کہتے ہیں: تریا کے بھاگ سے ملے راج!

سیتا نہیں، لکشمی!

رانی گنج سے گریسیل جانے والی بس پر سوار ہو کر، روپ والی دلہن کو ساتھ لے کر اجاگر گاؤں لوٹ آیا۔ لوٹ کر اس نے سنا، "ادھر بھی نئی سڑک کھلنے والی ہے۔ بہت جلدی ہی!"

سچ مچ لکشمی ہے پردیپ کمار کی مائے!

بننے والی نئی سڑک کے ٹھیکیدار نے اجاگر کی جھونپڑی میں ہی ڈیرا ڈالا تھا۔ گاؤں کے لوگوں نے گھما پھرا کر اجاگر کو سمجھایا: "گھر میں جوان اور خوبصورت بہو، اور باہر چھپر کے نیچے پردیسی کا رہنا، اچھی بات نہیں۔"

سنتوکھی سنگھ جب ملتا، دن دہاڑے چھ چوری کی کوئی کہانی سنانا نہیں بھولتا۔ جا کر گھر لوٹ کر اپنی روپ وتی کو تکتے ہوئے کہتا: "جانتی ہو، گاؤں کے لوگ کیا کہتے ہیں؟"

''گاؤں کے لوگوں کی بات ہو گئی کہ جمشید رضا جی کی تحصیلداری کہتے ہیں، [illegible] سب سے
کی چائے اور پکوڑوں کی دکان تب ہوتی۔ ابھی اتنے مزدور کام کر رہے ہیں، ابھی چودل لال کی دکان
چل رہی۔ مزدوروں کو [illegible] رکھا ہوا [illegible] کے بعد یہ کام [illegible] ۔ کسی [illegible] ہے۔''

''جی؟ اور اگر [illegible] بھاگ جائیں گے تب؟''

''بھاگ کر کہاں جائیں گے، اس کی چٹیا تو تحصیلدار جی کے ہاتھ میں ہے۔''

''جی ہاں تم ٹھیک کہتی ہو [illegible] ۔ جمشید رضا صاحب سچ مچ بہت اچھے آدمی ہیں۔''

''ارے تم مجھے بڑوں کی طرح کیوں کہتے ہو؟ مجھے اچھا نہیں لگتا۔''

''تب کیوں؟'' [illegible] ''اب میں بھی تحصیلدار صاحب کا [illegible] نام ہی
[illegible] جمشید رضا صاحب سچ مچ بہت اچھے آدمی ہیں۔''

گاؤں [illegible] سے [illegible] بول اٹھا: ''جمشید صاحب
سچ مچ اچھے آدمی ہیں۔''

[illegible] اچھے آدمی ہیں تبھی تو [illegible] گاؤں سے [illegible] ہیں۔ [illegible] روپ
[illegible] گاؤں [illegible] میں نئی سڑک نکل گئی؟

چودل لال کی چھوٹی سی دکان کھول [illegible] پانچ ہی مہینے میں [illegible] کس نے خریدی ہے؟
[illegible] تحصیلدار صاحب انگریزی میں چٹھی لکھتے ہیں [illegible] انگریزی [illegible] گاؤں میں؟
[illegible] ٹھیک [illegible] ۔ [illegible] پڑھی لکھی [illegible] ۔

[illegible] ہوا تو تحصیلدار صاحب نے [illegible] تحصیل سے پچیس روپے [illegible] ماہانہ کی
تھی۔ پچھلی رات میں خوشی کے مارے رات بھر بیٹھ کر [illegible] پڑھتے رہے۔ اور [illegible]
بھی [illegible] ۔ گاؤں سے [illegible] پنڈت نے تو [illegible] نام رکھ دیا تھا۔ بھلا پتا ہے بھی کون
نام ہے!

[illegible] تحصیلدار صاحب آج کل [illegible] ملاقات [illegible] ہیں۔ [illegible] بھی [illegible] آدمی اچھے ہیں
[illegible] گاؤں [illegible] آج کل [illegible] مہینے [illegible] ۔ [illegible] سچ مچ ہیں [illegible]

جائیں گے۔

اُس دن چھنو کا رم ڈولوا اپنا کہہ رہا تھا کہ پردیپ کمار کا منہ ٹھیک ٹھیکیدار صاحب جیسا ہے۔ پگلا ہے سالا!

لائن گاڑی کے ڈرائیور جی بھی بہت بھلے آدمی ہیں۔ روز کہتے: "دیکھو اجاگر بھائی، چولھے کے پاس بیٹھتے بیٹھتے پردیپ کمار کی ماں کا رنگ بادامی ہو گیا ہے۔ بدن میں خوشبودار پوڈر لگانے سے رنگ ٹھیک رہے گا۔" اور دوسرے ہی دن ایک ڈبہ پوڈر خریدتے آئے پورنیہ کی ساہا کمپنی سے۔ ایسا بھلا آدمی اس گاؤں میں کیا، اس علاقے میں بھی کھوجنے پڑے گا؟

یہ نئے داروغہ صاحب بھی ہیرا آدمی ہیں۔ کہہ رہے تھے: "ایس پی صاحب تمہارے پکوڑوں کی خوب تعریف کرتے ہیں۔"

اور جوگ بنی کے لالہ کے بیٹے کی زبان تو پکوڑے کے نام سے ہی چٹپٹا جاتی ہے۔ بارہ بجے رات میں گاڑی پر داروغہ صاحب کے ساتھ آتا ہے اور چوری چوری پکوڑے کھاتا ہے۔ ویشنو ہے، جس کے چوکے میں پیاز نہیں چڑھتا ہے کبھی، وہ اجاگر کی دکان میں بیٹھ کر کیسے کھا سکتا ہے پیاز والے پکوڑے؟ پردیپ کمار کی ماں کہتی ہے: "لالہ کا بیٹا ایک دم گائے جیسا سیدھا ہے۔ ذرا دارو پیتا ہے، اس سے پکوڑوں کے ساتھ چاٹ نہیں، انگریزی دارو پیتا ہے۔" اس رات تو پردیپ کمار کی ماں کے بدن میں درد تھا شام سے ہی۔ داروغہ صاحب نے کہا: "ایک گلاس لے لو" ایک گھونٹ پیتے ہی سب درد چھومنتر ہو جائے گا۔ سچ مچ!" ہوا بھی وہی۔ شام سے ہی کراہتی ہوئی پردیپ کمار کی ماں خشخشا کر اٹھ بیٹھی اور لالہ کے بیٹے سے مٹھاس بھری گپ کرنے لگی۔ ہنسی تب پردیپ کمار کی ماں!

تین بجے والی گاڑی آ رہی ہے۔

"کہاں ہو بوا! ماں سے کہو کہ تین بجے گاڑی آ رہی ہے۔ میرے ڈپٹ کا سب کام ریڈی ہے۔"

"بوا! پردیپ کمار کی ماں کہاں؟"

پردیپ کمار صبح کی میٹھی نیند میں سویا ہوا تھا۔ اجاگر چپ چاپ بیٹھ کر بیڑی پینے لگا۔ آج تا

سویرے ہی پردیپ کمار کی مائے اٹھ کر کہاں گئی ہے؟ طبیعت خراب ہے کیا؟ نہیں، وہاں گاڑی سے ڈرائیور جی ٹھیک ہی کہتے ہیں — جوان ہے تو جہان ہے۔ پردیپ کمار کی مائے دن بھر چولہے کے پاس بیٹھی رہتی ہے، یہ ٹھیک نہیں۔ پکوڑے بنانے کے لیے کسی کی مائے کو مزدوری دے کر رکھنا ہوگا۔

اجاگر بیٹھا رہا۔ جب صبح کا تارا ڈوب گیا اور اجالا ہوا اور پردیپ کمار کی مائے کوٹھری میں نہیں آئی تو وہ باہر نکلا۔ باہر برتن باسن سب بکھرے پڑے ہیں۔ دونوں لوٹے بھی ہیں۔ تب کہاں گئی؟

اجاگر نے کوٹھری میں آ کر دیکھا — پیٹی کھلی پڑی ہوئی ہے۔ ریشمی ساڑھی اور ریشمی بلاؤز کیا ہوا؟ لگا، دھرتی اچانک گھومنے لگی۔ اس نے چلا کر اپنے بیٹے کو جگایا، "میا! بیوا! پردیپ کمار — مائے کہاں؟"

پردیپ کمار اٹھ کر زور زور سے رونے لگا: "میا کہاں! آں، آں!"

پردیپ کمار کو چپ کرانے کے لیے اجاگر نے اپنے کو سنبھالا۔ پھر بولا: "بیٹا، مائے گنگا تیرکا میلہ گئی ہے۔ دوپہر کی بارہ بجی گاڑی سے لوٹے گی۔"

اس نے اپنے من کو بھی سمجھایا، کہاں جائے گی! کہیں کام سے ہی گئی ہوگی۔

صبح کی گاڑیوں کے آنے کا وقت ہوا۔ سنتوکھی سنگھ ٹھیک وقت پر ہی آیا۔ اس نے آتے ہی ٹوکا: "آج پکوڑوں کا چولھا نہیں سلگا کیوں؟"

اجاگر نے جواب دیا: "پردیپ کمار کی مائے کی موسی کا پیغام آیا کہ وہ لب جان ہے۔ اس لیے رات کی گاڑی سے ہی چلی گئی۔"

پردیپ کمار نے کہا: "میا گنگا تیرکا میلہ گئی ہے۔"

سنتوکھی سنگھ نے پرانے دفعدار کی طرح جرح کرتے ہوئے پوچھا: "رات میں تو ساوہ گاڑی لوٹی نہیں۔ پھر کس گاڑی سے گئی؟"

اجاگر نے آج بنا بوہنی ہوئے ہی سنتوکھی سنگھ کو چائے کا بڑا گلاس دیا۔ سنتوکھی سنگھ نے چائے پیتے ہوئے کہا: "زمانہ بہت خراب ہے۔ زنانہ ذات اکیلی باہر جائے..."

دونوں طرف سے گاڑیاں آئیں۔ اجاگر نے مال گاڑی کی طرف دیکھا... نیا ڈرائیور؟ مال گاڑی کے ڈرائیور جی کہاں گئے؟ چھٹی پر؟ کتنے دن کی چھٹی؟ آج پکوڑے نہیں، صرف چائے لے

کی بھیا!

دوپہر کے بعد اجاگر نے دکان بند کر دی۔

اس کا دل اندر ہی اندر ٹوٹنے لگتا۔ تب وہ زور زور سے رونا چاہتا۔ لیکن پردیپ کمار کا منہ دیکھ کر وہ اپنے آپ کو سنبھال لیتا۔ وہی رونے لگے گا تو بچے کی کیا حالت ہوگی۔

''بپّا! بارہ بجی گاڑی آرہی ہے۔''

پردیپ کمار کی مائے نہیں آئی۔ ''بیٹا، ابھی نہیں آئی تو تین بجی گاڑی سے آوے گی۔''

''بپّا! تین بجی گاڑی آرہی ہے۔''

''نہیں آئی!''

اس بار باپ بیٹا مل کر آنگن میں رونے لگے۔ جب پردیپ کمار ہچکیاں لیتے ہوئے دانت پر دانت بٹھا کر کلکھیانے لگا، تب اجاگر کو ہوش ہوا۔ اس نے آنسو پونچھ کر کہا: ''رات کی گاڑی سے ضرور آوے گی۔ تمہارے لیے بسکٹ لاوے گی... کھلونے!''

پردیپ کمار کی مائے رات کی گاڑی سے ہی آئی۔

''آ گئی میا! میا آ گئی!''

پردیپ کمار زور زور سے رونے لگا۔ اجاگر بھی رونے لگا۔ ''کہاں چلی گئی تھیں تم پردیپ کمار کی مائے؟''

''لو، لو، کیا ہو گیا ہے تم دونوں کو؟''

''کہاں گئی تھیں؟ کس گاڑی سے گئیں؟''

''کام سے گئی تھی، پورنیا۔ گاڑی سے نہیں، ٹرک سے گئی تھی۔''

''کہہ کر جاتیں۔''

''کام کے پہلے بات کہی نہیں جاتی۔''

پردیپ کمار کھلونا پا کر خوش ہو گیا۔ اس کی ماں نے گٹھڑی سے بسکٹ کا ڈبہ نکالا۔ اجاگر چپ چاپ، بنا پلک جھپکے دیکھتا رہا— کتنے دنوں کے بعد پردیپ کمار کی مائے نے ریشمی ساڑھی پہنی ہے۔ ... روپ ذرا بھی کم نہیں ہوا ہے۔ کون کہتا ہے کہ گاؤں کا روپ سال لوٹتے ہی ڈھل جاتا ہے!

اب پردیپ کماری ماں نے آنچل کی کھونٹ سے کاغذ کا ٹکڑا نکال کر دکھاتے ہوئے کہا،

"دلاتو، کیا ہے؟" اجاگر نے لالٹین کی روشنی میں کاغذ کو الٹ پلٹ کر دیکھا" مجھکو سمجھ نہیں آیا ہے،

پڑھا لکھا نہیں ہوں، لیکن یہ تو سرکاری کاغذ جیسا لگتا ہے۔"

پردیپ کماری ماں ہنسی۔ "ٹھیک ہی پہچانا ہے تم نے، سرکاری کاغذ ہی ہے... پرمٹ"

"پرمٹ؟ کس چیز کی پرمٹ؟"

"سیمنٹ، کوئلہ اور لوہے کے سریوں کی۔"

"کیا کروگی پرمٹ؟"

پردیپ ماں ہنس کر بول اٹھی: "گاؤں کے شمشو کو... وہ بھی اچھی طرح جانتی ہوں گی۔"

"سمجھ گئی، اوہو، سمجھ۔ پکا گھر، ہیں؟ سچ کہتا ہوں، پردیپ ماری ماں تم حیرت ہوا،

ایسا کیا تم نے جو مجھے پتہ ہی نہیں کہ... اتنی بڑی بات میرے پیٹ میں ہضم نہیں ہوتی۔ سچ کہتا

ہوں، میں پاگل ہو جاؤں گا۔ تم تو لکشمی ہو۔"

"میں نے کیا کیا، سب ان گاڑی کے ڈرائیور جی کی مہربانی ہے۔ حاکم سے ان کی

جان پہچان ہے... اور سستے داموں کی پرمٹ سے گھر بنانے کا آدھا روپیہ بھی نکلے گا۔"

"سو کیسے؟"

"دیکھنا، آنے والا لچھمی کے بیٹے کو۔"

"سچ؟ حد ہے، حد ہے! اگلے سال سنتو سنگھ کو پانچ گلاس چائے ہونی ہے پہلے ہی پلا دوں

گا... اب تم کو کیا کہیں، پردیپ ماری ماں۔"

"ریشم بھیا!"

"ہی ہی ہی ہی!"

اچانک سے خبر پھیل گئی۔ ایک بانس میں پرانا جھاڑ باندھ کر گاڑ دیا گیا۔ بڑی خبر لوگوں نے

سنی۔ گاؤں کے لوگ اندر ہی اندر جل بھن کر خاک ہونے لگے۔

لیکن، دھوئیں دھواں سے جاگر کا من بھی اندر ہی اندر سلگ رہا تھا۔ نہ جانے کیوں۔ پرمٹ کا

کاغذ لالہ جی کے بیٹے کو دے کر اینٹ، سیمنٹ، لوہا پا گیا ٹھیک ہے۔ لالہ جی کے بیٹے نے پرمٹ لیتے وقت پردیپ کمار کی ماں کی انگلیاں دبا دی تھیں۔ اس میں بھی کوئی حرج نہیں۔ داروغہ جی نے اُس دن دارو کی جھونک میں کبوتری کہہ دیا۔ سرکاری آدمی کا سات خون معاف ہے۔ لال گاڑی کے ڈرائیور جی نے ہولی کے دن گال پر عبیر لگا دیا۔ ہولی کی بات! پھر ڈرائیور جی بھلے آدمی ہیں۔ لیکن...

کیتلی کا کھولتا پانی ٹونٹی سے گرنے لگا۔ پردیپ کمار کی ماں نے کہا، "لو، لو، تمہارا دھیان کہاں ہے؟ ہوش میں ہو یا...؟"

اجاگر بولا، "خوب ہوش میں ہوں۔"

اس نے کیتلی اتار دی۔ مکان بنانے والا یہ چھچھوندر جیسے منہ والا مستری بنا کب سے آنگن سے اندر کیوں گیا؟ جانے کے پہلے پردیپ کمار کی ماں کو اس طرح آنکھ کی منکی کیوں مار گیا؟ پردیپ کمار کی ماں اس طرح ہنسی کیوں؟ اٹھ کر آنگن میں گئی کیوں؟

اجاگر کا من دھوئیں سے بھر گیا مانو۔

اس نے پکارا، "بوا! بیٹا پردیپ کمار!"

پردیپ کمار آیا۔ اس کا منہ بھی تمتمایا ہوا ہے۔ اجاگر نے دھیرے سے پوچھا، "بوا ماں کہاں ہے؟ کیا کر رہی ہے؟" پردیپ کمار بولا، "بپّا، مستری بڑا بدمعاش ہے۔ ہم کو بپّا سو کہتا ہے۔"

اجاگر غصے سے دہک اٹھا۔ اس چھچھوندر موتے کی اتنی ہمت! میرے بیٹے کو، پردیپ کمار کو بپّا سو کہے گا؟

وہ اٹھ کر دہلیز کے پاس گیا۔ آنگن میں کھس کھس کر کے پرائیویٹ بات ہو رہی ہے؟ آمنے سامنے بیٹھ کر؟ مستری سالا اس طرح جانگھ کے کپڑے سٹ کر کیوں بیٹھا ہے؟

اجاگر کے سر پر جیسے انگیٹھی جلنے لگی۔ وہ آنگن میں جا کر گرجا: "مستری، دیوار کی گھٹائی یہاں ہو رہی ہے کیا؟"

مستری شرمندہ سا ہو کر اٹھا۔ ہنستی ہوئی پردیپ کمار کی ماں بھی چونک پڑی۔ اجاگر نے دھڑام سے دہلیز کا دروازہ بند کر دیا۔

Scanned with CamScanner

پردیپ کمار کی ماں اجاگر کی آنکھیں دیکھ کر ڈر گئی۔ اجاگر ہونٹ اور دانتوں سے بھینچتا ہوا اس کے پاس گیا۔ پھر دھیرے سے بولا: "تو کتی ہے، کتی، کتیا!"

پردیپ کمار کی ماں نے آواز اونچی کر کے کہا: "کیا ہو گیا ہے تم کو؟"

اجاگر چپ چاپ اپنی کوٹھڑی میں چلا گیا۔ اندر سے ہی اس نے پکارا: "بیٹا! پردیپ کمار! یہاں آؤ۔"

پردیپ کمار اپنے باپ کے پاس چلا گیا۔ باہر دکان میں چولھے سلگتے رہے۔

گاڑیاں آئیں۔ ڈرائیوروں نے ہارن بجا بجا کر پکارا۔ سنتوکھ سنگھ نے آواز دی۔ آنگن سے کوئی جواب نہیں ملا۔ کسی نے کہا: "سائیں! اب چائے دکان کون چلا رہا ہے۔ دکان پر کیوں بیٹھے گا؟"

گاڑیاں آتی رہیں، ہارن دیتی رہیں، پھر چلی جاتیں۔

اس دن اجاگر گھر سے نہیں نکلا۔ پردیپ کمار بھی ادھر ادھر باپ کی بغل میں پڑا رہا۔ پردیپ کمار کی ماں اوسارے (برآمدے) پر بیٹھی دھیرے دھیرے روتی رہی۔

سانجھ ہوئی۔ اجاگر اٹھا اور پردیپ کمار کی ماں کے پاس جا کر بولا: "اس چھچھوندر موٹے مسٹنڈے کے ساتھ جاتی کیوں نہیں حرامزادی؟ نکل جا میرے آنگن سے۔"

پردیپ کمار کی ماں بولی: "تیری بیری کو تو لے تم ہی دیکھا کرو مزدوروں کو، پتا نہیں کھیل..."

"جہنم میں جائے سالی تیرا اچکا گھر!"

"اور دکان پر ہزاروں لوگوں کے سامنے..."

"آگ لگے تیری دکان میں!"

اجاگر باہر گیا اور لات مار مار کر دونوں چولھوں کو توڑ پھوڑ آیا۔ دہلیز کا دروازہ بند کرتے ہوئے بولا: "نکل جا یہاں سے کتی، وہ چپ چاپ! نہیں تو آج خون کر ڈالوں گا۔"

اب پردیپ کمار رونے لگا۔ اجاگر اس کو گود میں لے کر اپنی کوٹھڑی میں چلا گیا۔ پردیپ کمار کی ماں اوسارے پر ہی بیٹھی رہی۔ پردیپ کمار روتے روتے سو گیا۔

سانجھ بیتی، رات آئی۔ سڑک پر ایک ٹریکٹر بھڑ بھڑ کرتا ہوا چلا گیا۔ اجاگر نے باہر نکل کر

Scanned with CamScanner

دیکھا، پردیپ کمار کی مائے او سارے پر ہی لیٹ گئی ہے۔

اجاگر دبے پاؤں اس کے پاس چلا گیا۔ "جا کر مستری کی کھٹیا پر کیوں نہیں سوتی؟ نخرہ پسار کر یہاں زمین پر کیوں سوئی ہے؟"

اجاگر نے دھکا دیا۔ "اٹھ سالی تریا چرتر کہیں اور جا کر دکھلا!"

پردیپ کمار کی مائے اٹھ کر بیٹھ گئی اور دونوں ہاتھوں سے اجاگر کا پاؤں پکڑ کر بولی: "پردیپ کے بابو! تمھارے پیر پڑتی ہوں۔ میرا گلا گھونٹ کر مار ڈالو!... مار ڈالو مجھے!"

اجاگر نے دونوں ہاتھوں سے اس کی گردن کو جھپٹ کر پکڑا۔ لمبے بال چھتر ا گئے کھل کر۔

"ہاں، مار ڈالوں گا۔"

"مار ڈالو۔ میں جینا نہیں چاہتی۔"

"مار ڈالوں گا گلا دبا کر، حرامزادی!"

"مارو۔ پردیپ کے با...!"

"بول کل سے تو آنگن کے باہر پیر رکھے گی؟"

"نہیں رکھوں گی۔"

"کسی سے ہنسے گی بولے گی نہیں۔ بول!"

"نہیں۔"

"مستری سے؟"

"... نہیں۔"

"داروغہ سے؟"

"... نہیں۔"

"اُس لالہ کے بیٹے سے؟"

"... نہیں۔"

"لال گاڑی کے ڈرائیور سے؟"

"نہیں نہیں! نہیں!... پردیپ کے بابو!"

Scanned with CamScanner

پردیپ کی ماں ... جا کر چھاتی سے منہ نہ لگاتی تھی۔ اسے لگا بیاہ کے بعد آج پہلی بار وہ اپنے گھر والے کے ساتھ اپنے مرد کے ساتھ سہاگ رات منا رہی ہے... انگ انگ میں چٹخ... مہریں... طوفان... پردیپ کے بابو، مجھے مار... ڈالو... مار... ڈالو!
... سے ایک ... بڑا ... گزر گیا۔

❀❀

پھنیشور ناتھ رینو

ہندی سے ترجمہ: شہاب الدین گیلانی

تھیٹر والا

حالانکہ اسے پچاسوں بار پہلے بھی دیکھ چکا ہوں، لیکن اس دن اسے دیکھ کر چونک سا اٹھا۔ لگا جیسے بنا موسم کا کوئی پھول یا پھل دیکھ رہا ہوں۔ ساون بھادوں کی بیچ بیچ میں لگاتار بارش کہاں سے آ گئی؟ کیوں؟

میں ہی نہیں، اسے دیکھ کر بھی جاننے والے، انجان حیران ہو کر رک جاتے ہیں۔ کوئی کوئی اس کے ٹیبل کے نزدیک جا کر کچھ پوچھ بھی لیتا ہے اور میں یہ بھی دیکھتا ہوں کہ وہ بہت ہی غیرڈرامائی انداز میں چھوٹا سا جواب بھی دے دیتا ہے۔

مجھے یہ سمجھنے میں کوئی غلطی نہیں ہوئی کہ لوگ اسے فاربس گنج کی اس چھوٹی سی چائے کی دکان کی ایک بانہہ والی کرسی پر بیٹھا دیکھ کر کیوں کچھ دیر کے لیے ٹھٹک کر رہ جاتے ہیں۔

میں نے اندازہ لگایا تیس اکتیس سال پہلے اس شخص کو پہلی بار دیکھا تھا، سنہ انیس سو انتیس میں۔ اسی سال پہلے پہل گلاب باغ میلے میں اتناسٹ کر ہوائی جہاز دیکھا تھا کہ وہ سال ابھی تک یاد ہے۔ 1929 میں میں آٹھ نو سال کا تھا۔ اسی سال گلاب باغ میلے میں کلکتہ کی مشہور تھیٹر کمپنی آئی تھی اور لوگوں کا ہجوم اکٹھا ہوا تھا۔ تل دھرنے کی بھی جگہ نہیں تھی۔ اسٹیج پر ہی گاڑی آ جاتی تھی انجن سمیت چھک چھک چنگھاڑتی دھواں اگلتی ہوئی اور لال پیلی روشنی میں ان گنت پریاں ناچتی ہوئیں۔ زندگی میں پہلی بار تھیٹر دیکھ کر کتنی خوشی ہوئی تھی۔ آج تک وہ دن یاد ہے، اتنی خوشی بھری

Scanned with CamScanner

حیرت! لیکن جب اسکول کھلا تو ہم جماعت بٹکل بنرجی نے میرے جی کو چھوٹا کر دیا تھا۔ گو۔ وہ بھی ان دنوں آٹھویں کلاس کا ہی تھا، لیکن بہت ہی تیز — پیدائشی آرٹسٹ کہ لو۔ اس کے کہنے کے مطابق اس نوٹنکی کمپنی میں پچھلے سال ناگیسر باغ میلے میں آئی اصلی کمپنی کے نکالے ہوئے سب لوگ تھے۔ بٹکل نے کہا تھا کہ ناگیسر باغ میلے میں آئی کمپنی کی باتیں ہر کوئی جانتا ہے... چوبیس گھنٹے کے اندر کمپنی کو میلہ چھوڑ کر چلے جانے کا حکم کلکٹر صاحب نے دیا تھا۔ کلکٹر صاحب کا کہنا تھا کہ اگر دو دن بھی یہ کمپنی میلے میں رک گئی تو سارا ضلع کنگال ہو جائے گا۔ لیکن بٹکل مجھے اداس دیکھ کر بولا تھا۔ ''تب بھی ایک بات ہے اس کمپنی میں۔ جس آدمی نے ریلوے پورٹر کا پارٹ کیا ہے، وہ ناگیسر باغ میلے میں آئی ہوئی کمپنی میں بھی یہی پارٹ کرتا تھا۔ یعنی ویٹنگ روم میں سوئے ہوئے لڑکے کو مارتا تھا۔ چہرے سے... اس کو تو قاتل نہیں کہہ سکتے۔''

آج بھی مجھے اس وقت کی سبھی باتیں یاد ہیں... گلاب باغ میلہ... پنجاب میل کا ریلوے پورٹر... لڑکے کا خون... بٹکل کی باتیں...

قریب چار پانچ سال بعد اچانک سنہیشور میلے میں آئی ہوئی ناٹک کمپنی میں اس آدمی کو پھر دیکھا تھا — ایک ناٹک میں چنڈال کی شکل میں بھوتیسے باباجی کے بھیس میں ''کایا کا پنجرہ ڈولے رے، سانس کا پنچھی بولے'' گاتا ہوا، بڑی ہی سریلی آواز میں۔ گلاب باغ والی کمپنی میں لڑکے کا قتل کرنے والا، یعنی قاتل کا کردار ادا کرنے والا، باباجی کے گیروا لباس میں۔ اپنی بولی وہ زیادہ دیر نہیں چھپا سکا۔ میں جھٹ پہچان گیا۔ جب وہ پارسی نوٹنکی کے ایک سین میں کہتا پڑھ رہا تھا: مر، تم سب ... ہے... سمجھ ... کس کو، کن کو'... تب ہاتھ نچا کر گا یا کہتی: اس کو، ان کو'... تب مجھے ذرا بھی شک نہیں رہ گیا۔ میں پہچان گیا تھا باباجی کو۔ وہی تھا، جو گلاب باغ میلہ کمپنی میں ویٹنگ روم میں، بچے پتلے بڑے کو چھرا بھونکنے کے پہلے کانپتے ہاتھ اور تھرتھراتے چہرے کو دیکھ کر پاگلوں جیسا بڑبڑاتا تھا۔ ''کیوں میرے ہاتھ، تو کیوں تھرتھرا رہا ہے؟ تو تو صرف اپنے مالک کے حکم کی تعمیل کر رہا ہے۔ مت کانپ میرے خنجر۔ وقت برداشت کرا... بار سویا ہے چار ستان کرا... تو بھی ... ''

بس کی ڈگی پر بڑی زور سے چوٹ پڑی تھی، بھی بڑبڑا گئے تھے۔ یہ سب مجھے یاد ہے۔

اس کے بعد پھر تیسری بار۔ آگیا پرساد کی ناٹک کمپنی کے شریمتی منجری کھیل میں انگریز جج کا بھیس بنا کر ٹیبل پر ہتھوڑا ٹھونک کر لوگوں کو خاموش رہنے کی تنبیہ کرتا ہوا یہ شخص بولا تھا: ''ڈیل موبجری بائی! ہام تم کو سری منی موبجری (شریمتی منجری) کا خطاب ڈیتا ہائے۔ آج سے تم کو سری منی منجری بولے گا۔ ہم بولے گا، سب بولے گا، سمجھا؟'' اور اس منظر کے کچھ لمحوں بعد وہ وہی گیت گاتا ہوا اسٹیج پر آیا تھا: ''کایا کا پنجرہ ڈولے رے'' —— اپنی اسی پرانی طرز میں۔

مجھے اسے پہچاننے میں کہیں غلطی نہیں ہوئی۔ سب جگہ اسے پہچان گیا۔

کتنی بار اسے دیکھا ہے، لیکن ایسے بے موسم میں نہیں۔ بے وقت نہیں۔ اور جھرتے ہوئے ساون بھادوں میں نہیں۔ عام طور سے اسے میلے کے موسم میں دیکھا تھا، یعنی کارتک سے چڑھتے بیساکھ تک، اس لیے آج اچانک اسے اس چائے کی دکان پر بیٹھا دیکھ کر میں چونک گیا۔

ایک اندازہ لگایا —— دس گیارہ سال بعد اسے اس علاقے میں دیکھ رہا ہوں، اسی وجہ سے تجسس بھی ہوا اور حیرانی بھی۔

وہ دکان کی کرسی پر بیٹھا تھا ضرور، لیکن تھا اداس، اکھڑا ہوا، اپنے میں کھویا ہوا۔ بارش کی جھڑی وہ بہت دیر سے ایک ٹک دیکھ رہا تھا۔

وہ... وہ... قاتل پورٹر، باباجی... انگریز جج... اپدیشک... سپاہی... ڈاکو... اندھا... فقیر... وغیرہ وغیرہ —— سب ایک ہی شخص... ایک ہی آدمی۔

بہت زور سے بجلی چمکی، بارش اور تیز ہوگئی اور بہت دیر کے بعد اس نے وہی انداز بنایا جس انداز میں وہ ''کایا کا پنجرہ'' والا گیت گاتا تھا، اسٹیج پر!

اتنی دیر کے بعد میری نظر اس کی پھٹی بش شرٹ پر پڑی۔ کارٹوں کی چھاپ مٹ رہی تھی، میل جم رہا تھا۔ نئی ڈیزائن کی ٹوٹی چپل۔ وہ اچک کر گمبھیر نظر سے چائے والے کی طرف دیکھتے ہوئے بولا: ''ایک ادھر بھی...''

اس کی بولی سن کر یہ سمجھنے میں ذرا بھی شک نہیں رہا کہ جو قاتل پورٹر یاد ہلا دینے والا بھیڑ کو

تھا یہ رعب دار انگریز جج، یہ شانت آپ ٹیک وغیرہ کا رول کرتا تھا، اب بوڑھا ہو گیا ہے۔

چائے اسے بھی ملی اور مجھے بھی۔

ایک گھونٹ چائے پیتے پیتے مجھے ایک بات یاد آئی کہ ان دنوں رات سے اسٹیج کے اداکاروں کو دن کے اجالے میں سڑک پر یا میلے میں چلتا دیکھ کر کتنا عجیب سا لگتا تھا۔ کس طرح ان لوگوں کا بولنا، بات کرنا انوکھا اور عجیب لگتا تھا، لیکن اچھا۔

یاد آیا ... فورٹس گنج ہیٹ کی ایک تھیٹر کمپنی کے کچھ اداکاروں کے پیچھے بہت دیر سے گھوم رہا تھا۔ پان کی دکان پر سب کھڑے ہوئے۔ پیچھے میں بھی کھڑا ہوا۔ اس پارٹی میں کافی لوگ تھے — لیلیٰ مجنوں اور فرہاد، راجہ، ڈکیت کے ہاتھ سے راجکماری کو چھڑانے والا [illegible] اجیمر، رجا اور بجنے والا، اور سب کے ساتھ "کایا کا پنجرہ" گانے والا۔ مجھے پیچھے کھڑا دیکھ کر وہ بولا تھا: "کیوں بے چھوکرے، اس طرح کیوں گھوم رہا ہے پیچھے پیچھے؟ پاکٹ مارنے کا کیا؟"

اس چھوٹی عمر میں بھی میں سمجھ گیا تھا کہ عزت نفس پر چوٹ پڑی ہے۔ انا جاگ پڑی۔ ترنت کا جواب دیا، "آپ کی پاکٹ میں ہے ہی کیا جو کوئی مارے گا؟"

"کیوں؟" وہ حیران ہو کر بولا تھا، "تو یہ کیسے جانتا ہے کہ میری پاکٹ خالی ہے؟"

گو کہ ان دنوں میں اپنے اسکول کی سب سے اوپر کی کلاس میں پڑھتا تھا اور ماسٹر صاحب کی ہدایت کے مطابق اجنبی لوگوں سے انگریزی میں بات کرنے کی مشق ہو چکی تھی، پھر بھی میں نے کھڑی بولی میں ہی جواب دیا: "کیوں، رات جو بھیک مانگ رہے تھے، دادا تم اچھا ہو۔"

سب زوروں سے ہنس پڑے تھے اور بولے تھے: "چھوکرا تیز ہے۔"

اب مجھے انگریزی جھاڑنی پڑی تھی: "یس مسٹر ریلوے پورٹر، ایکٹر، ڈونٹ کال می چھوکرا، آئی ایم میٹرک اسٹوڈنٹ، یو نو؟"

اتنی پرانی بات یاد آنے سے میرے ہونٹوں پر ہنسی پھیل گئی۔ ذہن میں سوال اٹھا کہ اب یہ کس کمپنی میں کام کرتا ہے؟ کیا آج بھی یہ اسی طرح رعب دار ڈائیلاگ بولتا ہے؟ ایسے ہی ویٹنگ روم کے لڑکے پر تجر چلاتا ہے؟ ویسے ہی... ویسے ہی...

میرا دھیان ٹوٹ گیا۔ اس کی چائے ختم ہو گئی تھی۔ وہ میری ٹیبل سے ہٹ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ پوچھا: "آپ مجھے پہچانتے ہو سیٹھ؟"

اس کی بانہہ پکڑ کر بٹھاتے ہوئے میں بولا: "میں سیٹھ نہیں ہوں۔ خاص آدمی ہوں۔ کہیے، آج کل کس کمپنی میں ہیں؟ اس بے موسم میں آپ کو اس علاقے میں دیکھ کر مجھے کافی تعجب ہو رہا ہے۔"

"صاحب، اب کہاں کی کمپنی اور کیسا تھیٹر! سب کو فلم کھا گیا۔" اس نے ہنسنے کی ناکام کوشش کی۔

"آپ نے کتنی کمپنیوں میں کام کیا ہے؟"

"صاحب، پندرہ۔"

لگا جیسے اس کے ذہن میں سب کچھ سب سنجو کر رکھا ہوا ہو۔ چند لمحوں بعد میری طرف خالی نظروں سے تاکتا ہوا بولا: "نو سال کی عمر میں پہلی بار اسٹیج پر آیا تھا۔ کرشن کے رول میں۔"

مجھے محسوس ہوا کہ میرے سامنے گزرے وقتوں کی ایک باقیات بیٹھی ہوئی ہے 'پارسی تھیٹر' کا ایک ٹوٹا ہوا اداکار۔

سگریٹ بڑھاتے ہوئے پوچھا: "تو آج کل کیا کرتے ہیں آپ؟"

وہ لمحہ بھر چپ چاپ میری طرف دیکھتا رہا، پھر سگریٹ سلگاتا ہوا بولا: "کیا کروں گا صاحب! وہ جو کسی شاعر نے کہا ہے کہ عشق نکما کر دیا..." اس نے ہنسنے کی ناکام اداکاری کی۔ "دس سال بعد اس علاقے میں آیا ہوں۔ کیا نام بتایا لوگوں نے — میتھلا دیش۔ صاحب، اس علاقے میں ناٹک کے کافی شوقین لوگ ہیں... جانے کو تو فلم میں بھی گیا، پر جی نہیں لگا۔"

اتنا کہہ کر کنکھیوں سے ایک بار ادھر ادھر نظر ڈالتے ہوئے پھر میری طرف رحم طلب نگاہوں سے دیکھتا، آہستہ سے کچھ جھجکتا ہوا بولا: "صاحب، ایکسکیوز می... فرام... لاسٹ تھری ڈیز، آئی ایم ہنگری، ویری ہنگری... مانگنے کی ہمت نہیں ہوتی کسی سے..."

اس نے یہ انگریزی ڈائیلاگ بہت ہی ڈرامائی انداز میں بولا تھا۔ میں کچھ کہنے کو ہی تھا کہ وہ

چہرے پر حکم ماننے کا تاثر پیدا کرتے ہوئے گڑگڑاتے لہجے میں بول اٹھا: ''حکم ہو تو کچھ پیش کروں... اب تو یہی ایک سہارا بچا ہے۔ ڈرامے کے پرانے شوقین ملتے ہیں، سنا دیتا ہوں۔ جی ہلکا ہو جاتا ہے اور کچھ...''

وہ اپنے جملے کو ادھورا چھوڑ کر کونے میں رکھی اٹیچی کو اٹھا لے آیا۔ ایک کالی لنگی باہر نکال کر منہ ڈھانپ لیا۔ پھر لنگی کا پردہ ہٹایا تو کٹ مونچھوں والا ایک عجیب چہرہ باہر آیا۔ مدھم آواز میں وہ بولا، ''یہ ایک اداس نراش نوجوان پریمی کا ڈائیلاگ ہے۔'' ایک بار وہ کھانسا، پھر بولنا شروع کیا: ''ظالم چنچلا یہ کیا کیا؟ تم نے میرے دل کے ہزار ٹکڑے کر دیے! ظالم تو نے یہ کیا کر ڈالا! کیا کر ڈالا چنچلا... چنچ... چلی گئی تو چنچلا! چلی گئی تو مجھے تڑپتا چھوڑ کر...''

اس کے بعد ہچکیوں کے بیچ اس نے جو مکالمے ادا کیے، وہ میں نہیں کہہ سکوں گا۔

دکان میں لوگوں کی بھیڑ لگ گئی تھی۔ چاروں طرف سے لوگ جھک جھک کر دیکھ رہے تھے۔ سب کے چہرے پر ایک عجیب چپ اور حیرت کا تاثر تھا۔ باہر بادل رہ رہ کر گرج اٹھتا تھا۔

اس نے پھر اپنے چہرے پر لنگی کا پردہ گرا لیا، جیسے خود کو گرین روم میں لے گیا ہو۔ اس بار بڑی بڑی مونچھوں والا سردار بن کر باہر آیا۔ پردہ اٹھا۔ وہ گرجا: ''کیوں بے بدکار! بتا کہاں ہے راجکمار؟ کہاں ہے مکار کی اولاد...''

اس جوشیلے ڈائیلاگ کی اٹھا پٹک میں لنگی، دانتوں کا سیٹ چھٹک کر منہ سے باہر آ گیا۔

اسی طرح اس نے درجنوں مکھڑے بنائے، کتنی ہی طرح کی کیفیتوں کے مکالمے سنائے اور آخر میں ٹوپی کو بھیک کا پیالہ بنا کر لوگوں کی طرف دیکھتا ہوا بولا: ''داتا تمہارا کھلا ہو، بھلا ہو! آنہ، دو آنہ... دو پیسہ ہی سہی...''

میرا ذہن سن سے سن ہو گیا۔ جیسے کہیں تھوڑی چوٹ لگی ہو، ایک جھٹکا لگا ہو۔ اس شخص نے اپنی کلا کے جادو سے کتنے برس پیچھے دھکیل دیا تھا۔ میں دوبارہ حال میں لوٹ آیا۔ دیکھا، بنگالی بابو جی ایک ٹک تاک رہا ہے۔ تھوڑا تھوڑا ہونٹوں کے کناروں سے مسکرا رہا ہے۔

بنگالی اس سے تیز لہجے میں پوچھ بیٹھا: ''کیوں ایکٹر مہاشے! کل اتنی محنت سے چندہ کر پایا ہو

سب یک ہی رات میں بھٹی میں پھونک دیا؟ واہ رے موشائے!''

پیدائشی آرٹ کریٹک میرا ہم جماعت بکل بنرجی آج بھی کلا اور کلا کار کو پہچاننے کا دعویٰ اسی طرح کرتا ہے۔ سب دن ایک جیسا ہی رہا وہ۔ میری طرف دیکھتا ہو، بکل بولا ''تم بھی اس کی بات میں پھنس گئے۔ مجھ سے کل یہ کہہ رہا تھا: فرنو ڈیز: آئی ایم ہنگری...''

نہیں جانتا کیوں، مجھے اس وقت بکل کی یہ بات اچھی نہیں لگی۔ اسے چپ رہنے کا اشارہ کیا اور سرگوشی میں پوچھا: ''بکل، اس کے ڈولتے ہوئے جسم کے پنجرے میں جو پنچھی بول رہا ہے، اس کی بولی کو سن کر تم کو کچھ نہیں لگا؟ ٹھیک بتانا!''

بکل ایک دم خاموش ہو گیا۔ کچھ دیر ساکت رہا، پھر دھیرے سے بولا: ''کچھ نہیں تب تو کل سارا دن کیوں اس کے ساتھ بھیک مانگتا' چندہ تو بھیک ہی ہوئی۔'' اس نے ایک لمبی سانس لی، پھر کہنے لگا: ''کیا بتائیں کیسا لگا؟... تمہارے اور دوسرے دوستوں کے ساتھ بھاگ کر رات بھر تھیٹر دیکھنے گیا ہوں، ہاسٹل سے۔''

میں نے کہا: ''ہاں بکل، مجھے بھی کچھ ایسا ہی لگا۔''

اسی بیچ بوڑھے ایکٹر نے اپنے دوسرے، پرانے مشہور گیت کا مکھڑا گانا شروع کر دیا تھا:

صبح ہوئی، نکل گئے تارے
مجھے چھوڑو، چلو میرے پیارے

اچانک پھر ہم لوگوں کی نظروں کے سامنے نیپے کا موسم جگمگ کرنے لگا۔

⊛⊛

پھنیشور ناتھ رینو

ہندی سے ترجمہ: شہاب الدین گیلانی

رسول مستری

بہت کم عرصے میں ہی اس چھوٹے سے گنوار و شہر میں کافی تبدیلیاں آ گئی ہیں — امید سے زیادہ، اور شاید ضرورت سے بھی زیادہ۔

اسکول اور ہاسٹل کی عالیشان عمارت کو دیکھ کر کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا کہ آج سے تقریباً آٹھ سال پہلے زیادہ تر کلاسیں پیپل کے پیڑ تلے لگتی تھیں۔ برسات کی رات میں ہاسٹل میں رہنے والے شاگرد 'ٹوٹ ٹاٹ گھر ٹپکت کھٹیہ ٹوٹ' کی یاد تازہ کرتے تھے۔

شہر بھر کا کوڑا جس جگہ پھینکا جاتا تھا، وہیں آج بڑا سا ٹاؤن ہال ہے، کلب ہے اور لائبریری ہے۔

غفور میاں کا چمڑے کا گودام 'تصویر محل' بن گیا ہے۔ کبھی اس گلی سے گزرتے وقت بھنگی مہترانی بھی ہونٹ سکوڑ کر ناک پر آنچل ڈال لیتی تھی۔ اور آج تو صفائی ستھرائی کی پتلی بن چھمیا بھی اس گلی میں جی ہی جی میں گنگنانے کی کوشش کرتی ہے: 'ہم کو ہے پیاری ہماری گلیاں'۔

خلیفہ فرید کی چھٹ چھٹ والی پھٹیچر سنگر مشین اور ان کی قینچی کی کاٹ چھانٹ کے دن لد گئے ہیں۔ 'ماڈرن سٹ فٹ' کے 'کٹ ماسٹر' کا زمانہ ہے۔

ریستورانوں اور پان اسٹالوں کی تعداد تو ساگ بھاجی کی دکانوں سے بھی بڑھ گئی ہے۔ جنگ اور مہنگائی کے باوجود نئی نئی اسکیمیں بن رہی ہیں، بگڑ رہی ہیں۔ شہر کی پوری کایا پلٹ ہو گئی ہے۔

Scanned with CamScanner

لیکن صدر روڈ میں، اس پرانے برگد کے بغل میں، رسول مستری کی مرمت کی دکان کو تو جیسے زمانے کی ہوا لگی ہی نہیں۔ کوئی تبدیلی نہیں، کچھ نیا پن نہیں۔ پھٹی ہوئی دری پر بیٹھ کر مرمت کے کام میں مگن غلام رسول اور اس کا بیٹا رحیم، دونوں کی بیٹھنے کی جگہ بھی نہیں بدلی۔ آس پاس مرمت کے لیے آئی ہوئی چیزیں سائیکل کے پرانے پہیے، ٹیوب، سیٹ، پیڈل، چین، ہینڈل، بریک، پیٹرومیکس، اسٹوو، ہارمونیم، گراموفون وغیرہ؛ اردگرد بکھرے ہوئے اوزار، چھوٹے بڑے پیچ؛ ایک کاٹھ کے پرانے بکس میں تقریباً سبھی چیزوں کے پرانے پرزے، رینچ، ریتی، چھینی، ہتھوڑی، پیچ کش، ٹوٹے اسپرنگ وغیرہ۔ پاس میں ہی ایک چھوٹی سی پرانی الماری میں پرانے اور نئے ڈیزائنوں کے چھوٹے بڑے بگڑے ہوئے ٹائم پیس، ڈنلپ ٹیوب کے دو تین خالی ڈبے، چھوٹی بڑی کتنی ہی چیزیں پر سب پرانی اور بگڑی ہوئی۔ الماری کے اوپر پرانے گراموفون کا ایک چونگا اوندھایا ہوا، دیوار پر ڈنلپ اور گڈ ایئر اور واچ کمپنیوں کے سنہ 1934، 36 اور 38 کے پرانے کیلنڈر، مس کجن کی ایک پھٹی ہوئی رنگین تصویر، دو دیوار گھڑیاں — ایک بنا ڈائل کی، دوسری بنا پنڈولم کی۔ بنا پنڈولم دی گھڑی پتا نہیں کتنے دنوں سے تین بجا رہی ہے۔ دوسری اپنے اندرونی کل پرزوں کی نمائش کر رہی ہے۔ اس کی اسپرنگ کے پاس ہی مکڑی نے اپنا جالا تان دیا ہے۔

دوسری طرف رحیم بیٹھا چپ چاپ کام کر رہا ہے۔ ٹین کی کرسی پر بیٹھ کر گاہک اپنی بگڑی ہوئی چیز کو بنتے دیکھ رہا ہے۔

سامنے کے برگد کے تنے پر، جہاں روز نئی دکانوں کے اعلان، دوائیوں کے پرچے، نیشنل وار فرنٹ کے نعرے، سنیما کے اشتہار چپکائے ہوئے رہتے ہیں، ایک پرانی ٹین کی تختی نہ جانے کتنے برسوں سے لٹک رہی ہے، جس پر ٹیڑھے میڑھے حروف میں لکھا ہوا ہے: 'رسول مستری۔ یہاں مرمت ہوتا ہے۔'

اس سائن بورڈ پر بہت دنوں سے پڑھے لکھے لوگوں کی منڈلی تبصرے کرتی رہی ہے، طنز کیے ہیں اور رسول مستری کے سامنے تبدیلی کی تجاویز رکھی گئی ہیں، لیکن آج بھی وہ تختی اسی طرح لٹک رہی ہے۔ ہاں، کسی شیطان لڑکے نے کھلی سے اس پر لکھ دیا تھا: 'یہاں آدمی کی بھی مرمت ہوتی ہے۔' سو اسے بھی مٹانے کی کوئی ضرورت شاید نہیں سمجھی گئی۔

رسول مستری!

منجھولا قد، کاریگروں کی سی کایا اور نکیلے چہرے پر مٹھی بھر گنگا جمنی داڑھی۔ ساٹھ برس کی لمبی عمر کی کوئی بھی خاص علامت جسم پر نظر نہیں آتی۔ پھرتی چستی جوانوں سے بھی بڑھ کر۔ سادگی کا پتلا۔ موٹیا کپڑے کی ایک لنگی اور قمیص۔ پان، چائے اور بیڑی کا رسیا۔ کبھی ہاتھ پر ہاتھ دھر کر چپ چاپ بیٹھا رہ جانا جانتا ہی نہیں۔ گپ بازی میں نمبر ایک کا، لیکن اپنی ذمے داری کو بھی نہ بھولنے والا۔ کام کے ساتھ ساتھ وہ بات چیت کا سلسلہ بھی جاری رکھ سکتا ہے۔

"ٹھک ٹھک، ٹھک، ٹھک ٹھک، ٹھک۔"

"تو سمجھے ناجی، دوزخ بہشت، سورگ نرک سب یہیں ہیں، یہیں۔ اچھے اور برے کا نتیجہ تو یہیں مل جاتا ہے۔ رام چندر بابو کو دیکھو نا!... ارے رحیم! ذرا پیچ کش پھینکنا تو... رام چندر بابو... ارے بھئی چھوٹا والا، چھوٹا والا! رہ گئے پورے بھونگو! تم اس سے بھلا... ہاں، یہیں..."

رحیم!

رسول مستری کا اکلوتا بیٹا۔ سانولا سا ہٹا کٹا جوان، باپ کی انتہائی عزت کرنے والا اور ضرورت سے زیادہ طبیعت کا نرم۔ باپ کی موجودگی میں کبھی اسے منہ کھول کر بولتے نہیں دیکھا گیا۔ جہاں دو چار آدمی کام لے کر آئے کہ اس کی برداشت کا امتحان شروع ہو جاتا ہے۔ چھوٹی سی غلطی پر بھی رسول میاں بگڑ اٹھتے ہیں۔ دن بھر کام میں جٹے رہنے پر بھی کاہل، کام چور، بے پروا اور کبھی کبھی آوارہ کا خطاب بھی اسے مل جاتا۔ رسول میاں بولتے رہتے اور وہ شانت رہ کر چیز والے کو سمجھاتا رہتا: "اس کا اسپرنگ ٹوٹ گیا ہے اور ہولڈنگ نٹ..." بس، رسول میاں اس میں بھی اپنی ٹانگ اڑا دیتے۔ "دیکھیں، کہاں کیا ہوا ہے... ہوں، واہ رے لڑکے! صرف اسپرنگ ٹوٹا ہے؟ اچھا، لے ہم نیا اسپرنگ فٹ کر دیتے ہیں، ہولڈنگ نٹ بھی بدل دیتے ہیں، مشین چلا کر ریکاٹ (ریکارڈ) بجا دے تو سمجھیں کہ ہو گیا ہے پکا مستری۔ ارے الو، بیلنس کیسے ٹھیک ہوگا بیلنس؟"

رحیم اپنے ہونٹوں پر ایک شرمیلی مسکان لا کر نگاہیں نیچی کر لیتا۔

شہر سے دو میل پورب کی طرف ایک چھوٹی سی بستی میں مستری کا گھر ہے۔ مستری کے پرکھے

کبھی خوشحال کسان تھے، پر آج تو جائیداد کے نام پر تین جھونپڑیاں اور مویشیوں میں کچھ بکریاں اور مرغے مرغیاں رہ گئی ہیں۔ آمد کا یہ حال ہے کہ جس دن دکان بند اس دن کھانا بند۔ اور خرچ نوابی — تیسوں دن کباب اور قلیہ، حلوے اور سویاں ہی پکتی ہیں۔ بیٹا اور بہو تو کچھ کہنے سے رہے۔ رہ گئی بڑھیا، سو وہ بیچاری اپنی جوانی کے دنوں سے ہی کاٹ کپٹ، کم خرچ اور بچت کے سبھی طریقوں کو آزما کر ہار گئی ہے۔ میاں غلام رسول کی عرضیہ می فلاسفی کے آگے اس کی کوئی بھی دلیل نہ کبھی چلی اور نہ کبھی اس کی کچھ سنی ہی گئی۔ پر وہ ہے کہ بولنے سے اب بھی باز نہیں آتی۔ جوں ہی رحیم کے ہاتھ میں کسی چیز کی پوٹلی دیکھتی، پوچھ ہی تو بیٹھتی۔

''پوٹلی میں کا ہے رحیم؟''

''کلیجی ہے،'' رحیم منمنا کر جواب دیتا۔

''کتنی ہے؟ سیر بھر؟... کا بھاؤ دیا؟ یا اللہ! دو روپے سیر؟ آگ لگے ایسی جیبھ میں! دو روپے سیر کلیجی؟ ہم پوچھیں ہیں تو سے رحیم، کہ اللہ تورے کب عقل دیہیں؟ اُو کے (میاں کے) سر پر تو کھڑ بھوت سوار ہے کھاؤ بھوت اتورے منھ میں اللہ تعالیٰ نے بولی نا دیا ہے؟'' بڑھیا بیٹھ کر کلیجی کے شوق کو کوستی رہتی، رحیم چپ چاپ وہاں سے کھسک جاتا۔ بڑھیا کی گود میں بیٹھا ہوا پوتا کلیجی کی پوٹلی کی طرف بار بار جھپٹتا اور بڑھیا اس کو بار بار روکتی۔ ''ہائے ہائے! ہمرے تو کچھ نہ سوجھے ہے۔'' گھنٹوں وہ بڑبڑاتی رہتی۔ ''باپ بیٹے دونوں کی مت ماری گئی ہے۔ زمانہ دیکھ کر نہیں چلتے، کھانے پینے کے پیچھے دونوں کا جو برا حال ہوا ہے...'' آنکھوں دیکھے واقعات کی مثال دے دے کر یہ ثابت کرتی کہ ایسے چٹورے مرتے وقت کفن کے لیے کچھ بھی نہیں چھوڑ جاتے، وغیرہ۔

وہ اپنی قسمت کو کوستی رہتی کہ ٹھیک اسی موقعے پر میاں رسول آ پہنچتے۔ سب سے پہلے جواب طلب کرتے کہ کلیجی اب تک اس طرح کیوں پڑی ہوئی ہے۔ بڑھیا منھ لٹکائے چپ رہتی۔ رسول میاں اندر جا کر مرزئی کھول آتے، برآمدے پر جم کر بیٹھ جاتے۔ بہو گڑگڑی دے جاتی۔ دو برس کا نٹ کھٹ پوتا رحیم دادی کی گود کو چھوڑ کر دادا کی گود میں آ کر بیٹھ جاتا اور داڑھی کی طرف انگلی دکھا کر توتلی بولی میں دادی کی شکایت کرنے لگ جاتا۔ ''اُو کھٹ کھٹ بہیا...'' (کھٹ کھٹ بڑھیا)۔ انعام میں بیس جوس اور بسکٹ پا کر، زور زور سے پکار پکار کر دادی کو چڑانے لگتا۔ ''کھٹ کھٹ بہیا

Scanned with CamScanner

ہے... بہت بہت بڑھیا..."

رسول میاں گزگزی کا [illegible] کاٹتے ہوئے گمبھیر ہو جاتے، پھر پوچھتے: "ہم تو رسے سے پوچھتے ہیں۔ ہمری اماں، کہ آخر تیری یہ [illegible] کی عادت کب چھوٹے گی؟ جب دیکھو تب یہی حال، جب سو تب وہی بات۔ آخر ہم پوچھتے ہیں کہ تورے ان [illegible]..."

"چپ رہو [illegible] شرم کی بات مت بولو" بڑھیا جھنجھلا اٹھتی۔

"چپ کرنے والی کی ایسی کی تیسی!" رسول میاں بھی گرم پڑ جاتے۔ "ہم تو سو بار کہیں [illegible] شرم ذرا بھی نہیں [illegible] تب [illegible] کے [illegible] کوئی چیز [illegible] نہیں۔"

[illegible]

"[illegible] کا کا [illegible] میں؟ [illegible] کوئی [illegible]۔"

"[illegible] فخر الدین [illegible]" رسول میاں [illegible] ہوئے [illegible]۔

"[illegible] رشید [illegible] بدن بھی ٹھنڈا..."

"[illegible]" رسول میاں [illegible] بات [illegible] "چھوڑو [illegible] نصیب ہو جائے گی۔" [illegible] چلے جاتے۔

"[illegible] سے [illegible]" بڑھیا پوچھتی۔

"تو کیا [illegible] سب اچھے [illegible] تو تو اب کبھی آتی بھی نہیں۔ [illegible] کا کی ناراض ہے۔"

"دُر پاگل! ناراض کا ہے ہووے۔ کریتے کے مارے فرصت ملے تب تو۔"

رسول میاں جیب میں چھوٹی بڑی شیشیاں ٹھونس کر نکل پڑتے۔ "چل۔"

بڑھیا آپ ہی آپ بولتی: "ذرا ٹھکانے سے دیکھیے گا، جو دوا نہیں ہو وہ شہر سے منگا دیجیے گا۔"

دادا کے چلے جانے کے بعد کریم میاں دھیرے دھیرے دادی کے پاس آ کر بیٹھ جاتے اور بے مطلب کی ہنسی ہنس کر سمجھوتے کی تجویز پیش کرنے لگ جاتے۔ اگر دادی آدھا بسکٹ لے کر بھی سمجھوتہ کر لے تو کوئی حرج نہیں۔

"چل ہٹ شیطان! جا اپنے دادا کے پاس۔ بڑا آیا ہے! ہاں سے بسکٹ دے کر پھسلانے! ہم تو کٹ کٹ بڑھیا ہیں!" یہ کہہ کر وہ روٹھی سی رہتی۔ لیکن میاں کریم اچھی طرح جانتے ہیں کہ ان موقعوں پر کیا کرنا چاہیے۔ زبردستی گودی میں بیٹھ کر غیر حاضر دادا کی شکایت کرنے لگ جاتے۔ "دادا پھکت! دادا چتو!" (دادا پھکڑ! دادا چور!) دادی کے ہونٹوں میں چھپی مسکان کو وہ دیکھ لیتا اور عجیب و غریب زبان میں جانے کیا بول کر دادی کو رجھانے لگ جاتا، جس کے یہ معنی ہو سکتے ہیں کہ دادا کے ساتھ مختصر سمجھوتہ تو صرف بسکٹ کے لیے ہوا تھا۔ دیکھی، کیسے دادا سے ٹھگ کر بسکٹ لے لیے۔ اسی کو کہتے ہیں سیاسی داؤں پیچ۔

کلیجی کاٹتے کاٹتے امی آنکھ دکھا کر کہتی: "اچھا، آ دیں تیں تورے ابا، سب نخنگی پن تورے آج باہر کرا دیں ہیں۔"

کریم میاں بھلا امی کی بات کو کیسے برداشت کر لیں! امی تو گھر بھر میں سب سے کمزور اور غیر اہم ہستی ہے۔ کریم میاں نے اس کی خوشامد نہ کبھی کی ہے اور نہ کریں گے۔ وہ اس کی ہمت کہ دھمکی دے؟ تھوڑی دیر گمبھیر ہو کر چپ رہنے کے بعد مسکراتی ہوئی امی کو ڈانٹ دیتے۔ "چپ پھورا!" (چپ پھوہڑ!)

"آنے دے دادا کو!" امی پھر دھمکی دیتی۔ اس بار کریم میاں آپے سے باہر ہو جاتے۔ امی کی گود سے اٹھ کھڑے ہوتے اور آس پاس کھینچ مارنے والی کسی چیز کی تلاش کرنے لگتے۔ سوٹی چھڑی کو اٹھانے میں ناکام ہو کر خالی ہاتھ ہی امی پر دھاوا بول دیتے۔ بال پکڑ کر گھسیٹنے لگ جاتے۔ امی چلّا اٹھتی: "چھوڑ شیطان، چھوڑ۔ نہیں کہوں گی دادا سے، چھوڑ۔"

روٹی جلتی ہوئی جا کر اسے پکڑ لیتی۔ کریم میاں اپنی زبان میں دھمکی دیتے: "پھنڑو دادا کو، با کو اور تم کو مار کر گھر سے نکال دوں گا۔"

اگر امی سوچ لیتی تو یہ میدان جنگ میں اترنے کی تیاری کرنے لگ جاتے۔ لیکن وہ روٹی رکھ دیتی۔ صرف دانت نکال کر بیٹھ جاتے۔ دادی اور امی ان اشارے کو سمجھتی تھیں۔ بڑھیا کہتی: "یہ چپٹے مت توڑ، رات کے چھوڑے گا۔ یاد رکھیو۔"

کریم نے ادھر چند دنوں سے یہ نیا طریقہ نکالا ہے۔ کھانا کھاتے وقت وہ رہ رہ کر اس کا استعمال کرتا ہے۔ امی ہنستی ہیں۔ "ہاں رے" اور اپنی کہانی پر، کسی کی چیخ پر رہ رہ کر ہنسنا پڑتا ہے۔

رسوئی گھر میں بھوشن پالی رہتی۔ بڑھیا پکار رہتی: "صاف رکھیو، ورنہ مت رہیو۔ نہیں تو کتے بہت طوفان کھڑا کر دے گا۔" دو تین دن بعد بامبے سے نمک مرچ مسالے کے مارے میں پیتا، پانی پینے سے عمدہ خوشبو رسوئی میں پھیل جاتی۔ بہو گود میں کریم کو دیتے ہوئے کہتی: "جا بچے، جا، میں شہوں سے ملا کر۔" بوسہ دیتی، بولی: "ہولی سے بچا ہوا۔" گاؤں میں چھ لڑکا، کریم اپنی شہزادی میں آ جاتا۔ وہاں بیٹھ کر دیکھتا، بیٹوں نے مل کر پکا لیا، جا پہنچی، ہم فون پر لمبا جھگڑا کیا۔ شہر میں شوہروں کے ہاتھ سے آیا، اچھی پوشاک پہن کر، جب تک رات تک بیٹھی رہیں۔

رسول میاں جب لوٹتے تو بہو بیٹی سبزی تازی بنی رہتی۔ آنگن میں دسترخوان بچھ جاتا۔ کھانا کھاتے ہوئے رسول میاں کچھ نہ کہتے۔ روٹی، دودھ اور گلاس کھسیٹ کھسیٹ کر دادا کے پاس لے جاتے۔ کبھی کبھی تندور سے روٹی لاتے رہتے۔ بیچ بیچ میں تازی دال رکھتا رہتا۔ بڑھیا پاس ہی بیٹھی رہتی تھی۔ "دادا، یہ تو سب ٹھیک ہے۔" سنتے ہی بڑھیا نہال ہو جاتی۔

کریم بھی ایک آدھ مٹھی دال چاول لے کر جھوٹ لگتے۔ لیمی میں پکی ہوئی تازی بڑھیا کے سپرد کرتے ہوئے رسول میاں فرماتے: "ٹیک کا کیا ہوگا، بہو کو دے دے۔ آج کل تو ٹیک کرم ہی ٹھنڈی ہو گئی ہے۔ بہو کو کیا پتہ؟ تو دونوں کو دے آ۔ تازی سب سے اچھی ہے۔ ارے ہاں ہاں، تو سے کبھی پی ہی نہیں تو جانے گی کیا؟"

چند دنوں بعد ہی خوشبو پھیلنے میں بیدھا کا سوراخ چھا جاتا۔ کبھی کبھی رسول میاں کو رات میں بھی

Scanned with CamScanner

اٹھ کر 'کال' پر جانا پڑتا تھا اور ساری رات مریض کے پاس بیٹھ کر بتانی پڑتی تھی۔

صبح چپ چاپ ناشتے کے بعد ہی رسول میاں شہر کو چل پڑتے۔ دوپہر کا کھانا رحیم لے کر آئے گا۔ گھر سے چلنے کو تو وہ چل دیتے ٹھیک وقت پر، لیکن کھانا لے کر رحیم ان سے اکثر پہلے ہی پہنچتا۔ گھر سے نکلتے ہی گاؤں بھر کے شادی بیاہ، جھگڑے پنچایت، بیماری دکھی، دوا دارو وغیرہ کے بارے میں صلاح مشورہ لیتے دیتے بارہ بج جاتے۔ گاؤں سے باہر آکر، کھیتوں میں کام کرتے ہوئے لوگوں سے کھیتی باڑی کے بارے میں دو دو باتیں نہ کریں، یہ بھلا کیسے ہو سکتا ہے!

"ارے منگو، تیرا میلے والا باچھا کہاں ہے؟"

"کا کہیں بابا! آج دو دن سے نہ گھاس کھاتا ہے نہ پانی پیتا ہے۔ بھگوان جانے یہ ہو گیا ہے۔"

بس رسول میاں لوٹ پڑتے۔ باچھا کو دیکھ کر روگ کی تشخیص کر کے جڑی بوٹی بتلا دیتے۔ صرف بتاتے ہی نہیں، کس کے باغیچے میں، کس پیڑ کے آس پاس وہ جڑی ملے گی، یہ بھی بتا دیتے۔ خود جا کر لا دیتے۔

دکان پر پہنچ کر اپنی جگہ بیٹھتے بیٹھتے آپ ہی آپ بول اٹھتے: "اوہ بڑی دیر ہو گئی۔" پھر رحیم کے کام کو کچھ منٹ غور سے دیکھ کر کہتے: "لا، ادھر دے، دیکھیں۔ تب تک تم بھولا کی گھڑی کو دیکھو تو۔"

ٹوٹی کرسی پر بیٹھے ہوئے شخص نے کہیں پوچھ دیا کہ "کون بھولا؟" تو کام کے ساتھ ہی ساتھ بھولا کی سوانح حیات شروع ہو جاتی، "ارے وہی بھولا۔ کانگریسی مولا۔ معلوم ہے؟ جیل میں بی اے پاس کر لیا۔ خوب لڑکا ہے بھولا بھی... یہ دیکھیے، آپ کی گھڑی کا ہیئر اسپرنگ اتنا کمزور ہے کہ کیا کہا جائے! اسی لیے کہتے ہیں کہ سستا روئے بار بار... مگر بھولا ہے اپنی دھن کا پکا۔ ویسے تو بہت لڑکوں کو دیکھا ہے..."

سننے والا انجانے بھولا کی لمبی چوڑی داستان کی تمہید ہی سن کر آگے سننے کی ہمت ہار بیٹھتا۔

"بھئی کس بھولا کی اتنی تعریف کیے جا رہے ہو؟ وہی لمبے لمبے بال والا؟"

"ارے صاحب، نہیں!" بات کاٹ کر رسول میاں کہتے۔ "لمبے بالوں والا تو مہندر ہے مہندر۔ وہ بھی بھولا کا ہی ساتھی ہے۔ وہ بھی ایک عجیب لڑکا ہے۔ معلوم ہے؟ شاعر ہے شاعر! شاعری

Scanned with CamScanner

کا ستا ہے۔ گائے جیسا سیدھا لڑکا ہے۔ دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے آوارہ ہے مگر...''

''ایہو رسول کاکا' چیو دیکھو تو...'' جوان گوالن سسکتی ہوئی آ کر کھڑی ہو جاتی۔ ''دیکھو تو بھلا رسول کاکا، دودھ کے برتن پھوڑ دیلن، ہاتھ پکڑ کے لکو جھکو...''

''ارے کون؟ کون؟''

''پھنیش بابو کے بیٹا۔''

''ستیش بابو سے نہیں کہا؟''

''پھنیش بابو نے ہمرے مارے دوڑلن۔ بھاگ حرام جادی!''

رسول میاں کی تیوریاں چڑھ جاتیں۔ کام چھوڑ کر بڑبڑانے لگتے: ''جتنا امیر ہے سب ایک نمبر کا چھٹا ہے چوٹا۔ ج، تو ذرا سوداگر تکھ کو بلا تو رے سدمیا۔'' سدمیا گوالن آنسو پونچھتی چلی جاتی لیکن رسول میاں کی کلبلاہٹ جاری رہتی۔ ''بڑا روپیہ کا گرمی ہو گیا ہے۔ عورت کی عزت پر ہاتھ اٹھاوے گا؟ شیطان کہیں کا...''

''ارے مستری، ان چھوکریوں کو کم مت سمجھو۔ ایک ہی کھیلی کھلائی ہوتی ہیں۔ بھلا ایسی جوان لڑکی کو شہر میں دودھ بیچنے کے لیے آنے کی کیا ضرورت ہے؟...''

''چپ رہیے صاحب! یہ لڑکی میری بیٹی کی طرح ہے۔ گاؤں کی لڑکیاں بڑی سیدھی ہوتی ہیں، سمجھے؟ آپ کے شہر کی طرح نہیں ہوتیں۔ میں پوچھتا ہوں، دودھ کی آمدنی سے ہی جس کا پیٹ چلتا ہو، گھر میں اس لڑکی کو چھوڑ کر سب بیمار ہوں، تو ڈاکٹر کو بلانے، دودھ بیچنے جوان لڑکی نہیں آوے تو کون آئے گا؟ بتائیے! اور بھلے آدمی کا یہی دھرم ہے کہ دوسروں کی بہو بیٹیوں کو مصیبت میں دیکھ کر اس پر ظلم کرے؟''

سدمیا آ کر کہتی، ''سوداگر کاکا گھر پر نہیں ہیں۔'' رسول میاں سدمیا کے ساتھ اکیلے ہی چل پڑتے۔ دن ڈھلنے کے بعد کہیں وہ واپس آتے اور بڑبڑاتے ہوئے دکان میں داخل ہوتے۔ ''بچو چھپیں ایک دن، یہاں سرِ عام سڑک پر نہیں پٹوا، یا تو غلام رسول نام نہیں۔'' پھر دکان کے ایک کونے میں بیٹھی کنجڑنوں سے پوچھتے، ''ارے حبیب کی ماں، آج بڑے سویرے کام ختم ہو گیا؟'' بس کنجڑنوں کی ٹولی ٹوٹ پڑتی ''کب سے بیٹھے ہیں، ذرا حساب کر دو بڑھو۔''

Scanned with CamScanner

''ٹھہرو، ٹھہرو، ایک ایک کر کے۔ ہاں تو رے کتنا کر لیا رہا حمیدن؟ تیرہ سیر؟ کیا بھاؤ بیچی؟... چار آنے؟... ہاں تو تیرہ چوکا باون۔ باون آنے کے سوا تین روپے۔ دیکھیں پیسہ؟ اچھا تمھارا پیسہ؟... اے صاحب، اُدھر رحیم کو دکھا دیجیے، ہم کو ابھی فرصت نہیں ہے۔ دیکھتے نہیں؟''

حساب کتاب کرتے، کھوٹے کھرے پیسوں کی جانچ کرتے شام ہو جاتی۔ رحیم کام بند کر، چلنے کی تیاری کرتا۔ ''ارے ان لوگوں کو ساتھ لیتا جا رحیم۔ شام ہو گئی نا۔ میں ذرا اُدھر سے ہوتا آؤں گا۔'' کنجڑوں کی ٹولی کے ساتھ رحیم چل پڑتا۔ دھنو ساہو کی دکان پر پہنچ کر کنجڑیں دو پیسے کی جلیبی اور شکر پارا لینے میں ہی گھنٹوں کی دیر لگا دیتیں اور رحیم سڑک پر کھڑا چپ چاپ سبھوں کا انتظار کرتا رہتا۔

رسول مستری کے یہاں مرمت کی ہوئی چیز پکی ہوتی ہے۔ سب چاہتے ہیں کہ رسول میاں کے یہاں ہی اپنی بگڑی چیزوں کو بنوائیں۔ ''لیکن وہ دکان پر جم کر بیٹھتا کہاں ہے' اور جب بیٹھتا بھی ہے تو ادھورا کام ملنے کے سر پر پٹک کر کہیں چل دیتا ہے۔'' یہی لوگوں کی شکایت ہے۔ وہ ذرا کھرا آدمی ہے، صاف صاف بات کرنا جانتا ہے۔ اسی لیے گاہک کم آتے ہیں۔ وہ چھوکرا رگھو پہلے رسول میاں کے یہاں ہی نوکر تھا۔ آج کل مرمت کی دکان کھول کر مالا مال ہو گیا ہے۔ پر رسول میاں کی دنیا جیسی تھی، آج بھی ویسی ہی ہے۔

آج سے دس گیارہ سال پہلے کی بات ہے۔ میں اسٹوو مرمت کرانے رسول مستری کے یہاں گیا۔ اسٹوو کھول کر وہ دیکھ ہی رہا تھا کہ ایک دھیمی مرد دیہاتی نے آ کر گھبرائی ہوئی آواز میں کہا،

''ن تو نہیں چھوڑتا ہے... کھانستا ہے، اور سو دولا...''

سنتے ہی رسول میاں کام چھوڑ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ میں نے ٹوکا: ''پھر اسٹوو؟''

''کل ہوگا۔''

''تو میں اسٹوو لے جاتا ہوں۔'' میں نے ذرا چڑ کر کہا۔

''لے جائیے۔'' رسول نے ترش ہو کر جواب دیا۔ ''یہاں کسی کی عزت پر پڑی ہے اور کسی کو کام کی سوجھی ہے۔ بچارے کی بیٹی کا آج رات گونا ہے۔ گہنا گروی پڑا ہے۔ مہاجن چھوڑتا

نہیں..."

میں اپنا اسٹو وے کر جی ہی جی میں یہ فیصلہ کر کے واپس ہوا کہ پھر کبھی اس کی دکان میں نہیں جاؤں گا، اور نہ ہی اپنے دوستوں کو آنے دوں گا۔

پر آج رسول میاں کو اچھی طرح پہچان چکا ہوں۔ بچپن کی اس قسم پر آج بھی مجھے دکھ ہے۔ سائیکل مرمت کے لیے دی ہے۔ پندرہ دنوں سے لوٹ رہا ہوں، رسول میاں سے ملاقات نہیں ہوتی۔ رحیم کہتا ہے کہ ابھی سے ٹھیک ہوگی۔ کسی دن اتفاق سے ملاقات بھی ہوتی ہے تو دیکھتا ہوں کہ ان کے ذمے سائیکل مرمت کے علاوہ بھی بہت کام ہیں۔ "پھٹے حال عورتوں کو کپڑا دلاتا ہے۔ سات دن سے لوٹ رہی ہیں۔ بھیڑ میں دم گھٹوا کر، قطار میں کھڑی ہو کر بھی خالی ہاتھ لوٹ آتی ہیں۔"

کسی دن سنتا ہوں: گاؤں میں ملیریا زور سے پھیلا ہوا ہے۔ کونین ملتا نہیں، اسی سے مستری کئی جڑی بوٹیوں کا کاڑھا بنا کر آج گاؤں بھر میں بانٹ رہے ہیں۔

روز چپ چاپ لوٹ آتا ہوں اور روز برگد کے تنے پر لٹکی تختی کو پڑھ لیتا ہوں: 'رسول مستری۔ یہاں مرمت ہوتا ہے۔' کھڑی سے کسی شیطان لڑکے نے جو لکھ دیا ہے: 'یہاں آدمی بھی مرمت ہوتی ہے۔' جی ہی جی میں اس کی تائید کرتے ہوئے بھول جاتا ہوں کہ سائیکل کے بنا مجھے بڑی تکلیف اٹھانی پڑ رہی ہے۔

❀ ❀

Scanned with CamScanner

پھنیشور ناتھ رینو

ہندی سے ترجمہ: شہاب الدین گیلانی

رومانس سے خالی پریم کہانی کی تمہید

آج وہ 'ہلدی چڑیا' پھر آئی؟ برسات بھر یہ روز اسی طرح وقت بے وقت آئے گی اور کسی پیڑ کی ڈال پر بیٹھی ہوئی یہ چہچہاتی ہوئی سریلی آواز میں ایک لمبی تان دہرائے گی۔ سنسکرت اشلوک کی کڑی۔ صاف، ہو بہو!... پتا نہیں کیا بولتی ہے۔ پوترا کو تعجب ہوتا ہے، یہاں کے لوگ اس پنچھی کا نام نہیں جانتے۔ پوچھنے پر منہ بچکا کر کہیں گے: "پتا نہیں کیا نام ہے!" 'ہلدی چڑیا' نام پوترا نے ہی گڑھ لیا ہے۔

یہی ایک پکھیرو ہے جو اس کے دیش میں نہیں ہوتا۔ یا ہوتا بھی ہو تو پوترا نے کبھی نہیں دیکھا۔ سچ مچ اس 'دیش' میں کچھ بھی ایسا نہیں جو پوترا کے 'دیش' میں نہیں تھا۔ پیڑ، پھل پھول، فصل، جانور، پنچھی... صرف اس 'ہلدی پنچھی' کو چھوڑ کر... ماچھ رانگا کو یہاں کے لوگ مچھ لوکی کہتے ہیں۔ پوترا نے گاؤں کا 'شنی چڑی'، 'کاں' کا 'دیچا' ہی یہاں کا 'الّو' ہے، یہ اس نے یہاں آکر جانا۔ الّو کو وہ بھولو سے جیسا کوئی جانور سمجھتی تھی۔ لوگوں کے ناموں میں 'لال'، 'پرساد'، 'جھا' اور 'نارائن' لگا دینے سے کیا ہوتا ہے چہرے سے تو یہیں مدت ایسی اس 'کالونی' (نئی نگر گاؤں) کے سو میں سے ننانوے لوگ ایسے ہیں جو پوترا ان ... سے متعلق نہیں۔ وہ کہیں گے: "کی (کیا) مشکل دیدی ٹھاکرن... پرچھاد (پرساد) نام اپ گاؤں نے کسی آدمی کے نام میں لگا دو، دیکھو گی، چھوٹ ہی نہیں ہوگا نام کے ساتھ... چہرہ ... دیدی ٹھاکرن... کی مشکل!"

گاؤں بسنے کے بعد ایک دن پوترا گاؤں کے لوگوں کو سمجھا رہی تھی، ''ہم لوگوں کے بھاگ اچھے ہیں کہ ہمیں اس ضلعے میں بسایا گیا۔ یہاں دھان اور پاٹ (پٹ سن) کی کھیتی ہوتی ہے۔ ہم بھی اپنے 'دیش' میں دھان اور پاٹ کی کھیتی کرتے تھے۔ یہاں کے لوگ بھی مچھلی بھات کھاتے ہیں۔ گاؤں گھر، باغ بغیچے، پوکھرے اور ندی، سب کچھ اپنے ہی دیش جیسا...''

سوکھی ہوئی کایا والے ہرلال ساہا نے تیکھی آواز میں مخالفت کی: ''سے ہوئی پر سے تا ایسا ہونا ناممکن ہے، کہاں اپنا دیش اور اپنے دیش کی مٹی اور اپنے دیش کا چاول اور کہاں اس عجوبہ دیش کی عجوبہ چیزیں... پتا نہیں تم نے کیا دیکھا ہے دیدی ٹھاکرن! یہاں کی مچھلی میں کیا وہ ذائقہ ہے جو پدما ندی کی ہلسا مچھلی میں...؟''

ہرلال ساہا کی بات پر سبھی اس طرح مسکرائے مانو وہ سب کے دل کی بات کر رہا ہو۔

گاؤں میں ٹیوب ویل گاڑنے کے لیے سرکاری آدمی آیا ہے۔ وہ بنگال سے آئے ہوئے شرنارتھیوں کے لیے کئی گاؤں بسا چکا ہے، یعنی گاؤں میں ٹیوب ویل لگوا چکا ہے۔ اس لیے 'پوربی بنگال' کی بولی 'کچھ کچھ' سمجھنے کا دعویٰ کرتا ہے۔ اسے دیکھتے ہی ہرلال ساہا نے گھبرا کر اپنی بات بند کر دی۔ سبھی چپ ہو گئے۔

لیکن وہ سرکاری آدمی چپ نہیں رہا۔ اس نے مسکرا کر سیدھے پوترا سے پوچھا تھا: ''یہ آپ لوگ 'اپنا دیش' 'اپنا دیش' کیا بولتے ہیں؟ دیش کا کیا مطلب؟ کیا معنی؟''

''... دیش کے معنی اور کیا ہوں گے... دیش کے معنی دیش...'' ہری دھن منڈل کو اس ٹیوب ویل گاڑنے والے نچلے سرکاری اہلکار سے نہ جانے کیوں چڑ ہے... لڑکیوں کو دیکھتے ہی بات کرنے کے لیے اس کی جیبھ سرسرائی رہتی ہے... تو ہر بات کے معنی ڈھونڈتا ہے بیٹا!

''دیش کے معنی دیش... تو کیا ہندوستان اپنا دیش نہیں ہے؟ آپ لوگوں کا دیش نہیں ہے؟''

''... ہندوستان کیسے 'اپنا دیش' ہوگا؟''

کارا چند گھوش ہوشیار نوجوان ہے۔ اس نے اپنی بھاری اور موٹی ہنسی سے بات کو ہلکا کرنے کی کوشش کی۔ ''ہی ہی ہی! ارے بابو، آپ دیش کا جو معنی بوجھتا ہے، اصل میں ہم لوگوں کا دیش کا معنی وہ نہیں ہے۔ دیش کا معنی؟ جیسے بنگ دیش، بہار دیش، اڑیسہ دیش، ویسے ہی۔ ہی ہی۔''

"تو پردیش بولیے، صوبہ کہیے۔"

چھدام داس سرکاری اہلکاروں سے باتیں کرنے کا موقع ڈھونڈتا رہتا ہے۔ اس نے دانت نپور کر کہا، "اوورسیئر بابو، دیش بولیے، پردیش بولیے، صوبہ کہیے، اب تو جو ہے سو یہی ٹوبی نگر گرام (گاؤں)۔"

سرکاری آدمی نہ جانے کیوں ٹھٹھا مار کر ہنس پڑا تھا۔ چھدام داس کی عقلمندی دیکھ کر پوترا مسکرائی تھی اور اس ٹیوب ویل فٹر صاحب کی نظر شروع سے آخر تک پوترا پر ہی گڑی ہوئی تھی۔ جیب سے بیڑی نکال کر بانٹنے کے بعد سبھی کے منھ کے سامنے باری باری سے لائٹر جلا کر بیڑی سلگا دی فٹر صاحب نے۔

وہ اپنے کام پر چلا گیا۔ چھدام داس نے کہا، "دیکھی؟ فٹر صاحب کو اوورسیئر بابو کہہ دینے سے کتنا خوش ہوا!"

سبھی اپنے دیش کی ہنسی ہنسے تھے، جی کھول کر ایک ساتھ! لیکن پوترا بولی تھی، "جو بھی ہو، وہ ٹھیک ہی کہتا تھا۔ دیش معنی ہندوستان، مطلب بھارت۔"

"بدی ٹھاکرن، دیش... کیسے دیش مانیں ہندوستاں کو؟ ہم لوگوں کے اس گاؤں کا نام ہے ٹوبی نگر، اور یہاں سے لوگ کہتے ہیں پاکستانی ٹولہ..." کالا چاند گھوش کی ماں واجب بات کہتی ہے!

ادھیڑ گوپال وبہت کم بولنے والا آدمی ہے۔ میٹرک تک پڑھا ہوا ہے اور گاؤں میں قائم ہونے والے اسکول کا امیدوار ماسٹر ہے۔ اس نے ٹوکا تھا، "کال کی ماں! سائن بورڈ لگنے دو گاؤں کے باہر۔ اسکول چالو ہونے دو ایک بار۔ تب دیکھنا، پھر کیسے لوگ پاکستانی ٹولہ کہتے ہیں ہمارے اس ٹوبی نگر کو!"

چھدام داس اپنے پیٹ سے بنیان کو تھوڑا اوپر سرکا کر پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بول تھا، "اصل چیز ہے یہ سالا پیٹ! اسی سالا پیٹ کا واسطے جو کچھ سنا پڑے، کہا پڑے، سب ٹھیک ہوں۔"

ہلدی چڑیا پھر بولی...

Scanned with CamScanner

نوی نگر نہیں، نبین نگر!

نہ نوی نگر، نہ نبین نگر۔ اس گاؤں کا اصل نام ہے نبی نگر۔ آبادکاری کے صوبائی نائب وزیر محمد اسمٰعیل جی نے اس گاؤں کی بنیاد رکھے جانے کی تقریب سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا: "یہ سب اس بودی عظمت کے لئے ہے جس نے انسانی حقوق کے اس عظیم ... کے نام پر آج نگر بسایا جا رہا ہے..."

اس کے بعد پنڈت منشی صاحب نے وزیر کو بہت ... کی بات پر ایک شعر پڑھا تھا۔ گاؤں کے ... لوگوں نے اس گاؤں کا مطلب نہیں سمجھا لیکن نام یہ خوب رواج پاگئے ہیں...

بیٹے کو اجاڑنا؟

چودہ اس سے پہلے گاؤں نبی نگر ایک چھوٹا سا ... اپنے ... گاؤں میں ... ہے ... جھوپڑ گاؤں میں۔

... پہلے ... چودہ ... آباد ... تھے ... گاؤں میں ... رہتے تھے ... مسلمان ... اور ... سب ... گاؤں ... باپ ... کہا کرتے تھے، اور ... حویلی کا نام مشہور تھا ...

... پنڈت ... سنسکرت کے ہی پنڈت نہیں، اردو اور فارسی کے بھی جانکار تھے۔ ... پڑھتے تھے ... باتوں پر بحث کرتے تھے۔ گھر میں جب ... بات پر انہیں ترس آتا تو وہ ... فارسی کا کوئی شعر پڑھتے تھے۔ اس وقت سارے گھر میں ... پھیل جاتی۔ ... گھر میں ... جاتا ... رہ جاتا۔ ... "... بات میں ... پڑتے ہو"

... قرآن ... میں ... اور ... تھیں تفصیل!

... قدر ... سال ... دو بار سونت ... — عید اور درگا پوجا

میں۔ اپنے بابا کے ساتھ پوترا بچپن سے ہی عید کے موقعے پر 'قادر ابا' کی حویلی میں جاتی۔ قاسم، شمیم، شبنم۔ قادر ابا کے سبھی بچے درگا پوجا میں نٹھ کر باڑی آتے تھے۔

... لیکن اس بار عید کے دن پوترا نہیں گئی۔ قاسم دادا خود آئے۔ پوترا نے ہنس کر کہا تھا، ''عید مبارک قاسم دادا!''

قاسم دادا نے ادھر اُدھر دیکھ کر کہا تھا، ''چاند تو میں نے ابھی دیکھا ہے۔''

''قاسم دادا! کیا بک رہے ہو؟''

''تمی آمار چاند!...''

''لیکن قاسم دادا، چاند تو آکاش میں رہتا ہے۔''

اسی بار پوترا نے اپنے بابا سے صاف لفظوں میں کہہ دیا تھا، ''بابا، یہ قاسم دادا بڑا افضل... معنی بدمعاش ہو گیا ہے۔''

بابا ان دنوں گاندھی جی کی طرح ہفتے میں ایک دن مون برت رکھتے تھے۔ انھوں نے لکھ کر جواب دیا تھا، کاغذ کے ایک ٹکڑے پر: ''بدمعاش ہو یا شیطان، پریم سے سب کو جیتا جا سکتا ہے۔ محبت کی ہمیشہ فتح ہوتی ہے! گاندھی جی نے کہا ہے...''

... اس کے بعد، ایک رات اچانک تباہی کا مہا کھیل شروع ہوا... آگ... مار... کاٹ... بندوقوں کی آوازیں... عید کا جشن... چھیڑ چھاڑ... ہندو ماترم... گاندھی جی کی جے — پوترا کے بابا کی آواز نٹھ کر باڑی میں منڈلا رہی ہے... آگ کی لپکتی ہوئی لپٹوں میں پوترا نے دیکھا تھا، قاسم ڈھونڈ رہا ہے۔ ''کوتھائے؟ کہاں ہے وہ؟''

... پھر، پوترا نٹھ کر باڑی سے نکل کر کیسے باگدی پاڑا میں پہنچ گئی، وہ نہیں جانتی۔ اس کی آنکھیں کھلی تھیں ہندوستان کے ایک شرنارتھی کیمپ میں، کٹیہار اسٹیشن پر۔ ہوش میں آتے ہی پوترا نے پوچھا تھا، ''بابا کہاں ہیں؟ ماں کہاں؟ اور لوگ کہاں ہیں؟...'' کسی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس نے پھر کوئی سوال نہیں کیا۔ ایک لمبی سانس لے کر وہ چپ ہو گئی۔ تبھی سے وہ چپ ہے۔ کبھی اپنے گاؤں اور گاؤں کے لوگوں کی، بچھڑے ہوئے اپنوں کی چرچا کرتے ہیں۔ وہ منھ بدکا کر مسکراتی رہتی ہے، یعنی کیا بیوقوفی کی باتیں کرتے رہتے ہیں لوگ!

... ضلع میمن سنگھ، گاؤں جمع پورا

[illegible]

کا ایک پیسہ۔ وہ کہتے: "جاتے رہیں ش کرن!"

[illegible]

کوسے کہو، پانی میں ڈوبے کہو!"

[illegible]

پاٹ (پٹ سن) کی کھیتی کر سکیں۔"

سب سے بڑے افسر نے کہا، ''جو حکم! سبھی جمعہ پوری پورنیا جائیں گے۔'' آنکھوں کی کھڑکی سے قاسم نے جھانک کر کہا: ''لیکن تم کو میرے ساتھ جانا ہوگا۔ میرے دل میں ایک ویران جگہ ہے، تم اب گھر وہیں باندھو۔ ۔ ۔ '' پوترا منھ بنا کر ہنستی رہی، گاڑی پورنیہ کی طرف چلی، سبھی جمعہ پوری شرنارتھیوں کو لے کر۔

اور پورنیہ پہنچ کر آر او صاحب کے پی اے، یعنی ری ہیبلی ٹیشن افسر کے پرسنل اسسٹنٹ کی آنکھوں میں دیکھا قاسم براجمان ہے، پہلے سے ہی!

اس لیے سب سے اچھی جگہ اور اچھے علاقے میں جمعہ پور والوں کی 'کالونی' بسائی گئی — جس کی دھرتی زرخیز ہے، جہاں کی ندیوں میں ہر قسم کی مچھلیاں ہیں۔ گوڈیر گاؤں کے دکھنی علاقے کی غیر مزروعہ زمین پر کالونی کی نیو خود آر او صاحب نے ڈالی۔ اس دن قاسم آر او کی آنکھوں میں تھا— پی اے نے آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی ہمت بھی نہیں کی۔

ایک سرکاری لفافہ ہاتھ میں لے کر گوپال دا چلا رہے ہیں: ''سبھی بھائی بہن سن لیجیے۔ منظور ہو گیا! ہو گیا منظور! اسکول ہو گیا!''

پوترا کو تعجب ہوتا ہے، بہت کم بولنے والا، کم ہنسنے والا اور کم سونے والا گوپال دا ادھر اتنا بک بک کیوں کرنے لگا ہے؟ اسکول تو ہونا ہی تھا۔ اس طرح چلانے کی کیا ضرورت؟

اس نے گوپال دا کے سارے جوش کو اچانک بجھا دیا مانو۔ ''گوپال دا اسکول تو ہوا، مگر آپ کے پختہ سائن بورڈ کا کیا ہوا؟ اسکول کا نام پاکستانی اسکول تو نہیں رکھ دیں گے حاکم لوگ؟''

گوپال دا نے اس بار دھیان سے، ایک ایک لفظ پر زور دے کر چٹھی پڑھنا شروع کیا: ''گوڈیر گاؤں کے پاکستانی ٹولہ میں اسکول کھولنے کی تجویز پر۔ ۔ ۔ ''

اس سے آگے وہ نہیں پڑھ سکا۔ اس کا گلا بھر آیا۔ ''سچ سچ، یہ پاکستانی ٹولہ نام اب کبھی نہیں مٹے گا؟ ۔ ۔ ۔ گوڈیر ۔ ۔ ۔ گوڈیر ۔ ۔ ۔ چولہے میں جائے یہ گوڈیر گاؤں!''

''نہیں گوپال دا! ایسا نہیں کہتے۔ سبھی گاؤں پھولیں پھلیں،'' پوترا نے سمجھایا۔ ''گوڈیر گاؤں کے ساتھ آپ کا نو بین نگر بھی چولہے میں چلا جائے گا۔''

کالا چاند گھوش اب تک چپ تھا۔ اس کو اپنی کیرتن پارٹی میں رنچی نے، اسکول کھلے، گاؤں کا نام بدلے۔ اس نے گوپال دا کی طرف دیکھ کر گانا شروع کیا:

"تو بین بگڑی بابا

تو بی بگڑ بولو

پاکستانی تولا رہا ہے اسکول

ڈارجسنز کھولو

بولو ہری بولو!"

سبھی ہنس پڑے اور گوپال دا پھوٹ پھوٹ کر رو پڑا۔ پوترا نے آنکھوں سے ہی کالا چاند کو ڈانٹا۔

گوڈیر گاؤں۔

پندرہ گھر میتھلی برہمن، چار خاندان راجپوتوں کے ۔۔۔ یہ ہو گوڈیر گاؤں کا ہونو۔۔۔ بیس گھر گوالے، آٹھ لوہار، تیرہ گھر گوڑھی (مچھلی پکڑنے والی ذات)۔ گوڈیر گاؤں کا اصل نام ۔۔۔ گوڑھی ٹولہ سے ہوا جہاں گوڑھی لوگ رہتے ہوں ۔۔۔ گوڑھی بار، گوڑھی بارے ہوا گوڈیر۔ گوڈیر گاؤں کا سب سے سکھی اور خوشحال گھر نہ گوڑھی کا ہی ہے۔۔۔ تالیور گوڑھی سے یہاں ۔۔۔ سوکھی مچھلیوں کی طرح جمے ہوئے پیسے سے بو نکلتی ہے۔

برہمن ٹولی میں چودھری خاندان اور راجپوتوں میں گن گنا کر بس ایک ہی ایسا گھر ہے جن کے پاس تھوڑی زمین ہے۔ باقی لوگ جمانی، پہلوانی، گاڑی بانی، گھوڑا دانی، دکان، نوکری، کھیت مزدوری اور چوری کرکے گزارہ کرتے ہیں۔

'کالونی' میں سکول کھلنے کی خبر گوڈیر گاؤں کے سبھی ٹولوں میں فوراً پہنچ گئی۔ تالیور گوڑھی کے دربار میں مسخروں اور چاپلوسوں کی بھیڑ لگی ہوئی ہے۔ حالانکہ ٹولے کا موجودہ دفعدار چونکہ سرکاری آدمی ہے، اس لیے وہ غیر قانونی باتیں نہیں کرتا کبھی۔ اس نے کہا: "گاؤں ۔۔۔ سب سے چلی رہی ہیں: اسکول، اسکول، لیکن اسکول کے نام پر کچھ نہیں ہوا اب تک۔ ادھر دیکھیے، پرستھیاں سب کو آئے چھ مہینے بھی نہیں ہوئے ہیں، مڈل اسکول کھولنے کا آرڈر پاس ہو گیا!"

سبھی نے ایک ساتھ حیرت سے کہا: "کیا... ؟ اسکول؟ پاکستھیاں ٹولہ میں؟"

اس کے بعد کچھ دیر تک خاموشی چھائی رہی۔ سبھی کی آنکھیں بزرگ تالیور گوڑھی پر جا ٹکیں۔

تالیور گوڑھی نے ہاتھ کی سرنی (تسبیح) کو جھولے میں رکھ دیا اور صاف دلی سے کہا، "جو بچے اپنے بچوں کو پڑھانا چاہتے ہیں، ان کے لیے سرکار ضرور اسکول کھولے گی۔ اس میں تعجب کرنے کی کیا بات ہے؟"

"واجب بات! واجب بات!"

تالیور گوڑھی کی واجب بات سن کر سبھی کے چہرے مرجھا گئے... آج بڑھا کھکھوایا ہوا ہے شاید۔ آج کوئی کام بننے کی امید نہیں۔

تالیور گوڑھی نے لوگوں کے مرجھائے ہوئے چہروں کو پھر کھد دیا۔ بولا، "بھیا، تم لوگ کہاں سو؟ پاکستھیاں سب بھلا بسے گا؟ بسنے کا ہوتا تو یہ جہاں بسے ہوئے تھے، وہاں سے بھاگتے ہی کیوں؟"

"واجب بات! واجب بات!"

دو سوتیلے بھائی، جے رام سنگھ اور رام جے سنگھ، آج کل تالیور گوڑھی کے بنا پیسوں کے لٹھیت ہیں۔ جے رام سنگھ بولا: "سال جہاں جہاں کالونی بسایا وہاں جا کر دیکھیے۔ ای بکلیا دیکھنے میں 'بھوپیا' (بے زبان) لگتے ہیں، لیکن بھیتر بڑے استاد ہوتے ہیں!"

"راتوں رات سیمنٹ، لوہا، لکڑ بیچ کر گاؤں کے گاؤں بھاگ گئے۔ سیسوا میں، مہی چندا میں۔ سب جگہ یہی حال ہوا کالونی کا۔"

"کام چور ہیں سب۔"

"فیشن دیکھا ہے؟"

"سالا زنانہ بھی کھڑاؤں پہن کر چلے گی۔ دھرتی پر پیر نہیں دے گی کبھی۔"

"دھرتی پر پیر کیسے دے؟ سرکار بہادر کا روپیہ ہے، گھر کی مرغی ہے، چاہے دال بناؤ..."

پنڈت رام چندر چودھری اب تک چپ تھے۔ کھینی (تمباکو) تھوکتے ہوئے بولے، "اگر اسکول کا روپیہ ہضم کر کے پاکستھیاں لوگ نہیں بھاگے تو میرا نام رام چندر چودھری نہیں، لنگر چندر

چودھری ہیں۔ جتنے کھٹمنے اور کام چور لوگ تھے، سبھی ریفوجی (رفیوجی) ہو گئے ہیں۔ مگر پنجابی ریفوجی ایسے نہیں۔ پٹنہ میں سیکشن (ایگزیبیشن) روڈ کے بغل میں، لالی سنیما کے سامنے ایک پنجابی ریفوجی کی چوڑے کی دکان تھی۔ جب ہم لوگ اپیل کرنے کے لیے ہائی کوٹھ (ہائی کورٹ) گئے تھے تو وہ جاڑا، گرمی، برسات چھوڑ کے اور مسکی پیچتے تھے۔ اور جب کیس کا ججمنٹ سنے تو دیکھا کہ چوڑے کی جگہ پان کی دکان، اور نہ بوڑھا ہے نہ بوڑھی ہے...

"کہاں چلے گئے؟ سرکاری قرضہ کھا کر بھاگ گئے؟"

"نہیں حضور، وہ کیوں بھاگیں گے؟ بھاگیں یہ بنگالی ریفوجی۔ اب پتہ لگا ہے، پٹنہ میں تو تین دکانیں مل چکی ہیں اور وہاں تین منزلہ بلڈنگ..."

"بلڈنگ کیا؟"

سو بجا دفعدار نے چودھری سے بلڈنگ کے معنی سمجھا دیے اور بات کے سرے کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ "پنجابیوں کی تعریف کرتے ہیں۔ محنت سے، کام سے ان کا بھوت بھاگتا ہے۔ دن بھر ایک تو موٹے مشٹنڈے، دیکھنے میں جیسے ہیں، ہمیشہ پھرتیلے... آپس میں بات کریں گے۔ کسی کو 'سالا' 'ریشما سالا' کہیں گے..."

چودھری رام چندر کو مہتو دفعدار کی یہ عادت اچھی نہیں لگتی۔ بات کے بیچ میں بولنے کی مت، وہ جھنجھلا کر بولے، "سالا ریشما سالا کہنے کو کون سی بڑی بات کہتا ہے؟ سالا تو جیسے بہار میں، ویسے بنگال میں۔ دو کوڑی کا چھوٹا چھوٹا بچہ بھی ہم لوگوں کے بڑوں کو کہتا ہے۔ اسٹوپڈ، جنگلی، گھونچا..."

"اسٹوپڈ معنی؟"

سو بجا دفعدار خود اسٹوپڈ کے معنی نہیں جانتا، کیسے سمجھائے مطلب پوچھنے والے کو؟

مسکرا کر بولا، "مگر ہمارے کالونی میں ایک ہی زنانہ ایسی ہے کہ دیکھیے تو بس دیکھتے ہی رہ جائیے، بیوٹی فل۔"

اب کے سو بجا دفعدار ایک سرکاری بات بولا، "ارے ہاں، وہ عورت نہیں، چالاک ہے چالاک! کبھی حاکم سے مصاحبی ہوتی ہے اور کبھی حاکم لوگ گم ہو جاتے ہیں... دارو غہ صاحب کہہ رہے تھے، اس

پر نظر رکھنا۔ شاید کومنس (کمیونسٹ) ہے..."

"کومنس کیا؟"

تالیور کوڑھی نے کہا: "کومنس کے معنی بھی نہیں جانتے؟ ابی، جس کو ہندی میں کمسین کہتے ہیں، اسی کو اردو میں کومنس کہتے ہیں۔"

موہنا نے رکاوٹ ڈالنے کی کوشش کی: "نہیں نہیں..."

اس بار پنڈت رام چندر چودھری چڑ گئے۔ "موہنا تم یک سال کی دفعداری میں ہی تالیور بھائی کی بات کو نہیں کاٹ سکتے۔ ایک تم ہی ہو معنی سمجھنے والے اس گاؤں میں؟"

موہنا بولا: "کومنس کا معنی کمسین ہے۔ مگر ایسا کمسین..."

موہنا کو کسی نے بولنے نہیں دیا۔

سامنے کی سڑک سے نبی نگر کالونی کے پھیری کرنے والے لڑکوں کا ایک جھنڈ گزرا۔ گلے اور پیٹھ پر ٹین کے کنستر لٹکائے۔ بسکٹ، لیم جوس، کچھ کی پھیری کرنے کے لیے ٹرین اور بس سے دور دور تک جاتے ہیں۔ پھر رات کو دس گیارہ بجے لوٹیں گے۔

پوترا "فس گھر" کے دکھن میں ٹنگس کے چھوٹے پیڑ کے پاس کھڑی ہے... نہ جانے کہاں دیکھ رہی ہے! نہ جانے کیا دیکھ رہی ہے!

گوپال دا نے پوترا کا دھیان بٹایا۔ "کیا دیکھ رہی ہیں؟ اسکول کی چھت دیکھ رہی ہیں؟ اور دیکھنا نہیں ہوگا۔ ہم لوگوں کے نوبین نگر کے اسکول کا سائٹ۔ 'یکدم پھسٹ کلاس'..."

"نہیں گوپال ماسٹر! میں کچھ اور ہی دیکھ رہی ہوں۔ آپ کو بھی دکھلاتی ہوں ابھی۔ سبھی جمعہ پوروالوں کو بلا کر دکھلانا ہوگا۔"

"کیا؟"

پوترا ہنسی۔ بولی: "ادھر آئیے۔ یہاں کھڑے ہوئیے... اب دیکھیے۔ وہاں، اس... ادھر نہیں سیدھے، اور اس تیڑھے پیڑ کو۔ دیکھ رہے ہیں نا؟ اب اس سے بھی دور جو کالا جنگل دکھائی پڑ رہا ہے... اور تاڑ کھجور یل کے دو گھر... کھجور کے دونوں پیڑوں کے اس پار۔ دیکھی؟... اچھا،

بولے تو گوپال ماسٹر۔ ہم لوگوں کے جمعہ پور گاؤں سے اچھی زمین پر ہاٹ جیسا ماحول پڑتا تھا... مات بیٹھیے آپ جمعہ پار کے فارم پر گھر سے پر پورب منہ کھڑے ہیں اور وہ روشنی پڑ رہا ہے تبھی زمین پور ہاٹ کا [illegible] نکل۔ وہ پیڑ۔ نصیب یہ ہی بڑھا پیڑ [illegible] راستے میں بھی تھا۔ [illegible] سے جڑ والی پیڑ... آپ کو یاد ہے؟... دیکھیے تو" بولے تو؟"

گوپال نے آنکھوں کے اوپر ہتھیلی رکھ کر دور تک [illegible] اور پھر [illegible] آنکھوں کو رگڑا۔ پھر دیکھتا ہی رہا۔ "[illegible] ہے؟" (یہ کیا معجزہ ہے؟)

"میں کل سے ہی دیکھ کر حیران ہوں۔"

گوپال [illegible] چپ چاپ کھڑا دیکھتا رہا [illegible] سب کچھ بھول گیا۔ [illegible] گاؤں [illegible] کھڑے [illegible] ہاٹ کی طرف دیکھ رہا ہے۔ پیڑ کی طرف [illegible] کاشی ناتھ [illegible]۔ گوپال [illegible] فوراً [illegible] سے وہ [illegible] سیکریٹری (پٹواری) [illegible] پانچ [illegible] کی بات [illegible] اور [illegible] زمیندار کا بیٹا قاسم [illegible] رہا ہے۔ پٹواری [illegible] اچھی زمین پر [illegible] گاڑی پر... [illegible] کے پاس [illegible] گاڑی [illegible] کا [illegible] انصاف۔ [illegible] میں [illegible] ہوئی؟ پٹواری [illegible] نہیں ہوئی۔ [illegible] دیکھا جائے۔ [illegible] سے [illegible] پر کھڑی [illegible] رہی ہے" گوپال ماسٹر، بابا اب آ ہی رہے تھا یہاں [illegible] بیٹھیے نا..."

"گوپال ماسٹر کی ہولو؟" (کیا ہوا؟)

"[illegible] نہیں ہوے [illegible] تو... آ ہی [illegible] ..." (میں بھوک ہڑتال کروں گا)"

"[illegible] تھوڑی تو [illegible] ہے۔ کل مکان [illegible] ٹھیکیدار بھی آ رہا ہے۔"

"[illegible] (ہاں) [illegible] جیسا [illegible] کا بیٹا [illegible] ظالم [illegible]... آ ہی [illegible]..."

"کیا بک رہے ہو ماسٹر؟"

"میں [illegible]"

اچانک گوپال ماسٹر کو کسی نے تبین نگر کالونی کے آفس گھر کے سامنے لا کر پٹک دیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔ ''اے کی دیکھالے دیدی ٹھ کرن؟... یہ کیا دکھلایا تم نے؟ یہ کیسے ہوا؟''

''سوچتی ہوں، گاؤں کا رخ اس طرف کر دیا جائے۔ جیسا جمعہ پور میں تھا۔''

''البتہ (ضرور) بدل دیجیے!''

گوپال ماسٹر کو اتنی بڑی بات مل گئی اور وہ چپ چاپ کھڑا رہے گا؟ اس نے جمعہ پور کے ایک ایک باسی کو نام لے لے کر پکارنا شروع کیا: ''آ کر یہاں دیکھو... اپنی جنم بھومی کی ایک جھلک۔ دیکھو!''

چھدام داس، کالا چاند گھوش، ہرے رام، ہری دھن، راکھس بشواس، ہرلال ساہا، لکھی کانت سرکار، سبھی دوڑے آئے۔ ''بھوت اوت تو نہیں؟''

کھیت کھلیان سے لوٹتے ہوئے اور ہاٹ بزار سے آئے ہوئے لوگوں کو گوپال دا چورستے پر، کالونی کے باہر ہی، چیتاونی دے دیتا ہے: ''ایک عجوبہ چیز دیدی ٹھاکرن ایک مجا' کی چیز دکھلا دے گی... چل! چل!''

پوترا نے کالا چاند سے بھی اسی طرح کھڑا ہونے کو کہا۔ ''ہاں، تم ایک بار آنکھ موند کر سوچو کہ تم جمعہ پور کے ٹھاکر بو گھرے پر کھڑے ہو کر اچھی مدین پور ہاٹ کی طرف دیکھ رہے ہو۔ سامنے، پورب کی طرف۔ پھر آنکھیں کھولو... لو، آنکھیں بند کرو۔''

کالا چاند ہنسا۔ ''آنکھ موندنے سے کیا ہوگا؟ چیز جو اس 'پرائے دیش' پر ہے''

''تم موندو بھی! اور جیسا کہا ہے...''

آنکھیں کھول کر کالا چاند نے کچھ دیر تک پورب کی طرف دیکھا اور اس کا چہرہ پیلا پڑ گیا... اسی جڑ دل کھجور کے پیڑ پر چڑھ کر اس نے طوطے کے دو بچوں کو اتارا تھا رام لکھن کا جوڑا... اچھی مدین پور ہاٹ کا آلو چوپ کھانے کے لیے دو مرے پیسے چرا کر ہاٹ بار ار کو بھاگ جاتا تھا...وہ، وہاں جو بگلے اڑ رہے ہیں، وہیں ہے بل بل دیکھی — مچھلیوں سے بھری ہوئی چھوٹی ندی۔ اسی کے کنارے محرم کا میلہ لگتا ہے۔ جنگل کے اس پار اچھی مدین پور گاؤں ہے۔ جنگل کے پاس وہ... درگاہ

جب ... جنگل سے ایک دن ہزاروں لوگ جلوس بنا کر نکلے تھے ... بندے ماترم! بندے ماترم! بھارت ماتا کی جے!

چترا نے ہنس کر پوچھا، تم وہیں انکار بے ہو؟"

"اور چندر عمر سے کہنے لگے بابا! ڈیڈی کہا کرتے، اس پردیس میں ..."

چترا نے ڈانٹ کر، پھر پردیش کہتے ہو؟"

نہیں ڈیڈی کہا کرتے تو ... سچ مچ جمال پور میں ہی سب کم ہوگئے ... ... آپ نہیں سمجھے

[illegible] جمال پور گاؤں کی تصویر [illegible] تو [illegible] دیکھے ہو؟"

[illegible] جمال پور گاؤں کی تصویر بھی اپنے دیش کی جھلک!

[illegible] منصور صاحب کی دکان میں نوکری کرتا تھا۔ روز صبح اٹھ کر ہاٹ کی طرف جانے سے پہلے پورب کی طرف دیکھ لیتا تھا۔ [illegible] کر سامنے [illegible] کو دیکھ [illegible] جاتا تھا۔ [illegible] رنگ [illegible] پہ [illegible] ... [illegible] منصور صاحب کی دکان میں کام [illegible] تھے۔ [illegible] منصور صاحب نے اپنی دکان سے [illegible] تھے۔ [illegible] سامنے دیکھ کر [illegible] کی جان پر بن آئی ... کسی طرح اس [illegible] کو [illegible] گھنٹے تک لٹکا رہا ...

چندر [illegible] کی سمجھ میں کوئی بات نہیں آ رہی!

اس [illegible] کا جسم [illegible] وقت [illegible] کی حالت میں مختلف کیمپوں میں ہوتا [illegible] کیمپوں میں۔ اس کے باوجود وہ ان کھیتوں کی طرف کھجور کے پیڑوں کو، کالے جنگل کو، [illegible] والے گھروں کو ٹکٹکی لگا کر دیکھ رہے ہیں ... وہ بھی مدین پور کیوں ہونے لگا؟ وہ [illegible] گاؤں ہے۔ کل ہی اس گاؤں میں بسنت [illegible] آیا ہے!

جمال پور والے [illegible] کو رات بھر نیند نہیں آئی۔ [illegible] یاد [illegible] نے [illegible] کے [illegible] میں بھی وہی جھلک! وہی مدین پور ہاٹ کی روشنی! ویسی ہی جھلملاتی ہوئی روشنی!

رات بھر، جب تک وہ جگے رہے، جمعہ پور میں ہی رہے — وہیں کی یاد، وہیں کی چرچا۔ کسی نے کھایا، کوئی یوں ہی لیٹا رہ گیا۔

رات کے تیسرے پہر میں نیند کے ساتھ سپنے آئے — سبھی کو۔

صبح میں ایک دوسرے کے سپنے کی بات سنتے اور ایک لمبی سانس چھوڑ کر چپ ہو جاتے۔ راکھل نے کہا، آج وہ کھیت پر نہیں جا سکے گا۔ رات بھر اس کی چاچی پکارتی رہی ہے: "اورے راکھال، کوتھائے گیلے رے!"

تیس جمعہ پور والوں میں بیس مرد عورتوں نے اس دن کوئی کام نہیں کیا۔ لیکن پھیری والے نوجوانوں لڑکوں نے وقت پر اپنا کام کیا۔ ایک دوسرے کو پکار کر بلایا، نہائے دھوئے اور اپنی اپنی جھولی، ٹوکری، کنستر اور بکسے لے کر نکلے۔ "چل رے اساڑھے آٹھ با جو... گاڑی چھوٹ جانے پر آج بس نہیں ہے پھر۔"

پھیری کرنے والوں کا لیڈر ہے بشنو۔ ٹرین میں چیکر اور گارڈ سے مل کر، اپنے ساتھیوں کے دکھ درد کی کہانی سنا کر، ٹرین میں پھیری کرنے کا زبانی 'آڈر' لینا، بس کے ڈرائیور اور کنڈکٹر کو خوش رکھنا اور گروپ کے خرچ کا حساب رکھنا بشنو کا کام ہے۔ مہاجن بھی اس کی ضمانت مانگتے ہیں۔

کالونی سے باہر نکل کر اسے یاد آیا — ویدی شاکرن نے بتایا تھا، کوئی چٹھی بھیجنی ہے کہیں۔

پوترا آفس گھر میں جمع لوگوں کو سمجھا رہی تھی، "کام پر نہیں جانے کی کیا وجہ؟ کیا مطلب؟ ... دیکھو، 'دیش' کی یاد، اپنی جنم بھومی کی یاد کرتے کرتے ہمارے دل تن ہو گئے ہیں۔ کسی کام میں جی نہیں لگتا۔ ہمیں کسی چیز سے پیار نہیں، نہ یہاں کی دھرتی سے، نہ یہاں کے لوگوں سے اور نہ یہاں کے جانور پنچھی سے۔ کسی چیز پر وشواس جمتا ہی نہیں۔ اس لیے بھگوان نے سوچا کہ چلو، انھیں اپنی لیلا دکھلا دو، تاکہ یہ یہاں کی مٹی کو پیار کر سکیں، یہاں کے لوگوں سے پریت جوڑ سکیں۔ جمعہ پور اور نئی نگر ایک ہی ہے..."

بشنو آ کر چپ چاپ کھڑا ہو گیا۔ پوترا بولی: "نہیں بشنو، تم جاؤ۔ میرا کام ہو گیا۔"

سبھی چلے گئے۔ پوترا اپنے کام کا لیکھا جوکھا لینے لگی: "چار نمبل کلا تھ، دو آسنی، دو درجن گلاس ڈھکنے کے نیٹ کور، پانچ بٹوے۔ دو مہینے کی پیداوار — بس اتنا ہی؟"

Scanned with CamScanner

پوترا کالونی ممبر ہے۔ ضلع کالونی کمیٹی کے کئی اہم شعبوں سے اس کا تعلق ہے۔ ہر مہینے میں ایک بار اسے 'صدر' جانا پڑتا ہے۔ پرسوں ایک لازمی میٹنگ ہے۔ وہ چاہتی تھی، بشنو کے ہاتھ ایک چٹھی بھیج کر...

کالا چاند کی ماں پھر کہاں آ رہی ہے؟

"کیا ہے کالا کی ماں؟"

"کچھ نہیں۔ ایک بات پوچھنے آئی ہوں۔"

وہ بیٹھ گئی، چٹائی پر۔ پوترا نے پوچھا: "کیا بات ہے؟"

اُدھر یوگیش داس کی بیٹی سندھیا دیدی ٹھاکرن کے سکھائے نئے گیت کا ریاض کر رہی ہے:

"دیشے دیشے مور گھر آچھے..."

کالا چاند کی ماں کا رنگ ڈھنگ دیکھ کر پوترا سمجھ گئی، آج یہ بوڑھی سچ مچ کوئی گمبھیر بات پوچھنے آئی ہے... کالا چاند کی ماں 'ٹھاکر باڑی' کی نوکری کرتی تھی۔ پوترا کے گھر کی بہت سی باتیں جانتی ہے۔ وہ یہ بھی جانتی ہے کہ جمعہ پور میں ہوئے فساد کے پیچھے دھرم اور ذات نہیں کیونکہ علاقے بھر کے لوگوں نے پتاشرکر کو ایک دن پہلے تک یقین دلایا تھا: "آپ مطمئن رہیں۔ یہاں کچھ نہیں ہوگا۔" کالا کی ماں نے ہی ریلیف کیمپ میں چپ چاپ بتلایا تھا: "قاسم بھالے کی نوک پر ونو کا کٹا ہوا سر لے کر سب سے آگے تھا۔ ونو بھرجی۔ لکشم پور کے رائے صاحب وکال بھرجی کا بیٹا — جو 'پتاٹھاکر' کے نام اپنے باپ کا خفیہ پیغام لے کر آ رہا تھا... یا اس کے من میں جو بیٹھی ہوئی تھی، اسی کی ٹن گن لینے آ رہا تھا۔ ابھی مدین پور ہاٹ پر قاسم نے اسے دیکھا اور بہلا وا دے کر اپنے گھر لے گیا۔

کالا چاند کی ماں بولی، "دیدی ٹھاکرن! ایک بات پوچھوں؟ برا نہ مانیے گا۔ آپ پڑھا 'پنڈت' ہیں۔ بھول چوک ہو تو معاف کر دیجیے گا۔ سب کچھ تو ملا — اپنے دیش کا اناج، مچھلی، چاول، ترکاری — سب کچھ اپنے جمعہ پور گاؤں میں جیسا ملتا تھا، یہاں بھی ملتا ہے۔ ہوا پانی بھی وہی ہے... لیکن 'من کے مانس' جیسا کوئی یہاں نہیں؟ مجھے معاف کرنا دیدی ٹھاکرن!... تم نے ایک بار کہا تھا: یہاں بھی سینکڑوں قاسم ہیں..."

پوترا سمجھ گئی، کالا چاند کی ماں کیا کہنا چاہتی ہے۔ پوترا کو لگا، کالا چاند کی ماں نے اس کے دل

کے سب سے زخمی تار کو چھو دیا۔

نبی نگر کے آکاش پر، کوؤں کا ایک جھنڈ بے طرح شور مچاتا ہوا چکر لگانے لگا۔

پوترا نے اپنے کو سنبھال لیا۔ اس نے مسکرانے کی کوشش کی۔ ''کالا کی ماں، تعجب کی بات! 'من کے مانس' جیسا بھی 'مانس' ہے یہاں۔ اپنے من کی بات آنکھوں میں لکھ کر وہ بھی لے آتا ہے۔ آنکھوں سے ہی جواب اسے ملتا ہے۔''

کالا کی ماں بولی، ''دیکھنے میں ہوبہو ونود بابو جیسا ہے نا؟ میں بتلاؤں؟ وہ... وہ 'خبر کے کاغذ' کا بابو؟''

پوترا اس بار ہنس پڑی۔ کالا چاند کی ماں نے کہا، ''میں نے ٹھیک ہی پکڑا ہے؟... لیکن ونود بابو کی طرح... یعنی... اس نے کچھ کہا نہیں ہے؟ آپ نے... آپ نے... دیدی ٹھاکرن، سب بھگوان کی لیلا ہے۔ لیکن بات آنکھوں میں...''

''کالا کی ماں! سب سے زیادہ تعجب کی بات سنو گی؟ ونود کی طرح ہنستا بولتا ہے، ہکلاتا ہے۔ مٹھائیوں میں اس کو بھی چندر پلی سب سے زیادہ پسند ہے۔''

''دیدی ٹھاکرن! میں تمہارے پاؤں پڑتی ہوں۔ بھگوان نے شاید انہیں ہی پھر بھیجا ہے، من کی بات کہنے کے لیے...''

''من کی بات تو وہ کہہ چکا۔''

''تم نے کیا جواب دیا، دیدی ٹھاکرن؟''

''تم پاگل ہو گئی ہو کالا کی ماں؟ تم کیا چاہتی ہو؟ کھوئے ہوئے دھن کو پا کر میں پھر کھو دوں؟... میں صرف پوترا نہیں... میں آگ ہوں، میں تلوار ہوں، میں برچھی ہوں، میں، میں... زہر ہوں... ناگن ہوں۔ وہ مجھے پا کر، یا میرے من کو پا کر کتنی دیر جی سکے گا؟... اور تم لوگوں کو چھوڑ کر میں کہیں جاؤں گی تو کتنے دنوں تک... تم لوگ مجھے اپنے دروازے سے اس طرح ٹھیل کر باہر نہیں پھینک دینا! اور... تم... تم، کالا کی ماں، میری ماں ہو! بھگوان کے لیے پھر کبھی ایسی بات منھ سے نہ نکالنا... وہ... اُسے یہ بات... اس بات کی بھنک بھی نہیں لگے... دہائی...! اسے جینے دو! نہیں تو تم لوگوں کی دیدی ٹھاکرن...''

پوترا دہاڑ مار کر رو پڑی

کالاچاند کی ماں اس کے امنڈتے آنسوؤں کو پونچھتے ہوئے خود رو پڑی۔ ''نہیں ماں! میں تجھے اپنے کلیجے سے سٹا کر رکھوں گی۔ اپنی نیا کو آنکھوں میں بٹھا کر رکھوں گی... تی بے آمار پران...'' (تم تو میری جان ہو...)

❁ ❁

Scanned with CamScanner

پھنیشور ناتھ رینو

ہندی سے ترجمہ: شہاب الدین گیلانی

ٹیبل

مس ذرباداس!

اب صرف مس ذرباداس نہیں — مس ذرباداس، اسسٹنٹ برانچ منیجر، کانٹی نینٹل کامپلکس اینڈ ذرگز لمیٹڈ کلکتہ، بمبئی، دلّی، پٹنہ، برانچ پٹنہ۔

برانچ آفس کے ہر سیکشن میں پچھلے سات دنوں سے بس ایک ہی چرچہ، چرچا کا ایک ہی موضوع — ذرباداس، ذرباداس کی قسمت۔ ڈسپیچ کلرک ہو کر کمپنی میں آئی، پھر ہیڈ کلرک، اور آٹھ سال بعد اسسٹنٹ برانچ منیجر کا یہ نیا عہدہ۔

کینٹین کی سیڑھی کے پاس بیٹھا جمعدار انجیلا کھ رام سنا رہا ہے نئے بیرے سیرام داس کو: ''مس صاحب کو ہم دیکھا ہے جب مس صاحب فراک پہنتی تھی۔ بہت بڑے حسابی بنگالی بابو کی بیٹی ہے مس صاحب۔ ایک دن بھوڑو، بیٹے تمہیں جاؤ، بس ایک دن کی مجوری تمھاری ضرور کٹے گی۔ کہتے، حرام کا پیسہ کھا کر ہڈی کیوں گلانا چاہتے ہو؟''

مالی بولا، ''تو خاندانی کنجوس کہو مس صاحب کو۔ کل میجر باغ سے گلاب خرید کر، دوہرا گلدستہ بنایا بڑے جتن سے۔ گھر پر دے آیا — خوشی خوشی۔ سو، گلدستہ ہاتھ میں لے کر چٹکی بھر جس کے چھوٹے... سب کے سب بلیک پرنس گلاب تھے۔''

سنگیسر رام، جنرل سیکشن کا چپراسی، دور سے ہی مسکراتا ہوا آ رہا ہے۔ اس نے سمجھ لیا ہے، گپ

Scanned with CamScanner

مس صاحب کے بارے میں ہی ہو رہی ہے۔ آتے ہی بھوجپوری میں بولا: ''آج آ مِسو کمپلیٹ ہو گئے۔ آج تکھنیو ٹنک جائی — نیم پلیٹ۔''

''تب تو آج سے تمھارے ڈپارٹ میں نہیں بیٹھے گی؟''

''یہاں بیٹھنے والا بھی آ گئیں... بمبئی سے، بڑا بابو۔''

سنگیسر کینٹین کی طرف بڑھا تو یونین کا چندہ اُگاہنے والے یدون جگوتی پرساد نے روک کر کہا: ''اے نیم پلیٹ کمپلیٹ! کدھر؟... ڈپارٹمنٹ میں چاؤ چھی دے گی مس صاحب یا جے جے سیارام؟''

سنگیسر ہنس کر بولا: ''او ڈریں جو کبھی کھائے۔ نہ کیکر و کھات دیکھ لیں۔ نہ کیکر و کو کھلاوت دیکھ لیں — آج لے۔'' سچ مچ مس ذربا کو کسی نے کھاتے کھلاتے نہیں دیکھا کبھی۔ جنرل سیکشن — جہاں ذربا داس بیٹھتی تھی — سونا سونا لگتا ہے۔ کونے میں بیٹھتی تھی مس ذربا، ہیڈ کلرک۔ لگتا تھا، ایک بڑا اچھا سجایا ٹیبل لیمپ جل رہا ہو... آٹھ سال تک وہ ٹیبل لیمپ — ذربا داس کے خوبصورت چہرے کی طرح — ایک جیسی روشنی کے ساتھ ہال کے کونے میں جلتا رہا — دس سے پانچ تک۔ کبھی کبھی سات بجے شام تک۔

دن بھر میں صرف دو تین بار اس کی کال بیل بجتی، دو بار پانی پیتی۔ لنچ کے وقت پاؤڈر کی ڈبیہ جیسے ٹفن بکس سے ایک لمبی بسکٹ نکال کر کتر لیتی۔ بولتی بہت کم۔ مسکراتی رہتی، ہر گھڑی۔ کہتے ہیں، اسی سندر مسکراہٹ کے پیچھے ذربا کی کامیابیوں کا راز چھپا ہوا ہے۔ سیکشن میں ملک کے کونے کونے سے ایک سے ایک گھگھے بابو آئے۔ جس نے ذربا کی اس مسکراہٹ کے غلط معنی نکالے، وہ گیا۔ ترپاٹھی، سنہا، بنگڑا اکھر جی — سبھی نے ایک ہی غلطی کی، ترتیب وار۔

نگینہ پرساد کو بلا وجہ بات کرتے وقت صفحے پلٹنے کی عادت ہے اور بغیر زبان سے انگلیاں گیلی کیے دو ورق سے زیادہ نہیں لٹ سکتا۔ مس ذربا نے لکھ کر اس گندی عادت کو چھوڑنے کی چیتاؤنی دی تھی۔

آج نگینہ پرساد زیادہ جوش کے ساتھ باتیں کر رہا ہے اور اس کی انگلیاں — مشین کی طرح — ہر دو ورق کے بعد زبان سے چپک جاتی ہیں۔ ''چپ ... اچپٹ چپٹ اچپ ... کیوں بھائی، بڑے

بابو بڑے صاحب کے کمرے میں ہیں، کیوں؟''

ٹرانسپورٹ کلرک سین بولا، ''اچھا بھائی، ہم تو ہندی کا مذکر مونث نہیں جانتا کچھ... بتاؤ تو اس مس داس کو... آئی مین... چھوٹا صاحب کو کیا بولے گا؟ بڑا صاحب... چھوٹا میم تو نہیں بولنے سکتا!'' سبھی ہنسے!

مس ڈریاداس ہیڈ کلرک نے ٹرانسپورٹ کے سین کا حساب چیک کر کے کہا ''حساب غلط ہے۔'' سین نے سارا دن بیٹھ کر حساب کیا — کروایا۔ پٹرول کے کوپنوں سے لے کر آٹو موبائل گیراج کے بلوں کو دہرا کر دیکھا۔ ساڑھے چار بجے جو حساب پیش کیا سین نے، اس پر سرسری نگاہ ڈال کر ہی مس ڈریاداس نے — خالص بنکم چندر چٹرجی کے انداز کی بنگلہ میں کہا تھا: ''مہربانی کر کے آپ اپنی کھوپڑی میں روز بکری کے گھی کی مالش کریں۔''

پرچیز سیکشن کے جھا نے ادھ جلی سگریٹ کو سلگا کر کہا: ''یہ تو ظلم ہے۔''

''کیا ظلم ہے؟''

''یہی کہ زنانہ ذات راج کرے اور مرد ذات... ہمارے یہاں ایک کہاوت ہے...'' اور جھا نے موقعے کی مناسبت سے میتھلی کی ایک عورت دشمن کہاوت بیان کی۔ سین بولا، ''جھا بیٹا، بھانو سنگھ کے شعر پڑھتا ہے، ایں؟''

سبھی بابو جی دل کھول کر ہنسے۔ آج نئے بڑے بابو کے جوائن کرنے کا دن ہے۔ استقبال کے موڈ میں ہیں۔

''بڑے بابو ابھی تک بڑے صاحب کے چیمبر میں ہیں یا چھوٹے کے؟'' چاپلوس گلشن مہتہ کی چیچک کے داغوں والی سانولی صورت پر لالی دوڑی۔ موقعے پر بولنے کے لیے وہ کوئی بہت کم استعمال ہونے والا انگریزی کا کوئی لفظ ڈھونڈ رہا تھا شاید۔ لیکن کچھ بول نہیں سکا۔ بڑے بابو — نئے بڑے بابو، انوربجن گپتا — دفتر میں آ گئے — بڑے صاحب کے چیمبر سے۔

مہتہ نے آگے بڑھ کر استقبال کیا۔ ساتھ کام کرنے والوں کا ان کی سینیارٹی کے مطابق تعارف کروایا۔

سدا دیر سے دفتر آنے والے لیکن سدا سب کے کام آنے والے ہندا مہاراج آج بھی دیر

سے آئے۔ مس داس نے کبھی کبھی جواب طلب نہیں کیا بندا مہاراج سے۔ برہمن بوڑھا... ! بندا مہاراج کے گھر آج بھی خوش قسمتی سے پوجا تھی — جل کٹ لے آئے ہیں۔ بڑے بابو نے عقیدت کے ساتھ پرساد لیا۔ بندا مہاراج خوش ہو گئے۔

بندا مہاراج اب اپنی پرانی ماتحلی دیدی، نئی اسسٹنٹ برانچ منیجر — مس ذربا داس — کے نئے کمرے میں گئے۔ ذربا کو جل کٹ بہت پسند ہے۔ گیا کے علاقے کے نمائندے مانس کمار جی ہر سال تین بار ٹوکری بھر لے آتے ہیں۔ گلشن مہتہ مس ذربا داس کے چیمبر میں آ گیا۔ سب سے پہلے ہندی میں نیم پلیٹ ہونے پر مبارکباد دی، جیسے کہ ہندی کا وہ محافظ اس پوری کمپنی میں اکیلا وہی ہے۔ ذربا نے جنگلی نظروں سے مہتہ کو دیکھا۔

مہتہ نے اب نیم پلیٹ کی تعریف کی: "بہت بڑھیا بنا ہے۔"

"کیا بڑھیا ہے؟ نام ہی غلط لکھا ہے۔"

"ایں؟" مہتہ نے چیمبر سے باہر نکل کر نیم پلیٹ کو پھر پڑھا۔ "کہاں، کیا غلطی ہے؟ — غلطی تو کوئی نہیں دکھائی دیتی۔"

"ذروا نہیں، میرا نام ہے — ذریا۔"

مہتہ نے اس غلطی پر اپنا منہ سکوڑ کر کوٹ کے بٹن ہوں جیسے بتایا۔ "اوہ، اوہ، اوہ؟... خیر، ذ کا پیٹ کاٹ دینے سے کام چل جائے گا۔"

مہتہ نے اب مس ذربا کے نئے اور بڑے ٹیبل کی تعریف کی: "گرینڈ ہے۔"

اسی وقت ذربا کو کچھ یاد آیا... ٹیبل؟ "نیا ہیڈ کلرک — کپور — کہاں بیٹھا ہے؟"

مہتہ بولا، "اور کہاں بیٹھیں گے؟ جہاں آپ بیٹھتی تھیں۔"

ذربا اچانک اس طرح گمبھیر ہو گئی تو مہتہ کان کھجانے لگا۔ پھر آہستگی سے چیمبر سے باہر نکل گیا... پتا نہیں کیا بات ہوئی۔

ٹرنگ... ٹرنگ... ٹرنگ...

"ہوں! اجی جی، ہاں، یس سر، ابھی آ رہی ہوں۔"

ٹرنگ!... "بسنت سنگھ؟... تم ہی کو میرے متھے مڑھا گیا ہے؟ سنو — پرچیز سیکشن سے جیسے

بولو — بڑا صاحب بلاتا...''

ذربا داس بھی بڑے صاحب کے چیمبر میں گئی۔ پھر فوراً واپس آئی۔ عادت کے تحت اس کے پیر جنرل سیکشن کی طرف بڑھے۔ لیکن بسنو سنگھ کی کھلی ہوئی بتیسی کو دیکھ کر مڑی — اپنے چیمبر کی طرف۔

ذربا داس کی ترقی سے بسنو سنگھ بہت زیادہ خوش ہے۔ روپ کہتے ہیں اس کو، کہ دیکھیے تو دیکھتے رہ جایئے۔ نظر ہٹنے کا نام ہی نہیں لیتی۔ اس کو کہتے ہیں زنانہ کی خوبصورتی۔ بھگوان نے بسنو سنگھ کی پرارتھنا سن لی ہے — دلی آرزو! اب خدمت کرنے کا موقع ملا ہے — اتنے دنوں کے بعد۔

ذربا اپنے چیمبر میں آئی۔

... ونہوں۔ کچھ اچھا نہیں لگتا۔ نئے فرنیچر کی بو، وارنش کی بو ذربا کو اچھی لگتی ہے۔ لیکن آج کیوں نہیں اچھی لگ رہی؟ اُبکائی کیوں آرہی ہے؟ اس کے دونوں ہاتھ رہ رہ کر جھنک جاتے ہیں۔ دراز نئے ڈھنگ کی ہے اس میز کی؟ نیا ٹیبل؟ ٹھیک ہے۔ یہی... یہ ٹیبل نہیں پسند ہے ذربا کو۔

اپنے دونوں ہاتھوں کو دونوں طرف ٹیبل پر پھیلاتی ہے ذربا۔ جیسے لپٹا رہی ہو ٹیبل کو۔ اس نے دھیرے سے ٹیبل کے ٹاپ گلاس پر اپنا دایاں گال رکھا۔ تڑپ اٹھی، جیسے بجلی کا کرنٹ لگ گیا ہو۔ نہیں نہیں۔ نہیں چلے گا۔ لیکن؟

آٹھ سال سے جس ٹیبل پر کام کرتی آئی ہے، اس کے سوا اور کسی ٹیبل کے پاس بیٹھنے کی خواہش نہیں ہوتی۔ لگتا ہے، پرائے کے سامنے بیٹھی ہوں... ناممکن!

ٹرنگ

''حضور؟''

''بسنو سنگھ، مہتہ بابو کو...''

مہتہ کان کھجاتا ہوا پھرتی سے آیا۔ ''جی؟''

''مسٹر مہتہ ایڈ بابو... نئے بابو... ہیڈ کلرک آ گیا دفتر؟... کام کر رہے ہیں ٹیبل پر؟''

''ٹیبل پر کام؟ جی ہاں... جی نہیں۔ ابھی تو سنگھیر کو بلا کر تھوڑے سے ٹیبل کی کوئی کیل ٹھکوا...''

"کیا...؟ کیل؟"

سہتو تعجب سے بولا: "جی ہاں، کیل۔"

زربالا نے ذرا سی دانت پر دانت رکھ کر — جی جی! لیکن اس نے فوراً خود کو سنبھال لیا۔ "ٹھیک ہے، آپ جائیے!"

جائیے؟ سہتو جیسے کسی اور زرباد س کو دیکھ رہا ہے۔ ایسی اتاؤلی وہ آج تک بھی نہیں نظر آئی زربالا۔ کیل؟ کانٹا!... کلش سہتو کے من میں رہ رہ کر کیل چبھنے لگی — ایسا کیوں؟

سہتو چلا گیا۔

... کیا کیا جائے؟ وہ نہیں، زربالا کو چاہیے، آج چپ ہی بیٹھیں۔ بس ایک پل چین سے نہیں بیٹھ سکتی... نہیں نہیں نہیں، پتہ نہیں ہو سکتا کیسے... میرے پاس تو ہے نہیں۔ اور ادھر وہ گھنٹہ — آتے ہی کیل دے کے ٹھوکنا شروع، یا ٹیبل میں؟ پتا نہیں کیوں ہاتھ؟ جی جی! شاید جس کیل کو اس نے جان بوجھ کر آدھا ہی ٹھکوایا تھا — جوتوں کی تسمی ٹانگنے کے لیے — اسے تو نہیں؟ بھگوان جانے! لیکن یہ تو نقصان ہی نہیں، جرم ہے... کرام! اس نے یوں ایسا کیا؟

ٹرنگ!

"مجبور؟"

بسنو سنگھ نے نئے بڑے بابو کو مس داس صاحب کا سلام دیا۔

گاؤں ہی کے لمبے سے انتظار میں — اسی طرف کی راہ دیکھ رہے تھے بھی۔ بڑا بابو انورنجن گپتا بھی۔ بھی سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ سہتو دھیرے سے اٹھ کر بڑے بابو کے پاس گیا۔ دھیرے سے ہنس کر بولا: "ای ٹیبل بڑ اسکیپ ہے، بڑا بابو" (یہ ٹیبل بڑا خوبیوں والا ہے، بڑے بابو)

سہتو جب اپنائیت بھری بولی بولتا ہے تو پہلا جملہ ضرور دھنی میں بولے گا۔ اس نے پوچھا، "سر! مکان تو مل گیا...؟ ٹھیک ہے، کسی طرح کی کوئی بھی مشکل ہو — سہتو کو یاد کیجیے۔ ہمارا فرض ہے سر۔ ہمارا جنم اسی شہر کے قدیم علاقے میں ہوا ہے۔ جی، ہی ہی!"

بڑا بابو، یعنی انورنجن گپتا، ہال سے باہر چلا گیا تو سین نے پوچھا: "اچھا بھائی، تم بھی خوب آدمی

ہے۔ بھی بولتا ہے یہیں جنم ہوا ہے ہمارا۔ اس دن بڑا صاب کو بولا — جنم ہوا پنجاب میں۔ چاندنی — ناچانی چوک میں جنم ہوا۔ تمہارا جنم کتنا جگہ میں ہوا بھائی؟"

ہال میں ایک قہقہہ پڑا۔ لیکن مہتہ نے ہمیشہ کی طرح سین کی چوٹ کا رخ ہی موڑ دیا: "مائی ڈیر فرینڈز، کہیں نہ کہیں کوئی کیل ضرور ٹھونکی جا رہی ہے ... معلوم تو سبھی کو ہے کہ پچھلے سال کلکتہ میں ایک ہی ساتھ ٹریننگ میں تھے، دونوں۔ مسٹر اے گپتا اینڈ مس ڈربا داس۔ ایک کامیاب ہو کر اسسٹنٹ برانچ منیجر ہو گئی — دوسرا بڑا بابو کا بڑا بابو ہی رہا۔ پیور ہائی لینڈر نوجوان، اور نیو ہیڈ کلرک!"

مہتہ کے اس لکچر کے بعد دفتر کے کام کاج میں لوگوں نے خود کو ڈبونے کی کوشش کی۔ نئے بڑے بابو کی نگاہ میں آج ہی نہ چڑھ جائے کوئی، اس لیے سبھی توجہ کے ساتھ کام کرنے لگے — لیکن اس توجہ میں اصلیت کم تھی اور دکھاوا زیادہ۔ جیسا کہ عام طور سے دفتروں میں ہوتا ہے: ٹک بزی، ڈھونگ۔

ٹائپ رائٹروں کی تیز رفتار، کال بیل کی پکار، درازوں کو کھولنے اور بند کرنے کی آوازیں — سارے ماحول میں ایک بناوٹ، ایک ملاوٹ کپٹ۔

"سنکیسر! ... کہاں بھائی؟ ذرا پانی پلاؤ۔"

سنکیسر سب سمجھتا ہے۔ بہت بہت بابوؤں کو اس نے پانی پلایا ہے آج تک۔ اصلی پیاس، نقلی پیاس اور نظر کی پیاس — سبھی طرح کی پیاس کو وہ پہچانتا ہے۔ جہاں ایک بابو نے پانی مانگا، سبھی بابوؤں کی روح مانو پیاس سے اینٹھنے لگتی ہے۔

"سنکیسر! کہاں چلا جاتا ہے؟ کسی نے کہیں بھیجا ہے؟"

سنکیسر بڑبڑاتا ہوا آیا: "حجور، پانی چھو کے پھیلوا ہم نہ چھوئے ہے۔ گیلے ہاتھ کسی کاغذ پر نہ دھرے۔ مس صاحب بہت بگڑے گی ...!"

مہینے کے آخری ہفتے میں کئی بابوؤں کو سنکیسر سے قرض لینے کی ضرورت پڑ جاتی ہے، دس پانچ، شاید اس لیے سنکیسر کی جھلاہٹ پر کوئی دھیان نہیں دیتے۔ اس کے خلاف بات انگریزی میں ہو یا کسی ہندوستانی زبان میں، وہ سمجھ لیتا ہے۔ اپنی مادری زبان ٹھیٹھ بھوجپوری کے علاوہ کوئی اور زبان سیکھنے بولنے کی اس کی خواہش ہی نہیں ہوئی! چاہے بنگال کے بنرجی بابو بولیں یا مراٹھا بھونسلے صاحب سے بات چیت کرے، سنکیسر جاتانی، کھاتانی (جا رہا ہے، کھا رہا ہے) ہی بولتا ہے۔

Scanned with CamScanner

مہتہ کے من میں کیل کچ کچ چبھتی ہے۔ یہ بات ہے؟ وہ اور مینٹ نہیں رہ سکا...
ایک ریلوے رسید کے بارے میں پوچھنے کے لیے مناسب سوال گڑھ رہا ہے، وہ... مل گیا سوال اس کو، وہ ونل سے کراے بی ایم کے چیمبر میں پوچھتے ہوئے داخل ہوا: ''مے آئی کم ان...''

لیس مس ڈوربا، اس نے افسرانہ شان سے کہا: ''بعد میں آیئے''

مہتہ نے دیکھا — نئے بڑے بابو کے ہونٹوں پر ایک مخصوص قسم کی مسکراہٹ ہے، اور ڈوربا وس کے چہرے پر ایک نئی قسم کی بابٹیں... من میں کیل دو تین بار گڑی مہتہ کے، وہ پھر نہ چاہتے ہوئے بھی چیمبر سے باہر نکل آیا۔

تب مس ڈوس نے بات چیت کو آگے بڑھایا۔

''آپ کو مکان مل گیا؟ اچھا، کنڈیلٹ۔ یہ بہت بڑا پرابلم ہے پٹنہ کا...''

''ہر جگہ یہی حالت ہے۔ میرے ایک جاننے والے یہاں ریلوے میں ہیں۔ انھیں کی مہربانی سے ایک اچھا مکان مل گیا ہے، چھجو باغ کے پار،'' انورنجن نے بتایا۔

مس ڈوس کے اندر بہت دیر تک کشمکش کی کیفیت رہی۔ سامنے بیٹھے نوجوان سے یہ اس کی پہلی ملاقات نہیں۔ ایک ہی ساتھ ٹریننگ میں تھے وہ پچھلے سال... نوٹنگ سے نوٹس آج بھی اس کے پاس ہیں۔ پھر وہ پچیس صفحے کا ذاتی مضمون۔ ٹریننگ سے میں نے کیا حاصل کیا — دلچسپ ادبی طریقے سے لکھنے کی شرط تھی۔ اس نے مضمون لکھنے میں انورنجن کی مدد کی تھی۔ بی سنٹر میں بیٹھ کر چائے پیتے ہوئے آمنے سامنے بیٹھ کر، اسٹار سنیما میں شمبھو مترا کی فلم دیکھی تھی بغل میں بیٹھ کر — سب، ان یادوں کو مٹانا مشکل ہوگا۔ سفید چاک سے لکھی پرانی یادوں کو ڈسٹر سے صاف کرنا ہوگا... ڈسٹر سے صاف کیا ہوا ایک کالا بورڈ۔

نورنجن گپتا نے بہت پہلے ہی اپنے کو قابو میں کر لیا ہے۔ یہاں آنے سے پہلے ہی وہ آندھی طوفان جھیل چکا ہے۔ اس نے سمجھوتہ کر لیا ہے۔ بورڈ نے اسے اسسٹنٹ برانچ منیجر کے قابل نہیں سمجھا۔ اس کی بدقسمتی، وہ کیا کرے؟ لیکن پٹنہ فوری ٹرانسفر پا کر اسے مادی ضرور ہوئی تھی۔ جی جان سے کام کرنے کی اچھی سزا اسے ملی... اسے اس نے قبول کر لیا۔ طے کیا کہ وہ اپنے فرائض

Scanned with CamScanner

کی ادائیگی تندہی سے کرتا رہے گا۔

لیکن ابھی ابھی، کچھ لمحے پہلے اس کا دل پھر ڈگمگا گیا تھا... سلام کا جھجکتا ہوا جواب، ہاتھ اٹھانے کا انداز، آنکھوں میں غیر معمولی اپنائیت کی جھلک۔ سب کچھ دیکھ سن کر اس نے سمجھ لیا تھا کہ مس دواس کے من میں کچھ ہو رہا ہے۔

وہ کرسی سے اٹھنے کو ہوا۔

ذربا بولی: "بیٹھیے، میں نے بلایا تھا..."

انورنجن پھر کرسی پر بیٹھ گیا۔ کچھ لمحے چپ رہنے کے بعد انورنجن نے پوچھا: "جی، کہیے۔"

"وہ ٹیبل... آئی مین... وہ ٹیبل جس پر فی الحال آپ بیٹھتے ہیں... وہاں کل تک میں بیٹھتی تھی... وہ... وہ... وہ..."

"جی، وہ؟ کیا ہے اس ٹیبل میں؟"

"وہ میرا ٹیبل ہے..."

"آپ کا پرسنل؟"

"جی نہیں۔ میں نے اس پر آٹھ سال تک بیٹھ کر کام کیا ہے۔"

انورنجن نے کہا: "جی معلوم ہے۔ لیکن مجھے کرسی یہیں دی گئی ہے۔"

ذربا گمبھیر ہو گئی۔ اسے انورنجن کی بات کچھ غیر مہذب سی لگی... کرسی بدلنے کی بات کیوں بولا؟ اس نے من کی ساری ہچکچاہٹ کو اب دور کر دیا۔ بولی: "وہ ٹیبل مجھے — یہاں میرے چیمبر میں بھیج دیجیے۔"

"یہاں بھیج دوں؟... اور یہ ٹیبل وہاں جائے گا؟ لیکن یہاں اتنی جگہ کہاں ہے؟"

"نہیں یہ ٹیبل بھی یہیں رہے گا، وہ بھی۔"

"تو میں وہاں کس ٹیبل پر —؟"

ذربا دواس بے صبر ہو کر بولی: "میں اسٹور بابو کو بلاتی ہوں۔ آپ کو نیا ٹیبل ملے گا۔"

انورنجن نے بنا کچھ سوچے سمجھے جواب دیا: "ٹھیک ہے، یہ ٹیبل جائے پہلے..."

"پہلے پیچھے کیا؟ ابھی بھیج دیجیے۔"

Scanned with CamScanner

دریا داس پھر سوچ میں ڈوب گئی۔ انورنجن نے اس کے گالوں پر رنگوں کو اتنی تیزی سے چڑھتے اترتے نہیں دیکھا تھا — نہ سینیما ہال میں، نہ ٹرام میں، نہ ریسٹورنٹ میں — کہیں نہیں۔

انورنجن بھا۔ ذرا دیر اس کا دھیان ٹوٹا۔ گویا خود سے بحث کرتی ہوئی بڑبڑائی: "اس سے اب مجھ سے کوئی کام نہیں ہوگا..."

انورنجن اسسٹنٹ برانچ منیجر کے چیمبر سے باہر نکل آیا۔

اپنے جنرل سیکشن میں داخل ہوتے ہی اسے لگا — سیکشن کے ہر ٹیبل کے پاس انسانی جسم میں گڑی ہوئی آنکھوں میں تجسس اور حیرت مل جل کر جھلملا رہے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے بلبوں جیسی جوڑی جلتی ہوئی آنکھیں!

ٹرانسپورٹ ڈپارٹمنٹ کا ڈلال سین — جسے دفتر کے ساتھی 'ٹرانسپورٹ سین' کہتے ہیں — سگریٹ پیتا ہے۔ بڑے بابو کو سگریٹ پیش کرتا ہوا بولا: "سر! ڈویژن آف ورک کا فیصلہ ہو گیا؟"

انورنجن سگریٹ کا مزہ لینے لگا — کوئی جواب نہیں ملا سین کو!

سبھی جلتی آنکھوں نے بڑے بابو کے چہرے پر آنے جانے والے تاثرات کو پرکھنے کی کوشش کی — اپنے اپنے زاویے سے۔

بند مہاراج نے پان کا ڈبہ بڑھایا... "بڑے بابو پان کھاتے وقت سگریٹ نہیں پیتے۔"

گلشن مہتہ نے فوری تائید کی: "بہت اچھا کرتے ہیں سر! پان کھاتے وقت سگریٹ پینے والے کی سگریٹ کی تو ٹیسٹ بڑی... ال ی... عجیب..."

ٹرنگ...

"حضور!"

"کیا نام ہے تمھارا؟"

سنکیسر کے ساتھ سبھی بابوؤں نے دہرایا: "سنکیسر رام!"

"دیکھو، سنکیسر رام، یہ ٹیبل جائے گا اے بی ایم — یعنی مس داس صاحب کے کمرے میں..."

بابوؤں کی منڈلی ایک آواز ہو کر بولی: ''مس داس صاحب کے چیمبر میں؟ کیوں ں ں؟''

سب سے بعد میں سکسینہ نے پوچھا: ''سے کا ہے ہجور؟''

''وہ کہتی ہے...''

''کیا کہتی ہے سر؟'' مہتہ اب اپنی کرسی پر چپ چاپ بیٹھ کیسے رہ سکتا ہے؟ ''کیوں سر، آپ وہیں بیٹھیے گا؟''

انورنجن کی بھنویں کچھ سکڑیں۔ مہتہ نے سمجھ لیا۔ وہ بولا: ''وہ! میں سمجھ گیا سر!''

انورنجن نے سمجھایا: ''اس میں سمجھنے بوجھنے کی کوئی بڑی بات نہیں۔ وہ کسی دوسرے ٹیبل پر کام نہیں کر سکتی۔''

''تو دے دیں نا اپنا بڑا ٹیبل!''

''وہ بھی نہیں دے گی؟ دونوں ٹیبل رکھے گی؟''

''اسٹور میں نیا ٹیبل کہاں سے ہوگا؟''

''ذرا اسٹور ڈائل کرو، جہا۔''

مہتہ اسٹور کلرک سے پوچھتا ہے: ''ہاں، بنرجی دادا! سنیے، اسٹور میں کوئی سیکرٹیریٹ ٹیبل... ٹیبل نیا کوئی ہے؟ ایں؟ ہے؟... دل لگی چھوڑیے دادا۔ بڑے بابو کے لیے۔ نہیں؟'' مہتہ کے چہرے پر جھلاہٹ ہوئی — کسی زخم کے نشان پر۔

سین نے ہنس کر پوچھا: ''کیا بولا بنرجی دادو؟''

''پگلو ہیں یہ بنرجی دادا بھی! کہہ رہے تھے کہ ابھی شیشم کا پیڑ کٹنا دے گا، چرائی چڑائی ہوگی، تب جا کر ٹیبل ہوگا۔ بیڑ میں نہیں لگتا! ہنہ!''

ٹرنگ... ٹرنگ... ٹرنگ...

''ہاں، گپتہ بول رہا ہوں۔ جی؟ پھر میں کس ٹیبل پر؟ اسٹور میں نہیں ہے... عجیب بات ہے۔ کام تو مجھے بھی کرنا ہے۔ جی؟ لیکن، میں بڑے صاحب سے کیوں کہوں؟ آپ ہی کہیں... آئی ڈونٹ تھنک...'' کھٹ!

ٹیلیفون پر بات کے دوران سبھی بابوؤں کے مکھڑے پر جوش اور خوشی کی لہریں دوڑتی رہیں۔

اس کے بعد ہر ایک نے اپنے موڈ اور منھ کے مطابق مدد ادا کی۔

بڑا صاحب کہتے ہیں: ''ٹیبل میں کیا ہے ایسا؟''

مہتہ نے ایسا منھ بنایا جیسے کہ بابو نے اسے چھری سے چبھو دی ہو ابھی۔ سین بولا: ''سالا، کا منھ کا چہرہ کا واسطے اتنا درد اور انسان کے واسطے کچھ نہیں — دل میں؟''

انور تجن چپ رہا۔ نمیرہ پر سارا کی حالت پر اس کی نظر گئی۔ ورق الٹتے الٹتے رہا سے انگلیاں چھپیں۔ نمیرہ پر سارہ صفحے الٹتے ہوئے بولا: ''بہت سے خود غرض لوگوں کو دیکھا ہے۔ لیکن ایسا نہیں ... چپاک چٹ چٹ۔''

ہرتی ... سور بابو نے آ کر سے بڑے بابو سے اپنا تعارف کرایا۔ بولا: ''دیکھیے، آپ ہمارے بڑے بابو ہیں۔ دفتر میں ہم آپ سے بڑے ہیں انھیں آپ ہر عزت دیجیے صاحب۔''

''بہت چھوٹے دل کی ہے۔''

''دل میں رحم اور ہمدردی کا نام نہیں۔''

''کسی کی موری کھاتے وقت بھی کسی کی ہنسی اس کے چہرے پر رہتی ہے۔''

''آخر انسانیت بھی کوئی چیز ہے!''

بھگوان نے عورت بنا کے کیوں بھیجا ہے؟''

''ظلم ہے! اتنا روپ مفت چلا گیا!''

انور تجن سن رہا ہے ایک ایک تبصرہ۔ لیکن کوئی ذرہ بادہ اس کے کردار پر انگلی نہیں اٹھاتا۔ ظالم، پتھر دل، خود غرض — سب کچھ کہہ رہے ہیں لوگ۔ لیکن کسی نے یہ نہیں کہا کہ حسن اور شباب کے سہارے اس نے ترقی کی ہے — کوئی یہ نہیں کہہ سکتا۔

مہتہ بولا: ''کسی ضد تو نہیں کرنی چاہیے۔ اچھا، لیٹ می سی ...''

مہتہ دفتر سے باہر نکلا۔ جھا نے سین کے کان میں کہا: ''سالا چلا اب گوشٹی کرنے۔''

سین نے آنکھ دبا کر کہا: ''بیٹا، دیکھنا اب کھیل۔ کھیل تو اب شروع ہوا ہے۔''

سب لوٹ آیا۔ دربار اس کو تنا ... چین کبھی نہیں، یکھ مہتہ نے۔ کسی نے بھی نہیں۔ روپ سے بیکاری مسٹر سنگھ چپراسی نے بھی نہیں۔

بسنو سنگھ پچھلے سات سال سے مس داس کی بنا پیسے کی غلامی کرنے کا موقع ڈھونڈ رہا تھا۔ بھگوان نے اتنے دنوں کے بعد اس کی طرف دھیان دیا۔ آج ہی وہ گزارش کرنا چاہتا تھا کہ گھر پر بھی اس سے کام لیا جائے۔ بالکل کام کرے گا بسنو سنگھ، پیر میں جوتی بھی پہنا دے گا۔ لیکن آج تو ایسا من اچاٹ ہے مس صاحب کا کہ ایک پل چین سے بیٹھتی ہی نہیں۔

بند امہاراج بڑے صاحب سے پوچھنے گئے کہ اس پورنما کی رات میں بھی پوجا کرانے کے لیے کوئی پروہت چاہیے کیا؟ بڑے صاحب مس داس سے کہہ رہے تھے، ''نہیں۔ یہ کیسی لڑکپن بھری باتیں کرتی ہیں، آپ؟ آپ دو دو ٹیبل رکھیں اور... آخر وہ کہاں کام کرے گا؟ آخر اس ٹیبل میں کیا ہے؟''

مس ذربا التجا بھرے لہجے میں بولی: ''سر، وہ ٹیبل تو مجھے چاہیے ہی — چاہے جیسے بھی ملے۔ میں نیا ٹیبل دے رہی ہوں اپنا۔''

تب بڑے صاحب نے بات بدل دی، ''اونہوں' وہ ٹیبل اے پی ایم کے لیے ہے، ہیڈ کلرک کو نہیں دیا جا سکتا۔ اور آپ دینے لینے والی کون ہوتی ہیں؟''

بڑے صاحب نے جان بوجھ کر رخ کڑا کر لیا۔

''سر، تب میں کوئی کام نہیں کرسکوں گی۔''

بڑے صاحب کے چہرے پر اب جھنجھلاہٹ صاف نظر آنے لگی۔

اس سے پہلے ذربا داس نے ایسی جھڑکی نہیں سنی تھی — کسی بھی بڑے صاحب کی — اور نہ دیکھی تھی ایسی جھنجھلاہٹ۔ وہ بولی: ''سر، سینٹی مینٹل کہیے یا پاگل پن۔ میں کسی کو اس ٹیبل پر نہیں بیٹھنے دوں گی، ہرگز نہیں...''

بڑے صاحب گھر بیٹھے ماہر نفسیات جیسے رسالے کے مستقل خریدار ہیں۔ مس داس کی باتوں سے کسی نفسیاتی الجھن کا پتا چلتا ہے — ضرور؟ بولے، ''مس داس میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔ مان لو تمہارا ٹرانسفر ہو گیا کلکتہ۔ تو کیا کلکتہ لے جاؤ گی ڈھو کر؟''

''جی، ضرور ایسا ہی چاہوں گی۔''

Scanned with CamScanner

"اور فرض کرو..."

"نوکری نہ رہے؟ تب کمپنی سے درخواست کروں گی کہ یہ فیتل میرے ہاتھ بیچ دے۔"

"ٹیرے بل!— ٹھیک ہے، آپ جائیے۔ میں ہیڈکلرک کو بلاتا ہوں۔"

بڑے صاحب نے انورنجن سے پوچھا، "آپ ہی بتائیے، میں کیا کروں؟"

بڑے صاحب نے مس داس سے فون پر کہا، "آپ بیکار ہی چھوٹی سی بات کو لے کر ایک مسئلہ پیدا کر رہی ہیں۔ آج نئے عہدے کا کام ہی بکھیڑوں سے شروع کر رہی ہیں آپ۔"

انورنجن گپتا کو جسونت سنگھ نے پھر سلام لا کر دیا — مس ذربا داس کا۔

اس بار انورنجن نے ذربا داس کے حسین چہرے پر ابلا ناری کی بے بسی دیکھی۔ تھکی تھکی، کپڑے بے ترتیب، سرکی ہوئی ساڑھی — سامنے سے انورنجن کو یاد آیا۔ کلکتے میں سیر سے لوٹتے وقت ذربا اسی طرح تھکی تھکی سی تھی۔

"مسز گپتا۔"

"حکم۔"

"حکم نہیں... آپ وہ فیتل مجھے دے دیں۔"

جنرل سیکشن میں ایک بابو نے ہتھیلی پر انگلی گھما کر کہا، "لگا بے لکڑ بیچ!"

مہتہ نے سنتوش بنرجی دادا سے 'فونا فونی' کی، "ہاں دادا۔ آپ وہی بات بولے کر شیشم کا پیڑ کٹے گا..."

سبھی بابو خوش ہیں... کرائسس، پرابلم اپنی جگہ پر جہاں کا تہاں، اور گھڑی کی سوئی آگے بڑھتی گئی — ایک، دو، تین، چار، پانچ!

دوسرے دن سبھی نے حیرت سے سنا — مس داس اچانک بیمار ہو گئی ہے۔ ایک ہفتے کی چھٹی کے لیے درخواست بھیجی ہے اس نے!

پانچ ہی دنوں میں انورنجن نے اپنے دفتر کے ہر جاندار کو تھوڑا بہت پہچان لیا ہے۔ ایک سے ایک کام چور پڑے ہوئے ہیں یہاں۔ پرلے درجے کا چاپلوس گلشن مہتہ، جسے مکھن مہتہ کہتے ہیں۔

Scanned with CamScanner

جو بھی ہو، مس داس کام کرنا جانتی ہے۔ کام سے اسے لگاؤ بھی ہے۔ جس فائل میں ہاتھ لگاتی ہے، وہ آئینے کی طرح صاف! کہیں کوئی بھول چوک نہیں، الجھن نہیں! لیکن مخمل کے لیے اس کی ضد؟ کیا کہا جائے اس کو؟ آخر بات تو ہوگی کوئی؟

مہتہ نے کہا: "سر، میں جانتا ہوں وجہ۔"

انور تجن نے پوچھا: "کیا وجہ ہے؟"

مہتہ انور تجن کے پاس گیا۔ پھر مدھم آواز میں بولا: "مس داس کے سینے پر — ٹھیک کالر بون کے نیچے — ایک روپیہ بھر گول — ایگزیما کا چکتا ہے۔ مخمل کے اس کونے سے وہ وقت بے وقت کھجلاتی..."

"مہتہ صاحب! آپ اپنے اے بی ایم کے بارے میں ایسی اوٹ پٹانگ بات میرے سامنے نہ بولیں تو اچھا ہے۔"

جنت کی حور ذُربا کے جسم میں ایگزیما کا داغ؟ وحشت! اس نے مہتہ کو اچھی طرح پہچان لیا ہے۔ دنیا بھر کی بات کوئی اس سے پوچھے... سین نے کل کہا: "ایک دن بڑا صاب بولا — مہتا گدھا کا مافک بولتا ہے۔ بس مہتا جھٹ ڈھیچوں ڈھیچوں بولنے لگا۔ وو بابا مہتا، تمھاری جوڑی پورے بھارت میں نہیں۔"

ایسے موقعوں پر مہتہ سڑی مچھلی، بھوکا بنگالی اور پانتا بھات وغیرہ کہہ کر سین کو کاٹنے کی کوشش کرتا ہے۔

اس دن دفتر کے بعد مہتہ دوڑا گیا مس ذُربا کے ڈیرے پر۔ ذُربا باہر لان میں اداس بیٹھی تھی۔ مہتہ پاجی کتے کے ڈر سے پھاٹک کے اندر نہیں گیا۔ باہر سے ہی اس نے ذُربا کو پکار کر کہا، "آج ڈی ڈی ٹی پاؤڈر اور گمیکسن — دونوں ملا کر مخمل کو ڈس انفکٹ کیا گیا ہے۔"

ڈی ڈی ٹی...! یہ سن کر ذُربا کو ایسا لگا کہ وہ بیہوش ہو جائے گی۔ ساتویں دن معلوم ہوا، مس داس نے اور بھی چار دن کی چھٹی بڑھانے کے لیے درخواست بھیجی ہے...

انور تجن گپتا نے بڑے صاحب کے حکم کے مطابق — اسسٹنٹ برانچ منیجر کے ذمے

قاعدے کے مطابق دیے جانے والوں کاموں کی فہرست تیار کی۔ مس داس کی غیر حاضری میں اس نے کچھ کام بھی کر دیا ہے۔

اس دن پھر نیمل کا ذکر چھڑا۔

سکن نے پوچھا: "نیمل پلنگ ہے کیا؟... اسی واسطے ہا ہا!"

مس داس کی بڑھائی ہوئی چھٹی بھی کٹی ایک ایک کر کے تین دن!

اس دن دفتر سے لوٹ کر انورنجن نے کہا: "ماں، میں جلدی سے نہالوں۔ چلو آج تم کو آشرم دکھا لاؤں یہاں کا — رام کرشن آشرم۔ آج وہاں کسی سوامی کا پروچن (وعظ) ہے۔"

انورنجن باتھ روم سے نکلا۔ ماں نے اسے بتایا: "ایک عورت ملنے آئی ہے"

"عورت؟" انورنجن حیرت سے دیکھتا ہی رہ گیا — ارے یہ تو زرباداس ہے! ماں کہتی ہے، عورت۔ ماڈرن سلیولیس بلاؤز اور کانجی ورم ساڑھی کا یہ میچ — اخباروں میں روز چھپنے والے ایک اشتہاری ماڈل جیسی لگ رہی تھی وہ۔ کیا ہو گیا ہے آج زرباداس کو؟

"نمسکار! اب کیسی ہے آپ کی طبیعت؟ کیا ہوا تھا؟"

زربا چپ رہی۔ انورنجن کی ماں دو پیالی چائے دے گئی۔ انورنجن نے تعارف کرایا: "ماں، آپ ہیں ہماری اے بی ایم — مس زرباداس! اور... میری ماں!"

ماں رسوئی میں چلی گئی۔

"کیا آپ کی ماں ہی کھانا بناتی ہیں، اب بھی؟"

"جی، میری خوش قسمتی! ماں کے ہاتھ کا..."

"جی نہیں! اس معنی میں میں بھی خوش قسمت ہوں۔"

"آپ ہر معنی میں خوش قسمت ہیں۔"

انورنجن نے پہچانا۔ یہ کلکتہ والی زرباداس ہی ہے۔ لباس ذرا زیادہ جدید ہے صرف یہی فرق ہے۔

"تب؟ کیسا لگ رہا ہے پٹنہ؟"

"اچھی جگہ ہے۔"

"خاک اچھی ہے! کلکتہ... بمبئی سے بھی اچھی؟"

کلکتہ کہتے وقت کیوں، دکھائی دیا ہلکا سا خوف زربا کی آنکھوں میں؟ پھر کچھ لمحوں کی خاموشی۔

"تو کل آپ دفتر آرہی ہیں نا؟"

"کل؟" زربا خواب سے جاگی جیسے۔ بولی: "کل؟ میرا آنا آپ پر... تم پر منحصر ہے۔"

"مجھ پر؟"

"ہاں، تم پر۔ انورنجن بابو، تم پر۔ میں نے کہا نا، وہ نخیل کسی اور کے استعمال میں رہے یہ مجھ سے برداشت نہ ہوگا۔ اس کے بنا... جانتے ہو؟ اس عرصے تک میں نے ہر رات خواب میں اس نخیل کو دیکھا۔ دیکھا، وہ نخیل مجھے مل گیا ہے۔ پھر چھین لیا گیا ہے۔ ایک بڑی جنگ ہوگئی — مار کاٹ، دنگے... نخیل میں آگ لگادی گئی ہے۔ میرا نخیل جل رہا ہے، دھوں دھوں کرکے... کتنے ایسے ہی برے خواب۔"

"مس داس، آپ بھی حیرت میں ہیں..."

"وہ میں جانتی ہوں۔ میں لوگوں کی حیرت اور بے چینی دور کرنے کی پابند نہیں ہوں۔ تم سے کہوں — کوئی عورت مردوں کے پاس پاؤں پھیلا کر، ہاتھ پسار کر، دل کھول کر بیٹھ سکتی ہے بھلا؟ بولو۔"

انورنجن کا چہرہ نہ جانے کیوں بگڑ سا گیا۔

زربا لجاجت سے بولی: "گپتا، تم تو ایسے نہیں تھے! تم اتنے تشدد بن گئے کہ ڈی ڈی ٹی چھڑکتے وقت بھی تمھیں رحم نہیں آیا؟ تم زور زور سے دروازوں کو کھولتے، بند کرتے ہو؟ سین اس پر گھونسے مارتا ہے؟ تم نے کیل ٹھونک دی؟ کیوں؟ کیوں گپتا؟"

انورنجن نے دیکھا، بولتے وقت زربا کی نشیلی آنکھیں اور بھی نشیلی ہو جاتی ہیں۔ انگلیاں ایک لے سے حرکت کرتی ہیں۔

زربا اٹھی۔ کھڑکی پر گئی۔ ناک صاف کی۔ پھر کلکتے والی زربا لوٹ آئی، جوڑا کسے، دانت سے ناخن کترے یا ناک جھاڑ کر صاف کرے، یا چہرہ بگاڑ کر خوف کا اظہار — ہر حالت میں سندر ہی

Scanned with CamScanner

تتلی ہے۔ نئے نئے روپ میں دیکھو تمھیں ہے نا!

''تم...''

انورنجن نے کچھ جھجک دور کرنے کے لہجے میں کہا، ''معاف کیجیے مس داس۔ آپ مجھے تم کہتی ہیں، لیکن میں آپ کو تم نہیں کہہ سکتا۔''

''میں تم؟ میں تمھیں تم کہتی ہوں؟... نہیں نہیں، میں تم، اب آپ ہی کہوں گی۔ ٹھیک ہے؟ تم بھی تم کہو نا؟ کیوں نہیں کہہ سکتے؟ جی... سو تپتا، ٹیبل کے مسئلے پر سوچ بچار کیا ہے میں نے — سات دنوں تک۔ بڑے صاحب کا کہنا ہے، یہ ٹیبل تم کو نہیں دیا جا سکتا... دیکھو تپتا، بس ایک راستہ ہے۔ مجھے امید ہے، تم اب ضد نہیں کرو گے۔''

''ضد؟ میں نے کی ہے مس داس؟''

''کیوں انصاف دربار نہیں کر سکتے؟ اچھی بات! اب تم نے انکار کیا تو میں سمجھوں گی، تم چاہتے ہو میں نوکری چھوڑ دوں۔ اتنے بڑے کنبے کا سہارا ہوں جو میرے ہی سر ہے۔ معلوم ہے تم کو؟ نوکری چھوڑنے پر بھی — اس ٹیبل کے بنا جیتے جی مر جاؤں گی میں؟''

''مس داس، آپ مجھے بتا دیجیے، آپ نے کیا سوچا ہے؟''

''نہیں، پہلے وعدہ کرو، تم مانو گے!''

ٹھیک اسی طرح پچھلے سال زربا نے وعدہ لیا تھا، ''بولو، میری مدد کرو گے نا؟'' انورنجن نے پہلے ہی زبان دے دی۔ ''مانوں گا، کہیے۔''

''سچ؟ دیکھو، کام کا جو سلسلہ ہے، اس وجہ سے تم کو زیادہ تر میرے ہی چیمبر میں رہنا ہوگا۔ یاد ہے، تم ہی نے تو کہا تھا کہ یہ نئی سکیم اے بی ایم والی کیا ہے — سینئر ہیڈ کلرک یعنی اسسٹنٹ برانچ مینیجر۔ تو کیوں نہیں تم میرے چیمبر میں ہی بیٹھتے؟ بات یہ ہے کہ ٹیبل میرے چیمبر میں رہے گا، میری آنکھوں کے سامنے رہے گا، تو تم روز روز سے دروازوں کو کھول بند نہیں کرو گے۔ تھوڑے سے کھیل نہیں ٹھونکو گے، میری موجودگی میں کم سے کم...''

انورنجن نے پہلے ہی زبان دے دی تھی۔ لیکن زربا کو یقین نہیں آیا۔ اس نے بار بار پوچھا، ''بولو، تمھیں کوئی اعتراض ہے؟ سچ؟ کل پھر مکر تو نہیں جاؤ گے؟ کسی کے بہکاوے میں تو نہیں آ جاؤ

Scanned with CamScanner

گے؟ وہ گلشن مہتہ بڑا پاجی ہے۔ بولو...''

آخری جملہ کہتے وقت ذربا نے نورنجن کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ''بولو''

نورنجن کی ماں نے پوچھا: ''اب تو آشرم نہیں جا سکو گے بھیا، چیڑھی ڈال دوں چولہے میں؟''

ذربا ان تنت شکریہ ادا کرنے والے لہجے میں بولی: ''تو میں چلی اب۔ ہیں؟ کل دس بجے سے پہلے ہی آ جانا! بڑے صاحب ساڑھے نو بجے ہی آ جاتے ہیں... بعد میں سبھی آ جائیں گے تو پھر نیل کھینچ تان...''

''نمسکار۔''

نورنجن کو لگا، ذربا اسے چابک سے پیٹ کر چلی گئی۔ شٹ اپ! شٹ اپ!

دوسرے دن ذربا نو بج کر پچیس منٹ پر ہی دفتر آ گئی۔

بڑے صاحب کی گاڑی ساڑھے نو بجے پورٹیکو میں آ کر لگی۔ ذربا نے آگے بڑھ کر سلام کیا۔

''کہیے مس داس، اب کیسی ہیں؟''

''اب ٹھیک ہوں سر۔'' ذربا مسرور لہجے میں بولی۔

صاحب اندر سے حیران ہوئے، اوپر اوپر سے مسکراتے رہے۔

ذربا بڑے صاحب کے ساتھ ان کے چیمبر میں گئی۔ بڑے صاحب کا چپراسی جب تک چیمبر میں رہا، وہ چپ رہی۔ اس کے باہر جانے کے بعد ذربا نے صاحب کے موڈ کو پرکھنے کی کوشش کی۔ پھر درخواست کرنے لگی: ''سر، وہ نیل کا مسئلہ...''

بڑے صاحب ابل پڑے، ''سنو بھئی مس داس، میں اب اس مسئلے یا پرابلم کے بارے میں ایک لفظ نہیں سننا چاہتا۔ آپ لوگ نیل کرسی کے لیے بچوں کی طرح لڑیں گے تو مجھے مجبوراً جی ایم کو لکھنا پڑے گا... فی!''

''نہیں سر، اب کوئی پرابلم نہیں ہے۔ سب طے ہو گیا۔''

ذربا نے مسئلے کا حل تفصیل سے بتایا۔ اس نے یہ بھی کہا کہ کل شام کو نورنجن کے ڈیرے پر جا کر اسے منا آئی ہے۔

Scanned with CamScanner

بڑے صاحب نے اس فیصلے پر سوچا۔ ٹھیک ہے۔ دیکھا جائے کہاں تک اور یہ الورجن گپتا ہیڈ آفس سے لے کر بورڈ کے سبھی اراکین جس کی تعریف کے پل باندھتے چلے ہیں، کیا یہ وہ ذمہ داری سے کام کرنے والا شخص؟ بنا پڑھے لکھی بڑی ذمہ داری ... ٹھیک ہے، ڈسٹری بیوشن میں مہتہ کو موقع ملے گا... وسائل مہتہ۔ ہندی اینڈ سیپ فل مہتہ اور شریف نفس الورجن میں یہ فرق...؟" ٹھیک ہے۔ لیکن اگر گپتا کو کوئی اعتراض ہو؟"

"اسے کیا اعتراض ہوگا؟ سر وہ آ ہی رہا ہے۔"

دس بجے سے پہلے ہی زربادواس اپنا چہیتا تھیلا لے آئی اپنے چیمبر میں۔ تھیلا لاتے وقت وہ بڑی احتیاط سے ساتھ تھی — کہیں ٹھیس نہ لگ جائے۔ خزانوں تک پہنچنے والی ہے کانچ کا تو نہیں تھیلا۔ ذرا سی ٹھیس لگی، چیخ اٹھی زربادواس۔

چیمبر کے ایک حصے میں تھیلا کو نہایت باعزت طریقے سے رکھا گیا۔ بستو تھوڑی دور سے جھاڑن مار کر دھول صاف کرنے لگا۔ چلا اٹھی زربادواس۔ "ارے ... جنگلی اس طرح زور زور سے کیوں مارتا ہے؟ لاؤ ڈسٹر۔"

زربا نے اپنے ہاتھوں سے تھیلا کی دھول کو جھاڑتے ہوئے کہا ... "ہائے رے ... برسوں میں تمہارا یہ بڑا حساب اب جا کر جان میں جان آئی ہے۔ میں نے سمجھا تھا اب نہیں پاؤں گی تم کو۔ اس روشنائی گری کیسے؟" تھیلا جھاڑ پونچھ کر اس نے گھڑی دیکھی۔ دس بج رہے ہیں۔ گپتا آتا ہی ہوگا۔ اس نے دروازے کی طرف دیکھا۔ ہینڈلوم کے پردے پر بھرت ناٹیم کی مدرا میں کھڑی عورتوں کی قطار۔ اس نے دونوں بانہوں کو دونوں طرف پسار ہمیشہ کی طرح تھیلا کے ناپ کلاس پہ اپنا ایک گال رکھا... او ... دو تین بعد لمس کا سکھ۔ ی ی ی... پھر دوسرا گال ی ی ی... روم روم میں لذت کا احساس۔

ٹرنگ'

"ہجور۔"

بستو تھوڑا اندر آیا۔ زربا نے جھٹ پٹ خود کو سنبھالا۔ "یہ تو نہیں بتایا ... کال بیل آپ ہی بج اٹھی کیسے؟"

بڑے صاحب نے دیکھا — پردے کے اس پار دو پاؤں۔ انورنجن گپتا آ رہا ہے۔ صاحب نے ایک موٹی فائل کھول لی۔ انورنجن آ کر کھڑا رہا۔ بڑے صاحب کی نظر فائل پر جمی رہی۔ ''سر، کیا میں بیٹھ سکتا ہوں — تھوڑی دیر؟''

''اوں؟ ہوں۔ بیٹھو۔ کیا ہے؟''

درخواست۔ ایک نہیں، دو؟

''کیا ہے؟''

ایک میں ڈیڑھ مہینے کی چھٹی کی گزارش... ماں پریاگ جائیں گی تیرتھ یاترا پر۔ اکلوتا بیٹا ہے وہ، اس لیے ساتھ جانا ضروری... دوسری درخواست کہ... پٹنہ کی آب و ہوا صحت کے لیے ٹھیک نہیں ہے... اسے یا تو ہیڈ آفس کلکتہ بھیج دیا جائے یا پھر بمبئی۔ نہیں تو... نہیں تو، اس درخواست کو استعفیٰ سمجھا جائے۔

''دیکھو گپتا، اتنے جذباتی نہ ہو...''

''نہیں سر، میں نے بہت سوچ سمجھ کر دیکھ لیا ہے۔ میری ماں بھی نہیں چاہتی۔''

بڑے صاحب نے درخواست کی زبان اور انورنجن کے چہرے کی کیفیت دیکھ کر سمجھ لیا، یہ سچ کہتا ہے۔ اس نے بہت سوچ سمجھ کر فیصلہ کیا ہے۔ لوگ جھوٹ نہیں کہتے تھے۔ انورنجن گپتا...

انورنجن نے آج کی چھٹی مانگی — زبانی۔ مل گئی۔

ہر سیکشن میں یہ خبر پھیلی — پھیلتی گئی۔

ایک ساتھ بیس ٹائپ رائٹروں کھٹ کھٹ بند ہو گئی۔ سبھی بابوؤں نے ایک ہی ساتھ پانی مانگا۔

''پانی!''

''آں؟''

''وہی ہوا جو مس داس چاہتی تھی۔''

''تریا چرتر...''

''غضب... عجب... عورت!''

''گپتا صاحب چلے گئے؟''

ذُرہا کو بھی خبر ملی۔

کچھ دیر تک سناٹے میں رہ گئی۔ اس کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ استعفیٰ؟ چھٹی؟ وہ آیا نہیں یہاں؟ لیکن اس نے تو وعدہ کیا تھا؟

اس کے چہرے پر فوراً لالی لوٹ آئی۔ وہ اپنی کرسی چھوڑ کر اٹھی۔ اپ چیپے نبیل کے پاس گئی۔ کرسی پر بیٹھی۔ ہونٹوں پر جو مسکراہٹ تھی، وہ کھلتی چلی گئی... استعفیٰ دے یا چولھے میں جائے بیوقوف انورنجن گپتا۔... میرا دھرم بچ گیا... میری عزت بچ گئی... تم میرے ہی رہے... میرے ہی۔ کانٹا نکل گیا! آہ!

نبیل کے ٹاپ گلاس پر اپنے گالوں کو باری باری رکھتی، لمس کے سکھ سے رزتی، اس کے پورے بدن میں لذت کی سنسنی' اس کی مسکراہٹ کھلکھلاہٹ میں بدل گئی۔

مہتہ اس موقعے پر کئی غیر معروف انگریزی لفظ ڈھونڈ کر لے آیا تھا، مبارکباد دینے کے لیے۔ وہ چیمبر میں گھسا۔ آہ! اس نے دیکھا، مس ذُرہا داس' اے بی ایم' نبیل پر، نہیں پیارے، شیشے پر گال رکھ کر کھلکھلا رہی ہے یا رو رہی ہے!' آنکھوں میں آنسو ہیں اور ہونٹوں پر یہ کیسی ہنسی؟ یہ کیسا سکھ پا رہی ہے مس ذُرہا داس؟ یہ کیسا سکھ دکھ؟ یہ کیا ہے...؟

مہتہ کو لگا، وہ کسی عریاں منظر کے سامنے کھڑا ہے۔ گنگ! نہیں، یہ منظر دیکھنے کے حق نہیں ہے۔

⊛⊛

پھنیشور ناتھ رینو

ہندی سے ترجمہ: شہاب الدین گیلانی

لکیریں، دائرے

اسپتال کے سرجیکل وارڈ سے میں سدا دور ہی دور رہا کرتا تھا۔ کبھی کسی زخمی جاننے والے یا بیمار دوست کو دیکھنے کے لیے گیا تو وارڈ کے برآمدے پر ہی پسینے میں لت پت اور سر میں چکر۔ چاروں طرف مٹی کے برتنوں کی طرح ٹوٹے پھوٹے لوگ۔ سفید پٹیوں اور پلاسٹر سے بندھے ان کے انگ انگ۔ چیرے ہوئے پیٹ سے لگی ہوئی ربر کی نلکی۔ پلنگ کے پاس اسٹینڈ سے لٹکتی ہوئی خون یا پلازما یا سیلائن کی بوتل۔ ہوا میں ایتھر کی بو اور چیخ، کراہ، پکار... اس بار بیمار ہو کر جب سے سرجیکل وارڈ میں بھرتی ہوا ہوں، سب کچھ نارمل لگتا ہے۔ گھبراہٹ نہیں۔ سر میں چکر نہیں۔ کہیں کوئی بدبو نہیں۔ جب سے ہوش میں آیا ہوں، اپنی حالت پر خود ہنس کر ساری تکلیفیں سہہ لیتا ہوں۔ آج اپنی اس بے بسی پر مجھے مہابھارت کے بھیشم پتامہ کی یاد آئی۔ مہابھارت کی وہ تصویر آنکھوں کے سامنے آ گئی۔ خون کی بوتل، بیڈ ریسٹ، رائکس ٹیوب، سیلائن کی بوتل سے لگی ربر کی نلکی میرے پاؤں کی نس میں بندھی ہوئی... اُما سے میں نے کہا: "میں بستر پر سوئے ہوئے بھیشم پتامہ کی طرح نہیں لگ رہا ہوں؟"

اُما کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ دوڑ گئی۔ وہ بولی: "کل نائی بلا دوں گی... داڑھی کتنی بڑھ گئی ہے!"

میں نے پہلے نائی کو بلانے کی مخالفت کی، پھر کچھ سوچ کر کہا: "آج ہی کیوں نہیں بلا لیتیں؟"

سوچا، آج اگر حجامت نہیں بنی اور آج ہی کچھ ہو گیا — کچھ ہو گیا؟ صاف صاف کیوں نہیں

کہ اگر مر گیا تو آخری تصویر کتنی بری آئے گی: بڑھی ہوئی داڑھی، کھلا ہوا منہ، چہرے پر دہشت ... نہیں نہیں، آخری تصویر میں میرے چہرے پر مسکراہٹ رہے۔ مرتے مرتے کوشش کروں گا... اسمائل پلیز!

جلدھر جی کی یاد آتی ہے۔ جلدھر جی کی ارتھی کے جلوس کی تصویریں مادھوری، فلم فیئر، چترلیکھا جیسے بڑے رسالوں میں چھپی تھیں... چہرے پر کیسا سکون تھا، ہونٹوں پر ہلکی ہلکی مسکراہٹ، ماتھے پر چندن، پھول مالاؤں سے ڈھکا مشہور سنیما گیت کار جلدھر جیسے آنکھیں موند کر کسی محبت کا مکھڑا سوچ رہا ہو۔ لیکن پشپ لال، جدید ترین نئی شاعری، کہانی کار، پشپ لال کے ایک ارجن سے بھی زیادہ میرے والے دوست تھے۔ جب وہ زندہ تھا تو اس کے دوستوں نے ان کی تصویریں بھی اتاری تھیں۔ لیکن اس کی آخری تصویر کسی کے پاس نہیں۔ کسی نے اتاری نہیں یا اس نے موقع ہی نہیں دیا۔ پشپ لال کے پیٹ میں جب ایک آدھ پیگ مال پہنچ جاتا، یعنی جب وہ موڈ میں آتا تو ہر بات سے پہلے بیچ کی ایک بھدی گالی اگلتا "ہجے دو..." سنا ہے مرنے کے پہلے اس نے موت سے یہی گالی نکالی تھی۔ اس کے ایک دوست کا کہنا ہے کہ اس نے آخری گالی دی تھی۔ وہ وقت بھی گالی دے رہا ہے، میں اس کے مرتے ہوئے چہرے کا تصور کرتا ہوں۔ دونوں ہونٹوں کو گول کرکے گول بناتے ہوئے وہ گالی دے رہا تھا — ہجے دو... اس مٹے والے وارڈ میں پچھلے سال پشپ لال نے دم توڑا تھا۔ میں جانتا ہوں، میری بیماری کی خبر سن کر لوگوں نے جلدھر اور پشپ لال کو یاد کیا ہوگا۔ اب سے یہ کہا ہوگا۔ اندازے سے ہی میں صحیح صحیح بتا سکتا ہوں۔

اما اس طرح فکرمند ہو کر کیوں آ رہی ہے ادھر سے؟ کہتی ہے، "بلڈ بینک میں او آر پی کا بلڈ نہیں ہے۔ کل دن تک او پی سے خون کا عطیہ دینے والا نہیں آیا تو کیا ہوگا؟" اما فکرمندی میں پھر ادھر چلی گئی۔

نہ جانے کیسے کیسے اور کس کس پیشے کے لوگوں کے خون! ایک دن ناغہ کرکے تین سو سی سی خون بوند بوند ڈیڑھ گھنٹے تک میرے جسم کے اندر پہنچایا جاتا ہے اور ڈیڑھ گھنٹے تک بے حس و حرکت لیٹے لیٹے میں اسٹینڈ سے لٹکتی بوتل کی طرف دیکھتا رہتا ہوں۔ ربر کی نلی کے بیچ سے گزرتے کانچ کے بلب میں ٹپکتے ہوئے گاڑھے خون کی بوندوں کو گنتا ہوں۔ پھر بوندوں کے ٹپکنے کی تال پر ذہن

میں ابھرنے والی باتیں خود بخود نظموں میں ڈھلتی جاتی ہیں۔

دوڑایا جا رہا ہے روز، میری رگوں میں تین سو سی سی رکت
کسی حملہ آور بوچڑ برہمچری کرپالو ایشور کا...

اور اب کوئی میرے اندر ہی مجھے گالی دیتا ہوا کہتا ہے: سالے اب تو شاعری کرنے لگا!

اس بار اسپتال میں ہوش آنے کے بعد ہی سے ایسا ہوتا ہے۔ جی ہی جی میں کسی مصرعے کی آمد، تک بندی اور فحش محاورے گھڑنے کا کھلواڑ! کیا یہ بھی میرے مرض کا شاخسانہ ہے؟ کئی بڑی بیماریوں کے بعد ایسی ہی علامات ظاہر ہوتی ہیں... دانت سے ناخن کریدنا، بار بار ناک پونچھنا، ہاتھ کی انگلیوں کو نچانا، زبان سے ہونٹ چاٹنا...

اُما بلڈ کا پربندھ کر آئی ہے۔ اس کے ساتھ مسکراتی آئی ہے ایک موٹی ادھیڑ عورت۔ اُما کہتی ہے، "ان کا بھی او گروپ ہے۔ کئی سالوں سے برابر بلڈ بینک میں بلڈ ڈونیٹ کر رہی ہیں۔"

عورت اپنے بیگ سے ایک لال کارڈ نکال کر اُما کی طرف بڑھاتی، بولتی ہے: "ایمرجنسی میں ہمیشہ میرا ہی بلڈ لگتا ہے۔"

اُما اس سے باتیں کرنے لگی۔ وہ کل صبح آٹھ بجے آ کر بلڈ بینک میں بلڈ دان دے جائے گی، اور بارہ بجے سے میری نسوں میں اس اسکول ٹیچر کا خون ٹپکنے لگے گا۔ وہ مسکراتے ہوئے چلی گئی تو میرا منھ کھلا۔ "عورت کا بلڈ؟ وہ بھی اس عورت کا... ہرگز نہیں! کبھی نہیں! میں لوں گا ہی نہیں۔"

اُما چپ رہی تو میں مسلسل دہرانے لگا، "میں لوں گا ہی نہیں۔ نہیں لینا ہے... نہیں لینا ہے... نہیں لینا ہے..."

"کیا لڑکپن کر رہے ہو؟" اُما ہنستے ہوئے مجھے ڈپٹتی ہے۔

"میں ہرگز نہیں لوں گا!"

"مت لینا! ابھی چپ تو رہو!"

"میں چپ بھی نہیں رہوں گا! میں ابھی دودھ بھی نہیں پیوں گا، دوا بھی نہیں..."

اُما فیڈنگ کپ میں دودھ ڈال کر چمچ سے دودھ پلاتی رہتی ہے اور میں کسے ہوئے ریکارڈ کی طرح

بڑبڑاتا رہتا ہوں: "دوا بھی نہیں! دودھ بھی نہیں! دوا بھی نہیں، دودھ بھی نہیں...!"

اگر نائٹ نرس مس سینا نہ آ جاتی تو لگاتار دس پندرہ منٹ تک آنکھ موندے اسی طرح بولتا رہتا ورنہ ہاتھ سے فیڈنگ کپ میں چمچ چلاتی مجھے ڈانٹتی پچکارتی رہتی۔ اس لڑکی کو میں دن میں رات کی رانی کی کھلی ہوئی کلی کہتا ہوں۔ رات بھر اسی طرح تروتازہ، یہ مدھم مدھم مسکراتی اور خوشبو بکھیرتی رہے گی۔

"یہ کون سا گانا چل رہا تھا؟" سینا اپنی کیرالائی ہندی میں پوچھتی ہے۔

میرے منہ میں فیڈنگ کپ کی ٹونٹی ڈالتی اُما مسکرا کر جواب دیتی ہے: "دودھ بھی نہیں، دوا بھی نہیں!"

"واہ! کتنا اچھا گانا ہے انکل نے فیڈنگ کپ نہیں، فیڈنگ بوتل سے آپ..." سینا تھرما میٹر جھاڑتی آگے بڑھ آتی ہے۔ مجھے سعادت مند بچے کی طرح دودھ پیتے دیکھ کر کہتی ہے: "دودھ پی کر خوب گانا گا!" اُما اور سینا ایک ساتھ ہنس پڑتی ہیں۔ سینا بخار چیک کر کے چلی گئی تو اُما اس کی نقل کرتے ہوئے بولی: "دودھ پی کے خوب گانا گا!"

لیکن میں ہنس نہیں سکتا ہوں۔ گانا، گیت، سانگ، ٹیپ ریکارڈنگ، پلے بیک وغیرہ الفاظ سنتے ہی مجھے ہچکی آنے لگتی ہے۔ ہچکی یعنی ہکپ، تین سات دن تک... اس رات دوا بدل بدل کر ڈاکٹروں نے مشکل سے دور کیا ہے۔ ہچکی کے بعد متلی، یعنی نوزیا۔ پھر انتڑیوں میں سوئے درد دھیمے دھیمے کانٹا بن کر چبھنے لگتا ہے۔ تب شروع ہوتا ہے اندر کا سب باہر — سب دوا، کھانا، گولیاں، ڈراپس ایک ساتھ باہر! اس کے بعد ہی کوما، بیہوشی!

ہچکی شروع ہوئی اور اُما ڈیوٹی روم کی طرف بھاگی۔ اُما کے ساتھ کھٹ کھٹ کرتی تیزی سے سینا آتی ہے۔ میری نبض پر انگلی رکھتی ہے اور پھر تیزی سے ڈیوٹی روم میں چلی جاتی ہے۔ بڑے ڈاکٹر کو کال دینے...

شے بودو... گنگا کے اس پار سے کوئی مجھے پکار رہی ہے۔ میں جواب دینا چاہتا ہوں، آواز نہیں نکلتی۔ آنکھیں کھلتی ہیں۔ میری ناک میں لگی آئس ٹیوب میں موٹی سرنج لگا کر سینا میری انتڑیوں میں جمے ہوئے زہریلے سیال مادے کو کھینچ کھینچ کر باہر نکال رہی ہے۔ پاس کھڑے بڑے سرجن اب چپ چاپ میری طرف دیکھ رہے ہیں۔

پیٹ کی سوجن آہستہ آہستہ کم ہو رہی ہے۔ شاید ہچکی روکنے والی کوئی سوئی لگائی گئی ہے۔ اس سوئی کے بعد ایک اِسکاچ کا نشہ سا ہو جاتا ہے۔ تو آج میں کوما میں نہیں گیا؟ کوما! ان ہماری مزاحیہ شاعر کا نام بھول رہا ہوں جن کی ایک نظم کا ٹکڑا ہے: زندگی ایک سسپنس ہے... کوما فل اسٹاپ...

لیکن کوما کو میں سمادھی کہتا ہوں۔ بیہوشی کو سنیاس روگ بھی کہا جاتا ہے نا؟ جب بیہوشی میں دیکھے ہوئے سپنے مجھے پوری طرح یاد ہیں۔

دیکھا، سبھی لوگ پیٹ پکڑ کر جھکے ہوئے ہیں، جھک گئے ہیں۔ اچانک، جو جہاں ہے، اپنے ہاتھ کمر پر رکھ کر جھکا ہوا ہے۔ کھیت کھلیان میں کام کرتے لوگ، نہر کے کنارے کھڑے لوگ، اپنے کھیت میں ساگ کھونٹتی ہوئی عورتیں — سبھی درد سے تڑپ رہے ہیں۔ ہوا میں ایک عجیب طرح کی کھٹاس ہے۔ سب کچھ کھٹا کھٹا۔ ہوا کا ایک جھونکا آتا ہے اور سبھی ایک ساتھ چیخ کر اور بھی جھک جاتے ہیں۔ سب لوگوں کے جسم مڑ کر، خراب صحت کی نشانیوں جیسے... میں نے سنا، کوئی ریڈیو پر کسی اسٹیشن سے اعلان کر رہا ہے: بھائیو! بھائیو! یہ کوئی ایٹمی گڑبڑی ہوئی ہے۔ زمین پر پیٹ کے بل لیٹ جائیے۔ ویکیوم آ رہا ہے۔ ویکیوم! اویاک! اویاک! ہزاروں لوگ ایک ساتھ الٹیاں کر رہے ہیں۔ سبھی کے منہ سے ایک ہی لفظ: ویکیوم! ویکیوم! — لیکن اما صحت مند ہے۔ دوڑی آ رہی ہے۔ ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ غلطی سے ایسا ہو گیا ہے۔ کس نے کی ایسی غلطی؟ یہ جان لیوا غلطی کس کی ہے؟ امریکی سائنسدانوں کی، یا روسی، یا چینی، یا پاکستانی، یا بھارتی؟ عدالتی تحقیقات ہو، غلطی کرنے والے کو سزا دو! نہیں تو گدی چھوڑ دو!

سمادھی ٹوٹنے پر اپنے چاروں طرف کھڑے ڈاکٹروں کو دیکھ کر میں پوچھنا چاہتا تھا، "آخر کس کی غلطی تھی؟" لیکن کچھ پوچھ نہیں سکا۔ آکسیجن سلنڈر لگی ہوئی نلی سے مجھے باندھ دیا گیا تھا۔

دوسرا منظر: اشوک راج پتھ روڈ پر ایک بڑا سا جلوس آ رہا ہے۔ کوئی نعرہ نہیں۔ شور غل نہیں۔ جلوس قریب آتا گیا۔ سڑک کے دونوں کنارے بے شمار لوگ قطار میں کھڑے اس جلوس کا انتظار کر رہے ہیں۔ لیکن یہ جلوس آدمیوں کا نہیں، سفید بطخوں کا ہے۔ مڑی ہوئی گردنیں، دودھ کی طرح سفید پنکھ، گلابی چونچیں... ہزاروں ہزار بطخیں پیک پیک پیک پیک کرتی ہوئی اسپتال کی سمت مڑ گئیں۔ پھر گنگا کنارے سبھی بطخیں قطار باندھ کر پانی میں اتر گئیں۔ گنگا کے اس پار سے اس پار تک

Scanned with CamScanner

جگنوؤں کا ایک پل بن گیا۔ نیچے پانی پر سفید پل، زندہ پل۔ پک پک پک پک پک۔ ماں مجھے ہاتھ پکڑ کر اٹھاتی ہے۔ شیبو! تاڑ! تاڑی! اُس پار چلو! پک پک پک۔ میں جگنوؤں کو ، کا ہاتھ پکڑتا ہوں۔ [illegible] اپنے پنکھ پھیلا کر میرے ہاتھ سے نکل جاتے ہیں۔ پک پک پک۔ میں پکارتا ہوں پر ماں جواب نہیں دیتی۔ میں ماں کا نام لے کر پکارتا ہوں مگر میرے گلے سے بھی جگنوؤں کی بولی نکلتی ہے۔ پک پک پک۔

ہوش آنے پر دیکھا، میرے سرہانے سے کہنی ٹکا کر اسٹول پر جھکی بیٹھی ماں سو گئی ہے۔ میں نے ماں کو پکارا۔ لیکن میرے منھ سے نکلا: "ماں ماں"

ماں سوتی تو نہیں۔ اسی طرح جھکی، میرے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے کہتی "شیبو رے! اپنا گاؤں چھوڑ کر تو یہاں کیوں آ گیا بیٹے؟ کتنا اچھا تھا تو، کیا سے کیا ہو گیا۔ یہاں آ! لوٹ چل بیٹا! ہم نمک روٹی کھا کر رہیں گے۔ پیڑ کے تلے سوئیں گے مگر..."

لگتا ہے، آدھی رات گزر گئی۔ بیڈ نمبروں کے پاس اتنی بھیڑ کیوں ہے؟ وارڈ کی میرے پلنگ کے پاس سے [illegible] گھسیٹتا بیڈ نمبر دس کے پاس جا رہا ہے۔ فرش پر بھاری لوہے کے گھسیٹنے کی آواز سے سارا وارڈ وحشت زدہ ہے۔ بیڈ نمبر پانچ پر پتھر سے بازی [illegible] گھر کل بہار شریف کا ٹیکسی ڈرائیور اچانک چلانا شروع کر دیتا ہے "کہاں رے، چھوٹکا! یہاں ہے چوٹی والے! [illegible] آ! اب نکال چھرا!"

بیڈ نمبر دس کے پاس اچانک گردے کا مریض [illegible] سال کا بوڑھا چل بسا۔ بیٹی، بہو، بیٹوں پوتوں کی بھیڑ نے رونا شروع کیا۔ اور میں ان کا رونا سن کر سمجھ جاتا ہوں، وہ شمالی بہار کے کسی گاؤں کے ہیں۔

پشپ لال اکثر کہتا [illegible] پتا نہیں ایسی بات کہتا تھا یا کہیں پڑھی ہوئی — شاعری کا صرف ایک ہی بڑا اور عظیم موضوع ہے: موت!

پشپ لال کی شاعری یا کہانی کبھی میری سمجھ میں نہیں آئی۔ پشپ لال سے میری پہلی ملاقات کلکتہ کے ایک لکھنوی (خاص) بنگالی بار میں ہوئی تھی جہاں [illegible] آرڈر دینے پر تیل میں تلی چھری (پکوڑے) اور [illegible] کالی مرچ [illegible] مل جاتی ہے۔ قریب ایک درجن بنگالی چہروں کے

بیچ بچری بکھرتا اور غٹا غٹ ٹھرا پیتا پشپ لال اپنی انگریزی نظم زور زور سے سنا رہا تھا۔ نظم میری سمجھ میں نہیں آئی۔ میرے پلّے دو تین لفظ ہی پڑے: ''اولومبا، لومبا، لومبا'' ''ور'' ''کرس اور شوٹنگ۔''

آج دوپہر میں ہمارے ایک جاننے والے نے اُما کو آرٹس اینڈ آرٹسٹس انگریزی سہ ماہی کا تازہ شمارہ بھیج دیا ہے۔ ہمارے ایک بہی خواہ کا اس میں ایک مضمون چھپا ہے، جس میں ہمارا بھی تذکرہ کیا گیا ہے۔ میں نے اُما کو کئی بار پڑھنے کو کہا، لیکن وہ ٹال گئی۔ بولی: ''کیا ہوگا سن کر؟ کیا فائدہ؟ کوئی غلط تھوڑی ہی لکھا ہے تم لوگوں کے کرتوت... صحیح، صحیح...!''

اُما کی یہی عادت مجھے اچھی نہیں لگتی۔ کچھ دیر کے لیے باہر گئی تو میں نے اپنے پڑوسی کے نوجوان اٹینڈنٹ کو بلا کر مضمون پڑھنے کو کہا۔ کچھ تو اس نوجوان کے گنوارو لہجے اور تلفظ کی وجہ سے، کچھ اپنی کم سمجھی کی وجہ سے، میں مضمون کا پورا لطف نہیں لے سکا۔ ہاں، مرکزی خیال کو سمجھنے میں کوئی دقت نہیں ہوئی۔ لکھنے کا انداز یقیناً قابل تعریف تھا — تین سال پہلے بمبئی میں فلم کے مشہور گیت کار جلدھر کے گھر پر سال بھر تک روزانہ شام چار نامی گرامی فنکار اکٹھا ہوتے۔ وہ سبھی ایک تجرباتی فلم بنانے کے سلسلے میں، اسکرین پلے، مکالمے اور گیتوں کے بول پر بحث کرنے کے لیے وہاں جمع ہوتے۔ لیکن بات کھلنے کے پہلے بوتل کھل جاتی اور بات جہاں کی تہاں رہ جاتی۔ بات کبھی شروع ہوتی بھی تو وہ آپس میں جھگڑ بیٹھتے۔ وہ یعنی جلدھر، لوک گیتوں کے گلوکار وشوناتھ، بنگال کا مجسمہ ساز اور سنگتراش رام رنجن اور بہار کو اپنی جنم بھومی ماننے والا ہندی میتھلی شاعر پشپ لال، اس تحریر کے مصنف کے علاوہ۔ 'آرٹ فلم' اور 'نیو سنیما موومنٹ' کے سبھی چاہنے والوں کو ان چار درویشوں سے بڑی امیدیں تھیں۔ لیکن اب یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ رہی ہے کہ یہ صرف خودکشی کے شوقینوں کا ایک گروہ تھا اور وہ مرنے کے لیے ہی باہم مل بیٹھتے تھے۔ پچھلے سال جلدھر کی موت جگر کے زخم سے ہوئی اور تین مہینے بعد ہی پشپ لال پیٹ کے کینسر سے مرا۔ اس بار پیٹ کے درد کی وجہ سے بیہوشی کی حالت میں وشوناتھ پٹنہ کے اسپتال میں پڑا ہوا ہے۔ اور ابھی ابھی خبر ملی ہے کہ رام رنجن کو کلکتہ کی ایک طوائف کے کوٹھے کی سیڑھیوں پر نشے میں دھت اور زخمی پایا گیا۔ دونوں کی حالت گمبھیر بتائی جاتی ہے۔

اس کے بعد مضمون کا بنیادی خیال اس سوال سے شروع ہوتا ہے: ایسا کیوں؟ پھر، فاضل مضمون نگار نے نفسیاتی اور فلسفیانہ تجزیہ کرتے ہوئے خود ہی اس کا جواب دیا ہے۔ ممکن ہو، تو کبھی خود ہی پڑھ کر

Scanned with CamScanner

سمجھوں گا۔ ابھی میرے ذہن میں اس مضمون کے کئی الفاظ اور فقرے ہی رہ رہ کر ابھر رہے ہیں۔ پرسنالٹی آرنا، ورلڈ پیس مپلکس... ڈش ڈش... سیف ڈسٹرکٹ... شوپر [illegible] سو سائٹ [illegible]... ریمیں زدی پروڈکٹ آف پچر اینڈ انور [illegible]...

میں اب یہ سوچتا ہی ہوں مجھے ان نکتوں سے کیا لینا دینا! [illegible] ایک بنگلہ [illegible] مجھے سمجھ نہ آتی۔ [illegible] چودھری کو جہاز کی سیر لینے کی کیا ضرورت [illegible] دو نکتے جتا سمجھاتی۔ [illegible] باتوں کے ذکر میں لگ جاتا۔ پشپ لال کہتا: "شیبو! [illegible] ہو ہائے [illegible] کا۔ چھوڑ [illegible] شروع کیجیے..."

میں نے [illegible] شروع کیا، مگر [illegible] رکھی۔ رام رتن داس نے اپنے ہاتھ سے ایک دن [illegible] بنا دیا اور اسی دن میری پشپ لال اور رام رتن داس [illegible] اور [illegible] بعد [illegible] پیٹ تنگ ہو گئی۔ پشپ لال جب بھی اپنی خدمات پیش کرنے سے [illegible] کرتا، رام رتن [illegible] ہی کرتے۔ ہم میں سب سے بڑے رام رتن داس اور سب سے [illegible] پشپ لال [illegible] کی لڑائی بیچ میں ہی ہوتی۔

[illegible] تو نصف [illegible] سے تم ادور ہو نے لیں گے؟ [illegible] میں [illegible] اس چھپ میں [illegible]؟ [illegible] یادداشت؟

سیاست [illegible] جلسوں میں نیتاؤں کی تقریر سے پہلے مجھے [illegible] کے لیے گیت [illegible] مجھے نے ہی میری ضرورت ہوتی اور ساتھ میں [illegible] والی [illegible] سے [illegible] [illegible] آتا۔ بھیا [illegible] تو ہار [illegible] ذمہ دار..."

اگر میرے گلے میں ایک خاص قسم کی [illegible] نہ ہوتی اور اگر لوک گیت جدید ذہن والے شہری لوگوں کے لیے فیشن نہ بن جاتا، تو آج میری جگہ کہاں ہوتی؟ [illegible] شاید سیاست نہ چھوڑتی اور پارٹی [illegible] بدلتے رہتا، آج کس پارٹی میں ہوتا؟ اگر پٹنہ میں [illegible] تو میں [illegible] رہتا...

[illegible] جب میں نے "سارنگ سدا برج" نامی گیت کہانی نشر کی تھی تو

اسٹوڈیو سے باہر آتے ہی سب سے پہلے پروگرام ایگزیکٹو مس نغمی گئی نے (جن کی مادری زبان ہندی نہیں تھی) مجھے مبارکباد دی تھی۔ انھوں نے کہا تھا، ''میں نے گیت کا ایک لفظ نہیں سمجھا، لیکن گیت میری روح کے اندر اتر گیا۔'' اس کے بعد سے ہر ہفتے ایک دن صبح شام میرے گیت نشر ہونے لگے۔ کچھ ہی دنوں میں لوگوں کی زبان پر میرے گیت تھے، میرا نام کلچرل پروگراموں کے پرچوں میں موٹے حروف میں چھپنے لگا۔ اُدھر فلمی دنیا میں پنجابی بھنگڑے کی بہریں دھوم مچا کر لوٹ گئی تھیں۔ نئے دور میں لوک گیت کی باری آئی اور اس کے ساتھ ہی میری زندگی میں ایک نیا طوفان چلنے لگا... بمبئی، مدراس، کلکتہ... شراب، عورت ور جوا... عیاشی ہی عیاشی... کام سے جی چرانے کے ساتھ ساتھ دھوکادھڑی، جعلسازی... مٹی میں گڑے ہوئے دیہاتی زبان کے لفظوں کو اکھاڑ کر بے ڈھنگے پن سے درجنوں کہانیاں گھڑ کر، قدیم اور روایتی لوک کتھا کے نام پر میں نے چالاکی سے چلا دیں۔ ایک فلم کے لیے تو ڈاکوؤں کا اجتماعی ترتیہ گیت تک لکھ کر میں نے ایک پروڈیوسر ڈائرکٹر کی آنکھوں میں دھول جھونک دی۔ ''جناب، نیپال کی مورنگ ترائی میں بسنے والی کوچ اور تھارو قوموں کے بھگتوں، دھامیوں کے چرنوں کی سیوا کر کے اسے حاصل کیا ہے۔'' وہ اجتماعی ترتیہ گیت بعد میں سنسر والوں نے کٹوا دیا.. ہال میں بچے ہی نہیں، بوڑھے اور جوان بھی بیہوش ہو گئے تھے۔

اُمانہ ہوتی تو میں جلدھر اور پشپ لال سے پہلے ہی تباہ ہو جاتا۔ لیکن پچھلے سال اُما نے ایک دن ہار کر کہہ دیا، ''تمھاری جو مرضی ہو کرو! میں اب کچھ نہیں بولوں گی! میرے بس سے باہر کی بات ہے۔''

تب مجھے اچانک غائب ہونے کا بہانہ مل گیا اور قریب دس مہینے تک کٹھمنڈو، کام روپ، کالمپا اور سنگھ بھوم کے جنگلوں پہاڑوں میں ایک نئی تہذیب، زندگی کے ایک نئے فلسفے کا مسیحا بن کر ملکی اور غیر ملکی لڑکے لڑکیوں کے ساتھ عیش کرتا رہا۔

سالے اپنا اسپتال ہے، چرچ نہیں!

نہیں نہیں، میں کوئی اعتراف نہیں کر رہا۔ میرا مطلب ہے، میں نے کوئی قصور کیا ہی نہیں۔ اس دنیا، یعنی اس بڑے طوائف کے کوٹھے میں میں ہی سب سے بڑی پاک صاف ہستی ہوں، کیونکہ میں ہی اسے ختم کرنا چاہتا ہوں، یک دم تباہ! اُما جاگ گئی ہے۔ میری طرف دیکھ کر کہتی ہے، ''ناک

Scanned with CamScanner

سے ٹیوب کیوں نکال دیا؟... اب تم مجھ سے نہیں سنبھل سکتے۔"

"ناک کے اندر زخم ہو گیا ہے۔"

"کس نے کہا؟"

"کہے گا کون...؟"

اُما شاید نیلما کو بلانے گئی۔ بھور ہونے کو ہے، لیکن نیلما اسی طرح کھلی ہوئی ہے۔ کہتی ہے، "پیجیے، نگلیے... اور تھوڑا... ٹھیک ہے، دوست کرے گا تو ہم دیکھے گا... ٹھیک... واہ... اب نلی کھولے گا تو ابی ادھر آ کے پلنگ میں دونوں ہاتھ باندھ دے گا۔"

میں کیا نیلما سے پیار کرنے لگا ہوں؟ کیا اُما ٹھیک کہتی ہے کہ میں نیلما سے پیار کرنے لگا ہوں؟ دیکھ رہا ہوں، عشق شروع کرنے اور عشق کرنے کی واحد جگہ آج بھی ہسپتال ہی ہے۔

حرامزادے 'نیلما یا کسی اور کو پیار کر کے اب کیا کرے گا تو'؟ جب تک سانس چلنا بند نہ ہو، جنس کی آگ شاید نہیں بجھتی۔ نیلما کو دیکھتے ہی میرے جسم کا رواں رواں کھل اٹھتا ہے۔ ٹھیک پندرہ سال پہلے اُما کو دیکھ کر ایسا ہی ہوتا تھا۔

نیلما میری آکسیجن سلنڈر۔ پریم کو دوبارہ جگانے والی متھن راشی کی نرس؟

سالے، پھر شاعری؟

پشپ لال نے اپنے لیٹر پیڈ کے ایک کونے پر متھن راشی کی علامت چھپوا لی تھی۔ سمبھوگ کے لیے تیار بیٹھے ادھ ننگے مرد عورت کی جوڑی۔ پچھلے پانچ برس سے اُما میرے ساتھ نہیں سوتی۔ نہیں سوتی یعنی سمبھوگ سے دور رہتی ہے۔ وہ میرے جسم کو ناپاک اور گھناؤنا سمجھتی ہے۔ اور تب سے مجھے اُما سے شرم آنے لگی ہے۔ ایک بار لکس پار کرنے کے بعد، یعنی خفیہ علاقوں میں ننھے ننھے کالے کالے گھنگھریالے بالوں کی پہلی فصل کے دنوں، ایک صبح آٹھ بجے تک مجھے سوتا دیکھ ماں نے میرے جسم پر سے چادر کھینچ لی تھی اور چادر کے نیچے میں ایک دم ننگا تھا... شرم کے مارے میں سات آٹھ دن تک ماں سے آنکھیں نہیں ملا سکا تھا... ویسی ہی شرم! انہیں مجھ پر اپنے خاندان اور محبت کے تقدس کو بدنام کرنے کا الزام لگایا جاتا ہے۔

سب کچھ نہیں، اصل میں میں ہر طرح سے دیوالیہ ہو چکا ہوں۔ شراب؟ سالی سانپ کے

Scanned with CamScanner

زہر سے بھری ہوئی شراب بھی میں نے پی ہے۔ شراب، گانجے، چرس اور سگریٹ کی زیادتی سے میری آواز خراب ہو گئی ہے۔ یہ اب بازار میں نہیں چل سکے گی۔ میری سریلی آواز اب پھٹے بانس سے نکلنے والی آواز کی طرح ہو گئی ہے۔ اور جب گا نہیں سکوں گا تو جی کر کیا ہوگا؟ فلیٹ میں میری الماری میں اب بھی ڈمپل کی بھری بوتل کھڑی ہوگی۔ میں نہیں رہوں گا تو وہ کس کے کام آئے گی؟ ماتا الماری سے نکال کر کھڑکی کے باہر پھینک دے گی۔ نہیں... نہیں، پھینک نہیں سکے گی۔ پھینکنا چاہ کر بھی رکھ لے گی۔ ممکن ہے کہ وہ پوجا گھر کے کونے، مہاکالی کے پٹ کے پاس رکھے... گنگا جل کی بوتل کے پاس ہی۔ گنگا... گنگا...

پٹنہ کی گنگا کو منگیر کی گنگا، یعنی من کو دھو ڈالنے والی گنگا کہتے ہیں لوگ۔ اسی لیے پٹنہ کی گنگا کے کوئی پکے گھاٹ نہیں۔ ایک دو ہیں بھی تو اتنے گندے کہ اُدھر کوئی منہ بھی نہ پھیر سکے۔ پٹنہ کی گنگا کے کنارے جلنے والے مُردوں کو نہ شانتی ملتی ہے نہ مکتی۔ اس لیے پشپ لال جیسے باغی کی لاش اس پار سیمریا گھاٹ پر لے جا کر جلائی گئی۔ لیکن اسی گنگا کے کنارے پٹنہ کلب کے رنگین لان میں بیٹھ کر موج سے گزارے وقت اور پٹنہ میڈیکل کالج اسپتال کے کسی بیڈ پر بے بس پڑے گزارے وقت آدمی کے من میں پٹنہ کی گنگا کی جگہ سے وحشت اپنے آپ گونج اٹھتی ہے۔ میرا وشواس پکا ہے کہ اس اسپتال کے ستر فیصد مریض سارے روگوں کو ختم کر ڈالنے والی گنگا کی ہوا کے اثر سے ہی صحت یاب ہوتے ہیں، مرتے مرتے جی جاتے ہیں۔ اپنے دیش میں کسی دریا کے کنارے اور کہیں کوئی اسپتال ہے، مجھے معلوم نہیں۔

گھاٹ سے کوئی سٹیمر کھلنے کی تیاری کر رہا ہے شاید۔ آج کل نئی قسم کا سائرن بجتا ہے... اتھاہ پانی کے اندر سے آتی ہوئی گھٹی گھٹی ہوئی سی آواز۔ اس سائرن کا صحیح نام کیا ہے؟ پوچھنا ہوگا۔

نہیں، اسٹیمر نہیں، یہ تو آکسیجن سلنڈر لایا جا رہا ہے۔ فرش پر بھاری لوہے کے گھسٹنے کی آواز بتدریج نزدیک آتی جا رہی ہے۔ کیوں؟ میرے پاس کیوں؟ میں ہوش میں ہوں۔ جگا ہوا ہوں۔ پلنگ سے اسٹول ہٹا کر، میرے بائیں کاندھے کے پاس سرہانے رکھا ہو گیا ہے۔ دھیرے سے پکارتا ہوں۔ ''ماں'' منہ سے آواز نکلنے کے پہلے ہی سلنڈر فٹ کر دیے...

آدمی اچھل کر میرا منھ دبا دیتا ہے۔ گھسیٹ کر لانے والا شخص وارڈ قلی نہیں، پولیس کا داروغہ ہے۔ اس کے ساتھ پولیس کے کئی سپاہی ہیں جو میرے پلنگ کو چاروں طرف سے گھیر لیتے ہیں... وہ میری تلاشی لیں گے۔ میں نے رضائی کے نیچے تخریبی کتابیں، غیر قانونی کانچ اور نرس نیتا کی لاش چھپا رکھی ہے۔ "اماں! دیکھو تو، وہ کیا کر رہے ہیں؟" داروغہ چلاتا ہے: "چپ رہ سالے!" اور سپاہی میری رضائی ہٹانا چاہتا ہے۔ میں مزاحمت کرتا ہوں... رضائی کے نیچے میں ننگا ہوں... ایک دم ننگا ہوں... "سالو... حرامزادو... مادر چو... بہن چو... کتی کا بچہ..." دونوں دونوں ہاتھ میں چلانا شروع کیا میں نے... اور اسی تال پر لڑائی کا نقارہ بجنے لگا... کسی کے منھ پر کسی کے پیٹ پر، فوطوں اور چوتڑوں پر میری لاتیں لگتی ہیں اور وہ ایک ایک کر کے نقارے کی تال پر بھاگتے جاتے ہیں۔ حد ہے! اماں اس طرح تھکی ہوئی ہے۔ یہاں اتنا شور غل ہو گیا، کان کے پاس لڑائی کا نقارہ بج گیا، لیکن اس کی نیند میں کوئی خلل نہیں پڑا۔ تب رضائی کے نیچے سے گردن نکال کر نیتا مجھ سے پوچھتی ہے، "پولیس کے لوگ سب چلے گئے؟ اب تم چپ چاپ مجھے مار ڈالو۔ آؤ!" رجنی گندھا کی خوشبو میری ناک میں سماتی جا رہی ہے اور نیتا اب گڑگڑا کر کہہ رہی ہے، "پلیز! کل می!" میں اماں کو جھنجھوڑ کر جگاتا ہوں۔ اماں لڑھک کر فرش پر گر پڑتی ہے اور اس کے گرنے کی آواز جلترنگ کی طرح... یہ نیتا کھلکھلا کر ہنس پڑی ہے؟ میں بھی اس کے ساتھ ہنسنا چاہتا ہوں، لیکن ہنسنے کے بجائے میں "ماں! ماں!" پکار کر رونے لگتا ہوں۔ میں روتا جاتا ہوں اور نیتا اسی طرز پر بنگلہ کا مرثیہ سا گا رہی ہے، "ماں آں آں آں!" دراصل رونے کے بجائے گا رہا ہوں میں!

سادھی نہیں، نیتا؟ پتا نہیں کیا سچ ہے اور کیا سپنا! جو بھی ہو، میں نے نیتا کو قتل نہیں کیا ہے۔ وہ ڈاکٹر کی مدد کر رہی ہے۔ ڈاکٹر کہتے ہیں، میں نیند میں ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ نیتا ہنس کر کہتی ہے: "ادھر ادھر میں ایسا کک مارا، کہ ہم دونوں کو لیٹنا پڑا..." مجھے کوئی سوئی دی جا رہی ہے شاید!

ماں اس طرح گھبرا کر مجھے کیوں دیکھ رہی ہے؟ ایسی گھبراہٹ اس کے چہرے پر زندگی میں کبھی نہیں دیکھی۔ رندھے گلے سے پوچھ رہی ہے مجھ سے: "کیا ہو رہا ہے؟ کیوں ایسا کر رہے ہو؟ کیسا لگ رہا ہے؟ بولو نا... بولتے کیوں نہیں... بابو... شیو بابو رے..."

اچانک ماں چیخ پڑتی ہے۔ لگا آسمان چرچرا کر پھٹ گیا... تارے تیزی سے ٹوٹ کر گر رہے

ہیں۔ "ماں، او ماں! میں برباد ہو رہی ہوں۔ میرا کوئی نہیں اس کے سوا۔۔۔ ہاہاہا۔۔۔ ڈاکٹر بابو۔۔۔!"

میں سب کچھ دیکھ رہا ہوں، سب کچھ سن رہا ہوں، لیکن کچھ کہہ نہیں پا رہا۔ نیلما اماں کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر اٹھاتی ہوئی سمجھا رہی ہے: "ایک نیا ڈرگ دیا گیا تھا، اسی کا ری ایکشن ہوا ہے۔ ابھی ٹھیک ہو جائے گا۔ سوئی پڑا ہے۔۔۔ "سرجن اے جے کی جھڑکی سنائی دیتی ہے۔" اماں! یہ کیا ہو رہا ہے؟"

"میرا شیو بابو بولتا کیوں نہیں، ڈاکٹر؟"

"بولے گا۔۔۔ ابھی بولے گا۔۔۔ تم چپ رہو۔"

"اچھا، میں رہوں گی! میں ہوں۔"

ہارٹ اسپیشلسٹ ڈاکٹر شری نواس آئے ہیں۔ ان کی سفید بھی داڑھی کو دیکھ کر مجھے کویراج چکرورتی کی یاد آجاتی ہے۔ کویراج چکرورتی سونگھ کر ہی مرض کی تشخیص کر لیتے تھے۔ ڈاکٹر شری نواس بھی دور سے ہی مجھے دیکھ کر کہتے ہیں: "ہارٹ نارمل ہے۔۔۔"

میڈیسن کے ڈاکٹر داس آئے۔ وہ بھی مجھے دور سے دیکھتے ہیں۔ کوئی مجھے چھوتا تک نہیں۔ وہ مجھ سے بولنے کو کہہ رہے ہیں۔ میں ہاتھ کے اشارے سے کہتا ہوں، آواز نہیں نکل رہی! ڈاکٹر داس کہتے ہیں: "ہاں، ری ایکشن ہی ہوا ہے۔"

میں جانتا ہوں، میں نے دیکھا ہے، حلق کے کیسر میں یہی ہوتا ہے۔ بولی اچانک بند ہو جاتی ہے۔ اگر بولی نہیں لوٹی تو؟ ووکل کورڈ ڈیمج تو نہیں ہو گیا؟ میں ڈاکٹر سے پوچھنا چاہتا ہوں۔ ڈاکٹر۔۔۔

سبھی اکٹھے بول پڑتے ہیں: "آ گئی!"

بجلی گل ہونے کے بعد جب لوٹتی ہے تو لوگ اسی طرح ایک ساتھ بول پڑتے ہیں: "آ گئی!"

لیکن اماں کو یقین نہیں آ رہا۔ وہ پوچھتی ہے: "بولو تو، میں کون ہوں؟"

مجھے ہنسی آ گئی۔ میں نے پوچھا: "یہ سب سپنا تو نہیں؟"

"تمہاری طبیعت کیسی ہے؟" اماں پوچھتی ہے۔

میں کروٹ لینے کی کوشش کرتا ہوں۔ اماں منع کرتی ہے۔۔۔ پیٹ کے بیچوں بیچ شدید تکلیف۔۔۔ یہ کیا۔۔۔ میرے پیٹ پر بھاری کیا رکھا ہے؟ ذرا بھی ہل ڈل نہیں سکتا۔ یا نیلما نے بیچ بیچ مجھے پلنگ سے

باندھ دیا ہے؟

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

"[illegible]"

[illegible]

[illegible]

"نہیں تو!"

"[illegible]"

"تم تو دس گھنٹے سے بے ہوش تھے۔"

"اور میلنا؟ بلاؤ نا اسے ایک بار۔"

"کون میلنا؟" اما کو پھر حیرت ہوتی ہے۔

[illegible]

"[illegible]"

[illegible] منع کیا ہے۔"

[illegible]

کے اوپر اڑتی ہوئی... یا اتھاہ پانی میں بجنے والے سائرن کی طرح، اتھاہ پانیوں کے نیچے کی طرف گھٹتی ہوئی...

⊕ ⊕

Scanned with CamScanner

مدرا راکھشس

ہندی سے ترجمہ: زیبا علوی

ہیرا بائی ناچے گی

یہ تیسری بار ہوا تھا اور بالکل اسی طرح جس طرح پہلے دو بار۔ ویسے تو وہ لوگ اس بار بھی چوکنّا رہے تھے، لیکن وہ دور ہی کھڑا رہا۔ دو موٹر ٹھیلوں میں آئے سپاہی سب سے پہلے زور زور سے چیختے اور بے مقصد لاٹھیاں پٹختے ہوئے دوڑے۔ ان کی اس حرکت سے مردوں کے مقابلے میں عورتوں اور بچوں میں زیادہ دہشت پھیلی۔ اور ان سے زیادہ ڈر گئے وہاں گھومتے والے کتے، سور، بطخ، مرغیاں، بکریاں اور طوطے۔ اس منظر سے وہاں ایک زبردست شور مچ گیا۔ اس شور نے گھبراہٹ اور زیادہ بڑھا دی۔ لہٰذا مرد، جو کم ڈرے تھے، اس وقت بستی اجڑنے کی مہم کی مزاحمت کرنے کے بجائے ضروری سامان بچانے کے لیے بھاگے۔

سپاہیوں کے پیچھے لمبی لوہے کی سلاخوں اور ہتھوڑوں سے لیس کچھ لوگ بڑے اطمینان سے وہاں بنے چھوٹے چھوٹے گھر گرانے لگے۔ انھیں گرانے میں زیادہ محنت نہیں کرنی پڑ رہی تھی۔

بستی میں زیادہ تر مکان عام جھونپڑیوں سے بھی زیادہ خستہ حال تھے۔ ان کی چھتوں کے بجائے بانسوں اور ٹیڑھی میڑھی لکڑیوں کے ڈھیر پر پرانے ٹاٹ سے لے کر پھٹے ہوئے پولیتھین کی چادر تک ٹوٹی سڑی رسیوں سے باندھ دی گئی تھی۔ اور یہ محنت اور ہوشیاری سے بنائی گئی چھتیں ہوا میں اڑ نہ جائیں، اس لیے ان پر بہت سے اینٹ پتھر لاد دیے گئے تھے۔ ایسے مکانوں کی دیواریں بنانا سب سے مشکل کام تھا اور وہ اکثر لمبے عرصے میں پورا ہوتا تھا، کیونکہ ان دیواروں کے لیے ڈھیر سے

ڈھیر ے کر کے دور دور سے اینٹیں چرا کر لائی ہوتی تھیں۔

یہ گھر زیادہ بڑی ضرورتیں پوری نہیں کرتا تھا۔ اس میں اکثر رینگ کر یا بہت جھک کر صرف سونے یا دھوپ اور بارش سے بچنے کی کوشش کی جا سکتی تھی۔ بارش میں آس پاس کا پانی اندر بھی نہ بھر جائے، اس لیے نیچے کا فرش تھوڑا اونچا، ایک چبوترے جیسا بنا لیا جاتا تھا۔ حالانکہ اس میں چھت ہوتی تھی، پر بارش میں بھیگنے سے بچ پانا مشکل ہی ہوتا تھا۔ ان جھونپڑیوں کے بیچ ایک سور یا آدمی کے چلنے کی جگہ چھوٹی رہتی تھی، جس میں بہت زیادہ کیچڑ ہو جاتا تھا۔

اس طرح کے مکانوں والی بستی اجاڑنے کے کام میں میونسپلٹی کو زیادہ محنت نہیں کرنی پڑتی تھی۔ لوہے کی چھڑ سے بار کر چھت پر ایک دھکا مار دینے سے ہی پورا گھر ننگا ہو جاتا تھا۔ اس کے بعد ہتھوڑے والا آدمی باقی بچی چھوٹی چھوٹی دیواروں پر دو چار چوٹیں لگا دیتا تھا۔ اتنے کے بعد دھیرے دھیرے سب ڈیڑھ سال میں تیار ہوا ان کا گھر ملبے یا کوڑے کا ڈھیر بن جاتا تھا۔

تقریباً ڈیڑھ گھنٹے کی اس کارروائی کے بعد جب میونسپلٹی والے وہاں سے چلے تو عورتوں نے گالیاں دینی شروع کر دیں۔ کچھ نے غصے میں آ کر جاتے ہوئے سپاہیوں کے پیچھے اینٹوں کے ٹکڑے بھی پھینکے۔ وہ چیخ چیخ کر رو بھی رہی تھیں۔ پھر فوراً ہی ملبے کو کھودنے لگیں۔ بہت سا سامان ایسا تھا جو پچک جانے کے باوجود بچایا جا سکتا تھا، جیسے میلی، کالی پتیلیاں، لوہے یا پلاسٹک کے ڈبے، یا کنستر۔

نیت رام کمہار کی بیوی زور زور سے رونے لگی تھی کیونکہ جھونپڑی کے ساتھ ہی اس کے زیادہ تر برتن چور چور ہو گئے تھے۔

سڑک کی طرف لکڑی کے کچھ ڈبے جیسے بھی لوگوں نے کھڑے کر لیے تھے، جن میں چھوٹی چھوٹی دکانیں تھیں۔ پان بیڑی کی دکان۔ اسکوٹر مرمت یا سبزی کی دکان۔ ایک ننھا سا کارخانہ چھاتے اور سوٹ کیس کی مرمت کا۔ ایک موچی اور ایک حجام۔ ایک بجلی کی سجاوٹ والے ڈیکوریشن کا کھوکھا۔

ڈیڑھ گھنٹے کی اس کارروائی کے بعد اب وہاں کا منظر بالکل مختلف تھا۔ زمین کے جتنے حصے میں وہ جھونپڑیاں اور کھوکھے تھے، وہ حصہ صاف لمبا چوڑا میدان بن گیا تھا۔ اس میدان میں اینٹ پتھروں، بانسوں، چیتھڑوں کے ڈھیر اب اس طرح چھترائے پڑے تھے جیسے کسی جنگ کے بعد

ٹوٹے رتھ، مرے گھوڑے اور زخمی سپاہی بکھرے ہوں۔ اب تک یہاں رہنے والے ہر شخص کا قد جیسے لمبا ہو گیا۔

پولیس والوں کی للکار کے بعد جو بچے ڈر کر چیختے ہوئے دور تک بھاگتے چلے گئے تھے، وہ کھجور کے پیڑوں کے بیچ سے اس ساری کارروائی کو دیکھتے رہے تھے۔ پولیس اور میونسپلٹی کے دستوں کے جانے کے بعد وہ پھر لوٹ آئے تھے۔ ان کا اپنا ردعمل اپنے والدین کی نقل ہی زیادہ تھا۔ وہ بچے رونے لگے جن کے ماں باپ رو رہے تھے۔ کچھ بچے اپنی ماؤں کی طرح ہوا میں پتھر پھینک کر اپنا غصہ اتارنے لگے۔ یہ سلسلہ زیادہ دیر نہیں رہا۔

نندو بڑھئی کا چھوٹا بیٹا سرجی چلایا: "ابے او بے پرمو، تیری گیند! تیری گیند مل گئی ہے۔"

"کہاں؟" پرمو چونک گیا۔ وہ خود آس پاس کے کوڑے سے ایسی ہی کوئی چیز کھوج رہا تھا۔

یہ ایک عمدہ وزنی کرکٹ والی گیند تھی جو پرمو قریب ڈیڑھ برس پہلے لایا تھا۔ خرید کر نہیں، سرکاری افسروں والی کالونی کے پارک سے۔ چونکہ کئی دن سے ٹی وی اور ریڈیو مسلسل کرکٹ کا کھیل نشر کر رہے تھے، اس لیے لگ بھگ ہر جگہ ہر بچہ اسی کھیل میں مشغول تھا۔ کچھ بچے سستی پلاسٹک والے اور سستے بلوں کے ساتھ اینٹوں کے ڈھیر کو وکٹ بنا کر کھیلتے تھے تو کچھ بچے باقاعدہ پیشہ ور کھلاڑیوں والا سامان خرید لائے تھے۔ اس سامان میں بچوں کے قد سے بہت لمبے، بھاری، اونچے پیڈ اور دستانے بھی تھے۔ انھیں ضرور کھیل کی ساری باریکیاں آتی ہوں گی، کیونکہ انھوں نے ریفری اور ایمپائر تک مقرر کر رکھے تھے۔ ان بچوں کا کھیل جس پارک میں ہوتا تھا، اس کے چاروں طرف پرمو جیسے کچھ بچے کھڑے رہتے تھے۔ گیند جب کبھی پارک سے باہر آ جاتی تھی تو انھی میں سے کوئی بچہ اسے احتیاط سے اٹھا کر واپس کر دیتا تھا۔ ایک بار گیند جب پرمو کی طرف آئی تو اس نے کسی ماہر کھلاڑی کی طرح روکنا چاہا، پر وہ اونچی زیادہ تھی۔ گیند کے گزرنے کی ہلکی آواز اسے آئی تھی، پر گیند دکھائی کہیں نہیں دی۔ کھیلنے والے بچوں نے بھی ڈھونڈا، پر وہ ملی کسی کو نہیں۔ ہار کر بچے دوسری گیند لے آئے۔ پرمو تو کھیل دیکھتے ہوئے بھی اسی گیند کے بارے میں سوچتا رہا۔ آخر وہ غائب کہاں ہو گئی، ہو سکتی ہے؟

کھیل دیکھتے دیکھتے ہی اچانک اس کی نگاہیں گیند کھوجنے لگیں۔ آخر اس نے گیند دیکھ ہی لی تھی۔ وہ پاس ہی بن رہے مکان کے سامنے جمع اینٹوں کے دو چٹوں کے بیچ تھی۔ پرمو نے فوراً ہی

اُدھر سے اپنی نگاہ ہٹالی۔

اس گیند کو وہ اسی وقت نہیں لایا۔ رات جب کالونی کے ٹک جھک سارے بچے ٹی وی دیکھنے میں مشغول تھے، پرمود وہ گیند نکال لایا تھا۔

سوچی بستی میں اتنی عمدہ اور نایاب گیند کسی کے پاس نہیں تھی۔ بہت دیر تک وہ لوگ آپس میں مل کر اس کا معائنہ کرتے رہے۔ اس سے پہلے بھی انھوں نے بہت سی گیندیں دیکھی تھیں، اور ان سے کھیلے بھی تھے۔ بچے نے تو کاغذ کے ایک گولے پر چیتھڑے لپیٹ کر ایک گیند تیار کر لی تھی۔ آس پاس پھیلی بہت سی کالونیوں میں کچھ کھلونے انھیں مل جاتے تھے، جیسے گڈے گڑیاں، ٹین کی موٹریں اور گیندیں۔ ربڑ کی کچھ کھوکھلی گیندیں پھٹی ہوئی ہوتی تھیں اور کچھ دیکھنے میں اوپر سے ثابت تکی تھیں۔ ایسی گیندوں کو یہ لوگ فوراً پھاڑ دیتے تھے، تاکہ انھیں دوبارہ دھوکہ نہ ہو۔

اس بار جو گیند ملی تھی وہ عجیب ہی تھی۔ اسے کئی مرتبہ ان لوگوں نے چھو کر دیکھا۔ منگن نے جوش میں آکر اسے اچھال کر دیکھنا چاہا تو پرمود اس سے تقریباً لڑ ہی بیٹھا تھا۔

اس گیند کو کھیلنا بھی ایک مسئلہ تھا۔ کسی ٹوٹے تختے سے یا بانس سے کھیلنا اس گیند کی بے عزتی سی تھی، اس لیے پرمود اور اس کے ساتھیوں نے مرچی سے دوستی کی۔ مرچی منصور بڑھئی کا سب سے چھوٹا بیٹا تھا اور باپ کے ساتھ چارپائیوں کے پائے بنانے کے کام میں مصروف رہنے کے ساتھ لگا رہتا تھا۔ رکھانی بسولے کے بجائے رندے اور چھینی کش میں اسے ایک خاص طرح کی انگریزیت محسوس ہوتی تھی۔ اس لیے وہ بستی کے باقی بچوں سے زیادہ ملتا جلتا بھی نہیں تھا۔ مرچی کو راضی کرنے میں زیادہ مشکل نہیں ہوئی تھی۔ اس نے باپ سے ان لوگوں کے لیے ایک بلّا سا بنوا دیا تھا۔ پرانے تختے سے جو بلّا اس نے بنایا تھا، وہ اصلی گیند کے ساتھ ٹکرا کر جلدی ہی بیچ سے پھٹ گیا۔ تب وہ دوبارہ ایک بانس کے ٹکڑے سے گیند کھیلتے رہے تھے۔ شاید یہ بانس کا قصور رہا ہو یا چاروں طرف کباڑ کی طرح پھیلی ہوئی جھونپڑیوں کا، کہ جلدی ہی وہ گیند غائب ہو گئی۔ ایک زوردار شاٹ کے بعد وہ اچھلی تو پتا ہی نہ چلا کہ کہاں چلی گئی۔ گیند کی تلاش میں پرمود اور اس کے ساتھی کئی جھونپڑیوں کی چھتوں پر چڑھے اور توڑ دینے کے جرم میں خاصی گالیاں کھائیں۔ کئی روز پرمود جگہ جگہ اسے تلاش کرتا رہا تھا۔ اس سے زیادہ لگن سے اس کے ساتھیوں نے اس کی تلاش کی تھی۔ پر گیند نہیں ملی تھی تو نہیں ہی ملی۔

Scanned with CamScanner

بارش اور دھوپ سے بدرنگ ہوئی وہی گیند مرچی لیے کھڑا تھا۔ پرمود نے دیکھا اور جھپٹ کر گیند ہاتھ میں لے لی۔ وہی ہے۔ اس نے اس کا میل اپنے کپڑوں پر رگڑا، پر وہ صاف نہیں ہوئی۔ جو بھی ہو، گیند تو مل گئی۔ پرمود کے پاس سگریٹ والا ڈھول پہلے ہی پرانا اور خستہ حال تھا۔ ٹیم کا پریکٹس کا سامان تو سب ادھر ادھر ہو گیا تھا۔ اس کا ایک پایا تھا۔ پرمود تو اس سے کھیل سکتا ہے۔ یہ جلدی پھٹ گئی ہیں۔

پرمود نے بات سے زیادہ جوش سے اپنے باقی دوستوں کو تنگ کرنا شروع کر دیا۔ گمشدہ گیند کے مل جانے کی بات نے ان میں کچھ زیادہ ہی جوش پیدا کر دیا، جلدی ہی وہ پہاڑی کی چوٹی پر جمع ہو گئے۔ پتے نشانوں پر وہ کھیلتا اور ملبے سے اٹھتا ہوا دھواں۔ دیکھنے والے پہاڑی کی طرف تاکتے رہے، جہاں پر دھوبی اپنے کپڑے سکھاتے تھے، کھڑے ہوئے۔ آج سے کئی سال پہلے جب دھوبی بھی وہاں سے غائب تھے۔ ان کے کرکٹ کھیلنے کی اس سے عمدہ جگہ انہیں آج تک نہیں ملی تھی۔

تبھی ایسے ہی تیاری کر رہے تھے کہ ایک آواز آئی، جیسے کوئی کسی سور کو مارنے کی کوشش کر رہا ہو۔ وہ چیخ رہی تھی۔ پان بیڑی کے کھوکھے والے کی ماں آ گئی تھی اور وہ چھاتی پیٹ پیٹ کر روتی ہوئی بہت تیز آواز میں میونسپلٹی والوں کو کوس رہی تھی۔ اس آواز سے شہ پا کر دوسری عورتوں نے بھی چیخنا شروع کر دیا۔

راکیش تھوڑی دیر کے لیے رک گیا، کیونکہ ہر بچے کو پتا تھا کہ ان عورتوں میں اس کی ماں بھی شامل ہے۔

اسی بیچ چیخ چلا کر گالیاں دیتے ہوئے مجید نے چھوٹے کو دھکا دیا۔ چھوٹے کا پیٹ پہلے ہی بڑھا ہوا تھا، دھکے سے لڑکھڑا کر وہ لڑھک گیا۔ اس پر وہ بھی اتنی ہی بھدی گالیاں بکنے لگا۔

مجید کی حرکت سے تھوڑا دور کھڑا پرمود کسی بزرگ کی طرح ان کی طرف بڑھتے ہوئے گالیاں دیتے ہوئے چیخا: "یار، سب کے سب اس کو دھکا کیوں مار دیا؟"

مگر اس جھگڑے میں باقی بچے شامل نہیں ہوئے، بلکہ جھنجھناتے ہوئے وہ خود ایک حد تک چھوٹے پر تنقید کرنے لگے۔ اس بات نے پرمو کو حیران کر دیا۔ وہ بوکھلا کر باقی بچوں کا منھ دیکھنے لگا۔

"ابے تو بات کیا ہے؟"

جواب میں مجیدا اور چندو گالیاں بکنے لگا۔

بات سچ مچ گمبھیر تھی۔

پچھلے روز اچانک ہی مجید نے ایک نئے کھیل کی ایجاد کر لی تھی۔ بستی سے دور پیچھے کی طرف، جہاں خالی میدان ختم ہوتا تھا، کھجور کا ایک چھوٹا سا جنگل تھا۔ ان دنوں ٹھیکدار یہاں تاڑی اتروا رہا تھا۔ تاڑی اتارنے کے کام میں مجید کا باپ بہت ماہر تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ اونچی اور مشکل جگہ چڑھنے کی اسے خاصی مشق تھی۔ اس نے تین بار بجلی کے ٹرانسفارمر اتارے تھے اور بجلی کے تار تو بہت بار کاٹے تھے۔ بجلی کا ٹرانسفارمر اتارنے میں ایک بار اسے سزا بھی ہو گئی تھی۔ اس حادثے کو وہ بہت خوشی سے بیان کرتا تھا۔

باپ جب تاڑی اتارنے جاتا تھا تو مجید بھی اس کے ساتھ ہو لیتا تھا۔ مجید کی عمر کے کچھ اور بچے بھی اس کے پیچھے پیچھے وہاں پہنچ جاتے تھے۔ انھیں تازہ اتاری تھوڑی بدبو چھوڑتی میٹھی تاڑی جو مل جاتی تھی۔ اسے پینے کے بعد وہ سب دوپہر تک وہیں ٹھیکیدار کے لیے جوڑے جھونپڑے کے آس پاس کھیلتے رہتے تھے۔ کل بھی وہ وہیں تھے۔ جھونپڑے کے اندر اکٹھا کی جا رہی تاڑی کی بدبو اور بڑی بڑی مکھیوں کی آوازوں میں اپنی چیخیں ملاتے وہ ایک دوسرے کو کھوج اور کھدیڑ رہے تھے۔

جب وہ اس بے مطلب کھیل سے اوب گئے تو کھجور کے اس چھوٹے سے جنگل کے پیچھے سے ہو کر بہنے والے ایک نالے میں اتر آئے۔ اس نالے میں انھیں کبھی کبھی ایک آدھ چھوٹی مچھلی مل جاتی تھی جسے وہ بہت محنت کے ساتھ پکڑ لیتے تھے۔ لیکن دوسری مچھلی چونکہ کبھی ہاتھ نہیں آتی تھی اس لیے پکڑی ہوئی چھوٹی مچھلی کو، جو کب کی مر چکی ہوتی تھی، وہ مٹی میں پٹک دیتے تھے۔

نالے میں اگی لمبی لمبی گھاس کی پھنگیوں پر ننھے ننھے ہوائی جہازوں جیسے معصوم ٹڈے منڈلا رہے تھے۔ پکڑے جانے پر وہ بڑی تیزی سے پر پھڑپھڑاتے تھے

مجید نے ایک ٹڈا پکڑ لیا۔ وہ تیزی سے پنکھ پھڑپھڑانے لگا۔ مجید اسے اپنے چہرے کے قریب

Scanned with CamScanner

سے گیا۔" اب پنکھا، سارا بجلی کا پنکھا" تو مینک۔ سارا ہوا دیتا ہے۔"

اس نے تنکا دوسرے بچے کے چہرے کے قریب کر دیا۔ اس نے بھی ہوا محسوس کی۔ اب سبھی بچے تنکے کے پنکھے سے کھیلنے لگے۔

مجید نے اس کے بعد آس پاس کی پھوس کی بالیاں جمع کیں۔ ان دنوں نے وہیں آس پاس میں خالی بستے سے ... جو آنگن میں پڑی جاتی تھیں۔ ایسی بہت سی بالیوں کو موڑ کر اس نے ڈبہ جیسا بنایا اور ایک تنکا اس نے اندر بند کر دیا۔ "دیکھو یہ انتظام ہو چکا۔ جب گرمی لگے، ڈبے میں سے پنکھا نکالو اور ہوا لے لو۔"

اس کے بعد اور بچوں نے بھی اسی طرح کے پنجرے بنا لیے۔ پھر پنجروں میں انھوں نے تنکوں کے علاوہ دوسرے کیڑے بھی بند کر لیے، جیسے دیمک اور نگینہ بیر بہوٹی، تک بھر دیا۔

گبریلا ظہور نے پکڑا تھا۔ اس کیڑے کی عادت سبھی بچوں کو معلوم تھی۔ یہ بہت گھناؤنا، گندگی والا کیڑا تھا۔ یہ چھوٹی چھوٹی مٹی کی گولیاں سی بناتا جاتا تھا اور اپنے پچھلے پیروں سے لڑھکاتا ہوا اپنے سوراخ تک لے جاتا تھا۔

اسے دیکھتے ہوئے مجید نے حیرت ظاہر کرتے ہوئے ایک چیخ ماری۔ "ارے باپ رے، گندگی ڈھونے والا کیڑا۔"

"ہاں سن!" تو مدو نے عقلمندی جتاتے ہوئے کہا، "میں بتاؤں، یہ سالا کیڑوں کا مہتر ہے۔"

"تب تو اور مزیدار بات ہے،" للو بولا۔ "یہ سالا باقی کیڑوں کے پنجروں کی ٹٹی صاف کرے گا۔"

اب وہ اس بات کا اندازہ لگانے لگے کہ کون سا کیڑا کیا کام کرے گا۔ مریم فوراً چلائی، "میری تتلی ناچے گی۔ تو تتلی کرے گی؟ تو تتلی۔ عورت کا پیار والی فریدہ۔ واہ۔"

"ابے تو چل، ایک کیچوا بھی پکڑتے ہیں۔ وہ بورنگ کرے گا۔ ونڈ پائپ لگائے گا، ونڈ پائپ،" مجید نے مشورہ دیا۔

ان کی بستی کے بہت سے لوگوں کی طرح کام کرنے والے کیڑے انھیں مل گئے۔ انھیں یقین ہو گیا کہ انھوں نے ان پنجروں میں ایک پوری بستی ہی بند کر لی ہے۔ اس بستی کو بسانے کے لیے

Scanned with CamScanner

اب ایک اچھی سی جگہ کی ضرورت تھی۔ جھونپڑیوں کے پیچھے والے میدان میں دور دور تک دھوبی اپنے کپڑے پھیلا دیتے تھے۔ کھجور کے پیڑوں کی آس پاس کی جگہ میں کوئی بھی کونا خالی نہیں تھا، کیونکہ وہاں تاڑی نکالنے والوں کے پیروں سے روندے جانے کا خطرہ تھا۔

دھوبیوں والے میدان اور کھجور کے جنگل کے بیچ ٹوٹی ہوئی قبر تھی، ایک ننھے سے ٹیلے پر۔ قبر کے پاس دو آم کے پیڑ جیسے درخت تھے۔ یہ جگہ انھوں نے اپنی بستی کے لیے چنی تھی۔ یوں بھی چونکہ یہی جگہ خالی رہتی تھی اس لیے بستی کے بچوں نے یہاں کھیلنے کی عادت بنالی تھی۔

نایاب گیند کے دوبارہ مل جانے کے جوش میں وہ تھوڑی دیر کے لیے یہ بات بالکل ہی بھول گئے تھے کہ کل ہی انھوں نے یہاں اپنی ایک بستی بسائی تھی۔ اسی بستی کے کچھ پنجروں پر چھوٹے کے دونوں پیر بھرپور پڑ گئے تھے۔ ان میں سے ایک پنجرہ تو وہی تھا جس میں گانے ناچنے والی فریدہ بند تھی۔

بات معلوم ہوئی تو پرمو ہنسنے لگا۔ "سالا فریدہ! ابے یہ بھی مزیدار بات ہے۔ میونسپلٹی والوں نے ہماری بستی توڑ پھوڑ دی اور چھوٹے ارل سالے نے مجید کی بستی توڑ پھوڑ دی۔ سالا یہ تو نڈیل چھوٹو حرامزادہ... اس حرامی نے بستی اجاڑ دی... دیکھو تو، بھوتنی کا سالا، میونسپلٹی ہو گیا اے"

چھوٹے شرمندگی کی مسکراہٹ کے ساتھ پیچھے ہٹ گیا۔ مجید اور دوسرے بچے جلدی جلدی ٹوٹے پنجرے دیکھنے لگے۔ پنجروں میں سے کئی کیڑے غائب تھے اور کئی مرے ہوئے تھے۔ جو نہیں کچلے تھے ان میں سے بھی۔

"ابے، ان میں تو پہلے ہی مہاماری پھیل گئی تھی۔ ہیضہ ہو گیا ہوگا ہیضہ۔" پرمو نے کہا۔

"چل آج پھر پنجرے بناتے ہیں۔" مجید نے کچلے پنجروں کے ساتھ باقی پنجرے بھی پھینکتے ہوئے جوش میں بھر کر کہا۔

"ابے سالا چھوٹے پھر وہی کرے گا۔"

انھی مکالموں سے ایک بار پھر ایک بالکل نئے کھیل کی ایجاد ہو گئی۔ جھونپڑیوں والی بستی اور میونسپلٹی کے توڑ پھوڑ والے دستے کا کھیل۔

کھجور کی پتیوں اور گھاس سے چھوٹی چھوٹی جھونپڑیاں بننے لگیں اور سگریٹ اور ماچس کی

ڈبوں سے دکانوں والے کھوکھے۔ یہ ننھی سی بستی خاصی کاریگری سے تیار ہوئی تھی۔ کچھ کے چھپر باقاعدہ پھوس باندھ کر بنے تھے۔ ایسی چیزیں تیار کرنے کا جیسے انھیں خاصا تجربہ تھا۔ جھونپڑیوں کے بیچ پیڑ سے چھوٹی چھوٹی ٹہنیاں توڑ کر ان کے ڈھیر سے لکڑی کی ایک ٹال بنائی تھی۔ معراج نے لمبی تیلیاں اکٹھی کر کے بانس والے کی بانس منڈی تیار کر لی۔ ماچس کی ڈبیوں سے انھیں ایک تانگے کا ڈھانچہ مل گیا تھا۔ اس سے تانگہ اسٹینڈ بھی تیار ہو گیا۔

جھونپڑیوں والی یہ بستی اب توڑے جانے کے لیے پوری طرح تیار تھی۔

"بستی والو، تیار ہو جاؤ، دو منٹ میں بستی کو آگ میں جلا دیا جائے گا" پرمو نے ڈرامائی انداز میں آواز لگائی۔

"صبر و تحمل،" معراج نے آواز لگائی۔ "ابے، یہ تو بدل آئے گا سالے، تو سیٹھ ہے۔ سمجھا؟"

چھوٹے ہی نہیں، باقی بھی سمجھ گئے۔ پچھلے دنوں انھوں نے کئی فلمیں دیکھی تھیں۔ کچھ دن پہلے فہیم سیٹھ کی لڑکی کی شادی تھی۔ اس سے پیچھے کے میدان میں تنبو لگا کر بارات ٹھہرائی تھی۔ اس وقت وی سی آر پر لگاتار چھ فلمیں دکھائی گئی تھیں۔ فلمیں بہت ہی مزیدار تھیں۔ بچوں نے ان کے بہت سے کرداروں کی بہت دنوں تک نقل کی تھی۔ وہ لوگ فوراً سمجھ گئے کہ بستی کی بجائے سیٹھ زیادہ دلچسپ رہے گا۔ انھیں مکالمے اور منظر میں کردار سمجھانے کی ضرورت نہیں تھی۔ چھوٹے فوراً آگے آیا اور ڈرامائی انداز میں بولا: "ابے او بستی والو!"

اچانک وہ مکالمہ روک کر دوسرے نالے کی طرف بھاگا۔

"اب کیا ہو گیا؟" پرمو نے اسے گھورتے ہوئے پوچھا۔

"سیٹھ سالے کو ٹٹی لگ گئی ہے" معراج نے کہا۔ سبھی ہنسنے لگے۔ جب تک چھوٹے دوڑتا ہوا واپس آ گیا۔ اس نے ہاتھ میں ایک چھڑی لے رکھی تھی۔

"یہ کیا ہے؟"

"چھڑی۔ چھڑی ہے۔ سیٹھ کے ہاتھ میں چھڑی ہوتی ہے۔" چھوٹے نے فخر سے چھڑی گھمائی۔ "اے بستی والو، حرامزادو! دو منٹ میں بستی خالی کر دو، ورنہ آگ لگا دوں گا۔ گولیوں سے

سب بھون دیے جاؤ گے۔"

مکالمہ بولنے کے بعد چھوٹے نے فلم کے ولن ہی کی طرح منہ ٹیڑھا کر کے بھنویں اوپر کھینچ لیں۔ پرمو اور معراج اب اس کے غنڈے بن گئے تھے۔ مرچی، پیارے اور مجید آگے آئے اور ہاتھ جوڑ کر گھٹنوں کے بل بیٹھ کر بولے، "ہم پر دیا کرو مائی باپ، ہمارے گھر مت اجاڑو۔ ہم برباد ہو جائیں گے مالک، ہم پر دیا کرو...."

چھوٹے ان کی پیٹھ پر چھڑی مارتے ہوئے چیخا: "کیا دیکھتے ہو؟ آگے بڑھو، توڑ دو بستی اور جو سامنے سے نہ ہٹے، اس پر بھی ٹریکٹر چلا دو۔"

وہ لوگ بلڈوزر کو بھی ٹریکٹر سمجھتے تھے۔ پرمو اپنی گیند ستھنے کے ناڑے میں اٹکا کر تصوراتی بلڈوزر چلانے لگا۔ وہ منہ سے آواز بھی نکالتا جا رہا تھا۔ اس نے بیچ بیچ میں پیارے اور مجید کو ڈھکیل دیا۔ پیارے اور مجید نے پہیے سے کچل کر چھٹپٹانے اور مرنے کی ایکٹنگ بھی کی۔ اب بلڈوزر بستی کو گراتے جا رہا تھا۔ تبھی للو اچھل کر سامنے آ گیا۔ فلم کے ہیرو کی طرح کمر پر ہاتھ رکھ کر دونوں ٹانگیں پھیلائے، اس نے للکارا:

"ارے او سیٹھ کے کتو! جسے اپنی موت پیاری ہے وہ سامنے آ جائے۔"

پرمو بلڈوزر بنا چھوڑ کر بولا: "ابے یہ کیا؟ سالے ہٹ۔"

"ابے او پرموے کے بچے!" للو چیخا۔ "الٹا کر کے ڈینڈا تھمیڑ دوں گا تو منہ سے باہر آ جائے گا۔"

مرا ہوا مجید اٹھ کر بیٹھ گیا۔ "ابے او للوا سے، کیوں کھیل بگاڑ رہا ہے!"

مجید نے اپنی جھونپڑی کے اندر ایک بھاری پتھر چپ چاپ رکھ دیا تھا۔ وہ جانتا تھا، جو بھی اس میں ٹھوکر مارے گا، چلائے گا۔

"اب تو تو پہلے ہی مر گیا سالے، چپ کر!" للو نے اسے جھڑکا دیا۔ "اور تم لوگ بھی سن لو، جس نے بھی جھونپڑی کی طرف پاؤں بڑھایا، سالے کی ٹانگ توڑ دوں گا۔" سب جانتے تھے، للو میں طاقت تھی۔ سب سے زیادہ۔ وہ ان میں سے کسی کا بھی ہاتھ مروڑ سکتا تھا، یا کسی کو بھی اٹھا کر پٹک سکتا تھا۔

بیارے بھی اٹھ کر بیٹھ گیا۔ چھوٹے نے اسے سمجھانے لگا: "بات مانا کر یار، ٹھیک ٹھاک کھیل چل رہا تھا۔"

"ابے تو یہ بھی کھیل سہی،" للو بولا۔

معراج نے کہا: "ابھی ابھی تو دیکھ چکے ہو۔ فلموں والی بات الگ ہوتی ہے۔ دیکھا نہیں، میونسپلٹی والے گھر گرا گئے۔ روکا کسی نے؟"

"نہیں روکا ہوگا، میں تو روکوں گا۔ جس میں ہمت ہو آگے آجائے،" للو نے للکارا۔

چھوٹے کو ابھی پوری طرح یقین نہیں ہوا تھا کہ کھیل بدل چکا ہے۔ اس نے معراج کو آواز دی: "کوتوال صاحب، اس غنڈے کو گرفتار کرلو۔"

معراج غنڈے سے کوتوال بن تو گیا، مگر آگے نہیں بڑھا۔ للو نے اس کی طرف گھونسا تان کر کہا: "کیوں بے سالے، تو کوتوال بنے گا؟"

معراج گھبرا کے پیچھے ہٹ گیا: "کوتوال کسی اور کو بناؤ۔ میں تو تمھارا غنڈہ ہوں۔"

جھونپڑیوں کی توڑ پھوڑ کے کھیل میں اچانک پیدا ہونے والی رکاوٹ سے سبھی کو جھنجھلاہٹ ہونے لگی۔ تبھی تازی والے ٹھیکیدار کے بڑے سے جھونپڑے سے باہر آکر للو کے باپ نے آواز دی: "ابے او للو!"

"کیا ہے؟"

"ابے ذرا دیکھ جا کر، ریڑھے والا زلدو کہاں مر گیا! سالے کو بول، ٹھیکیدار صاحب بلا رہے ہیں۔" حکم دے کر اس کا باپ پھر اندر چلا گیا۔

باقی بچوں نے یقیناً ہی چین کی سانس لی ہوگی اور للو یہ بھانپ بھی گیا ہوگا، کیونکہ وہ جاتے جاتے بولا: "ایک بات بتا دوں، میں ابھی آرہا ہوں، اس بیچ اگر کسی نے بھی جھونپڑیوں کو ہاتھ لگایا تو سمجھ لینا۔"

اس کی اس دھمکی سے سبھی سکتے میں آ گئے۔

جاتے جاتے للو نے انھیں ایک بار پھر دھمکایا اور تالے کے پل کی طرف دوڑ گیا۔

اس کے جانے کے بعد بچوں نے بستی کی طرف دیکھا۔ ننھے چھپروں اور چھوٹے چھوٹے گھروندوں والی وہ بستی اب تک اچھی لگی۔ چھوٹے چھوٹے کوٹھے، دکانیں اور جھونپڑوں سے بیچ والی گلیاں جیسے ان کی طرف دیکھ کر مسکرانے لگیں۔

"اب رہنے دو۔ اس سال کو اور سجائیں گے۔" پرمو نے کہا۔ سب اس بات پر فوراً راضی ہو گئے۔

"ارے ہاں،" معراج بولا، "یہاں ایک تخت بنا کر ڈال دیتے ہیں سب۔ اس کے آگے دری بچھے گی۔ رات میں یہاں ہیرا بائی ناچے گی۔ کیوں سب؟"

"دیا لیجئے نا بے۔ اس کی گیس بتی بنا لیں گے۔"

"عورت کا پیار کھیل ہوگا بے۔ عورت کا پیار۔"

وہ ایک بار پھر نئے اُتساہ سے تنکوں کا تخت بنانے میں جٹ گئے۔ چپ رہنے والا مرلی گانے لگا "نہیں کسی نے دیا ہے تم کو یہ اختیار، بنا خطا کے جو اس طرح ریت ڈالو مار... گڑ گڑ گڑ گڑ، دھم...!"

مدرا راکشس

ہندی سے ترجمہ: شہاب الدین گیلانی

چوہے

میں ایک چوہے کو پہچانتا ہوں، وہ بھی معمولی نہیں لگ سکتا تھا۔ اگر ہمیشہ ہی اسے دیکھ رہا ہوتا تو جس طرح غصہ آتا ہوتا تو اب تک میں اس کا کوئی نام رکھ چکا ہوتا۔

اس چوہے کی دو عادتیں تھیں جو دوسرے چوہوں سے الگ تھیں۔ پہلی عادت کہ موٹے کے حرکات کو [illegible] پتا ہوتا۔ پہلی بار [illegible] کہ وہ بھی۔ [illegible] بڑی ابھری ہوئی لوٹ سے چہرے تک [illegible] آنکھوں کو [illegible] حرکت [illegible] بیٹھا رہتا تھا اور [illegible] دیکھنے والے کو لگتا تھا کہ اسے چھپنے کی بڑی آسانی سے [illegible] مل جاتی ہے۔ لیکن جب موٹے کی پہلو بھی دھکا کھا جاتا تھا۔ مگر وہ اس قدر [illegible] ہوتا تھا کہ [illegible] جب [illegible] کی نظروں سے [illegible] سے دور بھاگ کھڑا ہوتا تھا۔ [illegible] شکار [illegible] آپ کو [illegible] یہ تو [illegible] بھی محسوس کرتے تھے۔

دوسری بڑی عادت تھی اس کا پیچھے سے چھوڑ کر لنگڑاتا، اور [illegible] کہ وہ چوہا جال بوجھ کر لوگوں کو دکھانے کے لیے لنگڑاتا تھا تاکہ [illegible] کی [illegible] نہ کر سکے۔

اس کے علاوہ [illegible] سے [illegible] چوہوں سے [illegible] الگ تھا۔ وہ [illegible] چوہوں سے [illegible] کے بارے میں [illegible] کو بھی غصہ دیا تھا۔ ایک بار تو [illegible] ایک [illegible] جوش سے [illegible] پر حملہ کرنے

کی کوشش کی۔ چوہا اپنی جگہ سے ہلا بھی نہیں۔ مولے اس وقت حیران ہی رہ گیا جب اس نے دیکھا کہ چوہے نے اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے ہی اپنا جبڑا تھوڑا سا کھولا، گویا جھپٹنے والا ہو، اور کتا ٹھٹک گیا۔ اس دن مولے نے چوہے کی بجائے کتے پر ہی اپنی لاٹھی دے ماری۔

وہی چوہا اس وقت مولے کے سامنے تھا۔ حالانکہ بے حد لمبی دوڑ کی وجہ سے مولے بری طرح ہانپ رہا تھا لیکن اس چوہے کو یک ایک اپنے سامنے پا کر وہ اپنی حالت بھول گیا۔ آج وہ نہتا تھا اور بنا کسی ہتھیار کے ہی اس چوہے کو مار دینے کا فیصلہ اس نے فوراً کر لیا تھا۔ چونکہ کھیت جوت دیا گیا تھا اور کافی بڑا تھا، اس لیے چوہے کو بھاگنے کے لیے لمبا راستہ طے کرنا پڑتا۔

مولے نے دونوں ٹانگیں پھیلا کر کھڑے ہونے کی بھول نہیں کی تھی۔ اس طرح چوہے کو اپنی ٹانگوں کے بیچ سے نکلنے کی شک آمیز صورتِ حال پیدا ہونے نہیں دینا چاہتا تھا لیکن چوہا بھی بالکل اسی طرح بلا خوف کھڑا تھا گویا اسے اپنے بچ نکلنے کا پورا یقین ہو۔

یوں چوہے کے شکار میں مولے سب سے چالاک تھا۔ شکار کے وقت وہ خود بھی ایک قد آور متشدد چوہا بن جاتا تھا۔ بلکہ اس کے آگے کے دانت چمکنے لگتے تھے اور اس وقت ایک نظر نہ آنے والی دُم بھی اس کے پیچھے کی طرف ریڑھ کی ہڈی کے نچلے سرے پر مروڑ کھاتی ہوئی اُگ آتی دیکھی جا سکتی تھی۔ عام طور پر ایک موٹی رسی کے سہارے کمر سے لے کر جسم کے پوشیدہ حصوں تک کو ڈھکنے کے لیے بالشت بھر چوڑا جو میلا کپڑا وہ پہنتا تھا، وہ بھی ایک خاص زاویے سے پھڑکنے لگتا تھا، گویا اس میں جسم کی نسیں پیدا ہو گئی ہوں۔

مولے ایک عرصے سے یہی کام کر رہا تھا۔ بڑی ندی کی طرف بہنے والے نالے کے بے حد اوبڑ کھابڑ کنارے کی زمین کا وہ ایک طرح سے ماہر ہو گیا تھا اور وہاں کے کھیتوں کے بارے میں اس کی جانکاری کھیت کے مالکوں سے کچھ زیادہ ہی تھی۔ وہ بڑی آسانی سے بتا سکتا تھا کہ کس کھیت کے کنارے پر ہموار ہے اور کس کنارے پر بار بار بند کیے جانے کے باوجود ہر بارش میں تیار ہو جانے والا گڈھا ہے۔

حالانکہ وہ ان میں سے کسی بھی کھیت کا مالک نہیں تھا، لیکن مالکانہ حق کے ساتھ ہر کھیت میں جاتا تھا اور کھیتوں کے مالکوں سے کچھ زیادہ ہی لگاؤ اسے ان سے ہو گیا تھا۔ ان کھیتوں میں چوہوں نے

پتلی سرنگیں بنا رکھی تھیں۔ بے حد موٹے موٹے وہ چوہے کسی بلی سے کم نہیں تھے۔ کھیتوں میں پیدا ہوئے اناج کے دانوں کو اکثر وہ بالیوں کے ساتھ اپنی سرنگوں میں کھینچ لے جاتے تھے اور اس طرح سرنگ کے اندر کافی مقدار میں اناج محفوظ کر لیتے تھے۔ اس اناج کو اکٹھا کرنا ان کا پیدائشی حق تھا اور یہ کام وہ حیثیت سے مالک کی پوری جانکاری میں بڑے اطمینان سے کرتے تھے۔

اپنی سینہ زوری سے سمیٹا کیے گئے اس اناج سے کھیت کا مالک عام طور پر ہاتھ دھو بیٹھتا تھا، لیکن چند لوگ تھے جن کی نظر میں چوہوں کے اس اندھیرے کے خلاف کام جاری تھی۔ ان لوگوں کے کوئی گاؤں نہیں تھے۔ بستی بھی نہیں تھی۔ [illegible] گاؤں یا بستی کی ترتیب کی [illegible] سماجی نظام کا احساس ہوتا ہے وہ بالکل ہی نہیں تھا۔ جس چیز سے مدر مکھس روزانہ رات گزارتے تھے اسے عام طور پر جھونپڑی بھی نہیں کہا جا سکتا۔ بس وہ لوگ وہاں آس پاس چھپے رہتے تھے جیسے بارش میں کیڑے پھیل جاتے ہیں۔

غریبی جیسے لفظ سے جس چیز کا احساس شہر میں رہنے والے آدمی کو ہوتا ہے وہ ان لوگوں سے پوچھ ڈھونڈنا مشکل کام ہی ہوگا۔ [illegible] غریب ہونے یا کسی سے غریب [illegible] ان کا [illegible] قریب نہیں [illegible] وہ [illegible] خوشی [illegible] دیتے تھے۔ [illegible] وقت [illegible] اور [illegible] ہوتا تھا [illegible] آسمان [illegible] موسم [illegible] عورت اور [illegible] کی چیزوں [illegible] سمجھ [illegible] باتیں کرتے رہتے تھے۔ موسے نے [illegible] چوہوں کی [illegible] تھیں [illegible] میں بھی [illegible] چوہے [illegible] اناج ہاتھ آیا تھا [illegible] کرنے ہونے میں [illegible] میں [illegible] چوہوں [illegible] میں [illegible] بھی [illegible] اس کا خیال تھا [illegible] ہم سے چوہے ہی مار پاتا تھا۔ موسے کو اس بات پر بھی غصہ آتا تھا [illegible] چوہے مارنے میں کامیاب ہو جاتے۔

[illegible] میں [illegible] بالکل [illegible] تھی [illegible] سے [illegible] سے تھے [illegible] بھی نہیں تھا۔ [illegible] بات کو [illegible] ہوتا تھا۔ [illegible] وحشت وہی باپ [illegible] رہتا تھا [illegible] کی بات پر

گالی سننے کے بعد تو باپ لگ بھگ کسی بوڑھے چوہے کی طرح کھانے میں مصروف ہو جاتا تھا۔

یہ عجیب بات تھی کہ موسے کو اکثر اپنے باپ اور اس باغی چوہے میں بہت کچھ ایک جیسا لگتا تھا۔ سب سے پہلے تو، کسی چیز کو اس کا باپ کھانے کی بجائے کترتا تھا۔ بھلے ہی اپنی داڑھیں کمزور ہونے کی وجہ سے وہ ایسا کرتا ہو، لیکن اس سے وہ چوہے جیسا لگنے لگتا تھا۔ پھر اس کی آنکھیں بھی لوہے کے چھرّوں کی طرح ابھری ہوئی اور دیر تک بنا پلک جھپکے گھور سکنے والی تھیں۔ سب سے بڑی بات تو یہ تھی کہ اس کا باپ اکثر چوہا مارتے وقت یا اس کا سوراخ کھوجتے وقت چاروں ہاتھ پیروں پر چلتا تھا۔

وہیں سے موسے نے اپنے باپ کا مقابلہ ایک چوہے سے کرنا شروع کر دیا تھا، بلکہ اکثر وہ اسے چوہا ہی سمجھ بیٹھتا تھا۔ موسے کو یاد ہے، ایک بار وہ باپ کے ساتھ چوہوں کی ایک بستی پر حملہ کرنے گیا تھا۔ لاٹھی کے علاوہ پتلے ٹھوس بانس کو آگے کی طرف نوکیلا کر کے بنایا گیا بھالے کی شکل کا ایک ہتھیار بھی اس کے پاس تھا۔ چھید میں گھسے چوہے کو اس ہتھیار کی مدد سے وہ آسانی سے مار لیتا تھا۔ چوہے کے سوراخ کو کسی پھرتیلے چوہے کی طرح پنجوں کے سہارے ہی کھودتے اپنے باپ کو دیکھ کر جانے کیسے اس کے جی میں آیا تھا کہ اس نوکیلے ہتھیار کو وہ اس کی پسلی میں گھسا دے۔

جہاں تک موسے سوچ سکتا تھا، اس کی یہ لڑائی تب سے چلی آ رہی تھی جب سے اس نے چوہوں کے خلاف لڑائی شروع کی تھی۔ شاید باپ کی لڑائی اپنے باپ سے بھی اسی طرح ہوتی رہی ہو گی۔ شاید چوہوں اور چوہوں کے ان دشمنوں میں کچھ باتیں خاصی ایک جیسی رہی ہوں۔ جس طرح چوہوں میں خون کے رشتوں کا کوئی مطلب نہیں رہا ہے، ویسے ہی ان میں بھی نہیں تھا۔ ہر چوہے کو دوسرے چوہے میں اپنا دشمن یا حریف دکھائی دیتا تھا اور ان لوگوں میں بھی۔ چوہے کا سوراخ کھوجنے تک وہ لوگ ایک دوسرے کے مخالف تھے، لیکن گپھائیں کھود کر اپنا شکار نکالنے تک ان کے آگے کے دانت لمبے ہونے شروع ہو جاتے تھے، ان کے جسموں پر بھورے بالوں کا کمبل اُگ آتا تھا اور ان کی ریڑھ کی ہڈی کے نچلے حصے میں مروڑ کھاتی ہوئی نظر آنے والی پونچھیں اگنے لگتی تھیں۔

مگر اس وقت صورت حال بالکل الگ تھی۔ موسے موسے تھا اور وہ چوہا اس کا شکار نہیں، صرف ایک دشمن تھا، اور موسے کے خیال میں اس نے چوہے کو گھیر لیا تھا۔

چوہا اس طرح اچانک اسے مل جائے گا، اس کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ جس طرح کے دہشت کے لمحات سے وہ گزر رہا تھا، اس میں اس کا دھیان اس طرف جاتا ہی نہیں اگر وہ اس کی ایک لمبے عرصے کی 'عداوت' ہی نہ ہوتی۔

وہ جس دنیا کا آدمی تھا، اس کے لیے یادداشت بے معنی سی چیز تھی۔ کیونکہ اکثر آدمی کے لیے یادداشت تاریخ کی ایک ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے لیے تاریخ کا بھی وجود نہیں تھا۔ صحیح کہا جائے تو موسے اور اس کی ذات کے ان تھوڑے سے لوگوں کے لیے وقت کی ماضی، حال اور مستقبل میں تقسیم کے کوئی معنی نہیں تھے۔ احساس بھی نہیں، وہ صرف جینے کا ایک عمل بھر تھے۔

اس دن چوہوں کے سوراخ کو کئی گھنٹوں کی محنت کے بعد کھودنے پر اسے گیہوں کا اچھا خاصا ڈھیر اکٹھا کیا ہوا دکھائی دیا۔ وہ ڈھیر اتنا بڑا تھا کہ اس کے لیے ادا کی ہوئی نوکری بھی ناکافی ہی تھی۔ اسی بیچ موسے نے گنگارام کی آواز سنی: ''کون ہے رے؟ کیا کر رہا ہے؟''

یہ کھیت کے مالک کی آواز تھی جسے پہچاننے میں موسے سے غلطی نہیں ہوئی۔ گھبراہٹ میں کافی گیہوں مٹی میں دوبارہ بکھر آ گیا۔ وہ گھگھیایا: ''میں ہوں سرکار، موسے۔''

اس طرح برآمد کیے گئے گیہوں پر عام طور سے کھیت کا مالک اپنا حق چھوڑ دیتا ہوتا ہے اور اس پر برآمد کرنے والے کا حق مانا جاتا ہے۔ لیکن ایک ساتھ اتنا گیہوں دیکھ کر گنگارام کو چوہوں سے زیادہ موسے پر غصہ آنے لگا۔ ''کہاں لیے جا رہا ہے اِبے، کہاں لیے جا رہا ہے؟ تیرے باپ کا گیہوں؟''

''ہیں سرکار...'' موسے کا باپ گھبرا کر ایک دم کھڑا ہو گیا لیکن موسے نہیں اٹھا۔ اس نے نوکری بھی نہیں چھوڑی۔

''بے حرامی کے بچے، چوری کرتا ہے؟'' گنگارام پھر دہاڑا۔ عام طور پر ایسے آدمیوں سے جو گھر بنا کر رہتے ہوں، کپڑے اور جوتے پہن سکتے ہوں اور اپنے لیے بنائے گئے بازار میں پیسے دے کر اپنی پسند کی چیزیں، چاہے وہ گڑ ہی کیوں نہ ہو، خرید سکتے ہوں، ڈرنا موسے جیسے لوگوں کے لیے فطری بات تھی۔ دراصل وہ چوہے اور آدمی کے بیچ کی کوئی چیز تھے، جو آدمیوں سے ڈرتے تھے لیکن چوہوں کو ڈراتے تھے۔

''میں تو... میں تو کہہ رہا تھا سرکار، تھوڑا بہت ہوتا تو دوسری بات تھی، یہ تو بہت زیادہ ہی

چوہوں نے اکٹھا کرلیا تھا... تھوڑا بہت ہوتا تو بات تھی، میں تو کہہ رہا تھا...'' ہڑبڑاتا ہوا موسے کا باپ پیچھے ہٹا۔

گنگا رام کا حوصلہ اور بڑھ گیا۔ ''چور سالا!''

''میں پہلے ہی کہہ رہا تھا اس سے۔ سور مانا ہی نہیں، سمیٹنے لگ گیا۔'' باپ اپنے آپ کو بچانے کے لیے انجانے ہی گنگا رام کی طرفداری کرنے لگا۔

''مگر... مگر میں نے تو یہ کھود کر نکالا ہے... سبھی نکالتے ہیں...'' موسے نے کسی طرح تھوک نگلتے ہوئے کہا۔

''اب کھود کر گاڑ دوں گا تجھے۔ اٹھ!'' گنگا رام نے اپنے ہاتھ کی لاٹھی کا موٹا والا سرا موسے کی کمر میں اڑا کر طاقت لگا کر اسے پیچھے دھکیلا۔ موسے نے محض عادتاً دلچسپی سے بنائی اور ہمیشہ ہاتھ میں رہنے والی، چوہے کو چھیدنے کے کام آنے والی لمبی چھڑی گرتے گرتے ہاتھ میں تھام لی۔ عادت کی وجہ سے کی گئی صرف اسی حرکت نے اس کے بعد ایک بھاری ہنگامہ پیدا کر دیا۔

گنگا رام دہشت زدہ ہو گیا۔ اس نے ایک بار دور دور تک پھیلا سناٹا دیکھا اور پھر اپنے نوکیلے ہتھیار کی طرف بڑھتا ہوا موسے کا ہاتھ اور یکایک چیخ پڑا۔ ''ارے، دوڑو رے، مار ڈالا...'' چیختا ہوا وہ گاؤں کی طرف بھاگا۔

یہ بھی عجیب بات ہے کہ کچھ لوگ صرف اس لیے خطرناک دکھنے لگتے ہیں کہ ان کے پاس سونے کے لیے گھر نہیں ہوتا اور حجامت کے لیے استرا بھی انھیں نہیں مل پاتا۔ چونکہ وہ کپڑے بھی نہیں کے برابر پہنتے ہیں، اس لیے سماج دشمن عنصر لگنے کے پورے امکانات ہوتے ہیں، اور لوگ ان کی تصویر کشی پر بڑی آسانی سے یقین کرنے لگتے ہیں۔

گنگا رام کے بھاگ جانے کے بعد موسے ڈر گیا۔ اس کا باپ گنگا رام سے پہلے ہی غائب ہو چکا تھا۔ اتنا احساس موسے کو ہوا کہ اسے جلدی ہی وہاں سے ہٹ جانا چاہیے۔ اناج وہ چھوڑنا نہیں چاہتا تھا اس لیے جتنا ممکن ہوا اتنا ٹوکری میں بھرا اور مارے گئے دو چوہے اس نے کمر کی رسی سے لٹکا لیے اور چل پڑا۔

وہ ماحول بہت عجیب تھا اور یقینی طور پر خونخوار لوگوں کی بستی والا تھا۔ اندھیرے میں چپٹی زمین

Scanned with CamScanner

اور دھند کے سے پٹے آسماں کے نیچے، بنا کسی روشنی کے، وہ لوگ بجتے ڈھتے اپنا کام کر رہے تھے اور اس کے ساتھ کے ڈرپوک مریل سے کتے تھوڑی دور سے چیختے سیاروں کی آواز میں اکثر پکی آوازیں ملانے لگتے تھے۔ چونکہ ان لوگوں کی بستی شہر نہیں تھی، اس لیے اتنے نزدیک آ جانا موت کی وجہ نہیں بنے گا، یہ سیار بھی جانتے تھے۔

گنگا رام اور اس کے ساتھی اپنے ساتھ لالٹینوں اور مشعلوں کے علاوہ بیٹری سے چلنے والی بتیاں بھی لائے تھے۔ یہ لوگ طرح طرح کے ہتھیاروں سے لیس ہو کر چلے تھے، گویا وہ کسی خطرناک اور ازمنۂ وسطیٰ کی جنگ کے لیے نکلے ہوں۔

گنگا رام اور اس کے ساتھی گاؤں والوں کو دیکھ کر اندھیرے میں بجتے ڈھتے مانس یکدم خاموش ہو گئے۔ سہم گئے۔ گاؤں والوں کی وہ بھیڑ تیزی کے ساتھ، لگ بھگ بندوق کی مستعدی سے ان لوگوں کے بیچ گھسی۔ وہ اپنے ہتھیاروں کو اٹھائے ہوئے جس طرح چوکنا ہو کر آگے بڑھ رہے تھے اس سے وہ مضحکہ خیز ہی لگ رہے تھے۔ یہ معلوم ہو رہا تھا گویا وہ کہانیوں اور جھاڑیوں میں چھپے خونریز لڑاکوں کا نشانہ لینے والے ہوں۔ ان میں سے شاید ہی کوئی بہادر ہو، لیکن جن کے بیچ وہ اپنا شکار کھوجنے آئے تھے ان کے مقابلے میں تھوڑے بہتر وسائل اور بہتری کے احساس کی وجہ سے وہ جنگجو بن گئے تھے۔

سونے نے انھیں آتے دیکھا۔ دور سے مستقبل کے بارے میں وہ ضرور اندھا تھا لیکن اتنے نزدیک ہی خطرہ ظاہر ہونے کا احساس، ٹھیک ویسے ہی ہو گیا جیسے ان کے قدموں کی آہٹ سے بڑے چوہے بھاگ جاتے تھے۔ آنے والی مصیبت نے اس کی رگوں میں اپنے ناخن گاڑ دیے اور اٹھ کر کھڑے ہوتے وقت اسے اپنی ٹانگیں بے حد کمزور معلوم ہوئیں۔

"چور... چور... پکڑو!" گنگا رام ہاتھ کی بیٹری والی بتی کی روشنی اس کے چہرے پر ڈالتا ہوا چیخا۔ چیختے وقت وہ خود بھی گھبرا رہا تھا کیونکہ اس کی آواز بہت واہیات ڈھنگ سے پھٹ گئی تھی۔

سونے نے ادھر اُدھر دیکھا۔ اس کا باپ اسی کے قریب بیٹھا ہوا، چوہوں کی کھالیں اتار رہا تھا۔ وہ بیٹھے بیٹھے جانور کی طرح ہی پیچھے کی طرف کھسکا۔ کھسکنے کے بعد عجیب آواز میں بھنبھنایا، "میں تو پہلے ہی کہہ رہا تھا... میں نے پہلے ہی کہہ دیا تھا..."

گنگا رام کی للکار پر اسے پکڑا کسی نے نہیں، ہاں بیٹری والی بتی کی ڈنک مارنے والی روشنی کی وجہ سے پیدا ہوئی اندھیرے کی گپھا سے ہاتھ بڑھا کر کسی نے اس پر لاٹھی چلائی۔ لاٹھی مارنے والا تو بے حد اشتعال میں تھا یا پھر ڈرا ہوا تھا۔ لاٹھی مولے کے کندھے کو چھیل بھر سکی۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ اسے جان سے مار دینے والی آوازیں پیدا ہوئیں۔ انھیں سن کر وہ بنا کچھ سوچے پلٹ کر بھاگا۔

یہاں اس نے تھوڑی سی غلطی کی۔ اگر اپنے دشمن اس چالاک چوہے کی طرح جھک کر اس نے لوگوں کی ٹانگوں سے نکل بھاگنے کی کوشش کی ہوتی تو لوگ خوفزدہ ہو کر بھاگ ہی کھڑے ہوتے۔

جس وقت وہ بھاگ رہا تھا اسی وقت کسی نے آواز لگائی: "جانے نہ پائے، پکڑو!"

اسی بیچ بھاری پتھر یا کلہاڑی جیسی کوئی پھینک کر ماری گئی چیز اس کے کولھے سے ٹکرائی۔ ٹکرا کر گر بھی گئی لیکن مولے اس چیز کے ٹکرانے کا درد کولھے پر دبا کے بھاگتا گیا۔ اس کے پیچھے بھاگنے والوں کو اس وقت سب سے زیادہ پریشانی لالٹینوں کی وجہ سے ہو رہی تھی۔ حالانکہ مولے کو بھاگنے کے لیے لالٹین کی ضرورت نہیں تھی اس لیے وہ کافی اچھی طرح سے بھاگ رہا تھا۔ لیکن اتنی بڑی بھیڑ نے آخر نالے کے قریب پہنچتے پہنچتے اسے دھر ہی لیا۔

مولے رک گیا۔ وہ جانتا تھا اب اس کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ وہ رکا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ سامنے کی طرف پھیلائے اور لگ بھگ بھربھرا کر گھٹنوں کے بل گر گیا۔ اسی وقت آگے بڑھ کر کسی نے ایک لمبی سی لاٹھی ماری۔ وہ لاٹھی آدھی مولے پر اور آدھی زمین پر پڑی۔ اس کے بعد کئی لاٹھیاں ایک ساتھ گریں۔ مولے پہلی لاٹھی کے بعد ہی زمین پر پڑے پڑے گٹھری کی طرح گر گیا۔

تبھی کسی نے قانونی سمجھداری دکھاتے ہوئے کہا: "سنبھال کے رے، دفعہ تین سو دو بنتی ہے۔"

"ہاں، تین سو دو نہ بننے پائے،" گنگا رام نے بھی کہا۔

"اندرونی چوٹ مارو، اندرونی۔ ضرب خفیف ہوگا،" اسی قانون باز نے پھر کہا۔

ایسا ہوتا ہے چور ... گاؤں کی عورتیں اور ڈرے ہوئے بچے بڑی رات تک نیم کے پیڑ سے ساتھ بندھے مولے کو دیکھنے آتے رہے۔ باندھنے کے بعد چونکہ اسے پیٹنا کمزور سے کمزور آدمی کے لیے بہت آسان تھا، اس لیے لگ بھگ ہر کسی نے اسے پیٹ لیا تھا۔ بلکہ کئی لوگ اس بات کی

ثابت کرنے لگے تھے کہ وہ کتنی سخت جان ہے۔

اس کے جسم سے بہتے ہوئے خون اور چہرے کی سوجن نے اسے گاؤں والوں کے لیے پرانے قصوں سے نکلا سماج دشمن بنا دیا تھا۔

اگلے روز گاؤں میں پولیس کے لوگ آ گئے۔ ان میں سے ایک سب سے بڑا حوالدار لگ رہا تھا۔ ڈکار لیتا رہتا تھا۔ اسے دیکھ کر اس نے ڈکار لیتے ہوئے کہا، "ہاں، تو یہی ہے وہ حرامی! میں تو پہلے ہی سمجھ گیا تھا۔"

"یہی ہے صاحب!" جوان نے ڈکار لے کر لوٹتے ہوئے حوالدار کے پیچھے سے کہا۔

حوالدار نے پیچھے گھوم کر ڈکار لی اور بولنے والے کو گھورا، وہ سہم کر چپ ہو گیا۔

ایک سپاہی غرایا، "تم سے کس نے کہا بیچ میں بولو؟ ہم تفتیش کر رہے ہیں۔"

دوسرا سپاہی زیادہ ہی عقلمندی دکھانے کی کوشش کرنے لگا۔ "یہ شاطر لگتا ہے۔ اس کی تو بہت سے معاملوں میں تلاش ہوگی۔ تفتیش..."

"تفتیش وفتیش مت سمجھاؤ۔ اب اس کو لے چلو،" حوالدار نے کہا، پھر ڈکار لی۔

سپاہی اور حوالدار اس کے ساتھ ایک چھوٹی سی ٹیم لے کر تھانے کی طرف چل دیے۔

کسی نے کہا، "ہوشیار رہیے گا! یوں بھی، اس کے پاس اسلحہ ہو سکتا ہے۔"

"اسلحہ یا کوئی چیز ہو سکتا ہے اپنے لنگوٹے میں،" ایک اور بولا۔ پھر کچھ یاد کر کے اس نے جوڑا، "ایسے خطرناک مجرم پرچیاں بھی رکھتے ہیں۔"

"پرچیاں؟" پہلے نے پوچھا۔

"ہاں پرچیاں، سیاسی پرچیاں۔"

"یہ کون سیاست بگھار رہا ہے؟" ڈکار لے کر حوالدار نے گھرکا۔

بہر حال، اب وہ لوگ تھوڑے فاصلے سے چلنے لگے تھے اور تھانے تک کا لمبا راستہ خطرناک ڈاکوؤں اور قاتلوں کے قصے سنا کر طے کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

ان قصوں میں ایک طرح کی مسابقت بھی تھی۔ ہر کوئی اپنے قصے کو کسی دوسرے سے کم خطرناک

Scanned with CamScanner

محسوس کر کے دوسرے سے چڑ جاتا تھا اور اس زیادہ خطرناک قصے کو ناقابلِ یقین ثابت کرنے پر آمادہ ہو جاتا تھا۔ اس میں خاصا تناؤ بھی پیدا ہوتا جا رہا تھا۔

تھانے پر ان لوگوں کو باہر بیٹھا دیا گیا اور سپاہی 'کلنگ کی جنگ کے فاتح' سپہ سالار کی طرح موسے کو لیے اندر چلے گئے۔

تھانے کی بے حد گندی کوٹھڑی میں بند ہونا موسے کے لیے ایک عجیب تجربہ تھا۔ اپنے ہوش میں اس نے اتنی صاف ستھری، پکی دیواروں اور چھت والی جگہ میں قدم نہیں رکھا تھا کیونکہ وہاں چاروں طرف سے بدبو آ رہی تھی۔ مٹی کوڑے کو مہینوں سے صاف نہیں کیا گیا تھا۔ وہ سب اُسے اچھا ہی لگتا رہتا مگر گھٹنے کے درد سے چڑچڑائے بدمزاج داروغہ نے اسے ناحق پٹوایا نہ ہوتا۔ اسے معلوم تھا کہ یہ پٹائی تو داروغہ نے محض رسمی طور پر ہی کی تھی اور باقاعدہ تکلیف دیے جانے کا سنہری موقع اس نے کسی بعد کے لیے ٹال رکھا تھا۔

دوپہر کے قریب ایک سپاہی نے اس کی کوٹھڑی کا دروازہ کھولا اور پلٹ گیا۔ ٹھیک اسی مکار چوہے کی طرح سپاہی کی ٹانگوں کے بیچ سے بے حد تیزی سے وہ نکلا۔ اسے کسی سور کی طرح اپنی طرف آتے سپاہی نے دیکھ لیا تھا۔ چونکہ وہ ٹانگوں کے بیچ سے نکلا تھا، اس لیے موسے نے سپاہی کا جسم تھوڑا اوپر ہوا اور دھم سے نیچے گرا۔ وہ چلّایا: ''ارے مار ڈالا۔''

دو لمحے بعد ہی موسے تھانے سے باہر جھاڑ جھنکاڑ کی طرف بھاگ رہا تھا۔

گرا ہوا سپاہی بے حد پریشان ہو گیا۔ اسے لگا، داروغہ اس کی جان ہی لے لے گا کیونکہ بھاگتے وقت مجرم نے اس کی ٹانگوں سے نکلنے کی بدتمیزی کے علاوہ اسے ایک خراش بھی نہیں لگائی تھی۔ وہ ڈر گیا کہ داروغہ سب سے پہلے تو یہی پوچھے گا کہ وہ اپنی ٹانگیں سمیٹ کر کیوں نہیں کھڑا ہوا تھا۔

بے حد لمبی دوڑ کے بعد موسے نے محسوس کیا کہ اس کے پیچھے کوئی نہیں آ رہا ہے۔

تب اس نے تھوڑا سا ٹھہر کر لمبی لمبی سانسیں لینی شروع کیں۔ یہاں سے اسے نئی دوڑ شروع کرنی تھی۔

ٹھیک اسی وقت اس کی نگاہ اس مکار چوہے پر پڑی جو مونچھیں مٹکاتا ہوا چمکیلی آنکھوں سے اس کے بھاگنے کی گواہی کا اعلان کر رہا تھا۔ وہ بھاگنے کی بجائے ایک دم ٹھہر گیا۔

Scanned with CamScanner

موسے کے پاس اس وقت اس کا ہتھیار نہیں تھا۔ لاٹھی بھی نہیں تھی۔ وہ عام طور پر چوہے کے شکار کے وقت غصے میں نہیں آتا تھا، بے حد صبر کے ساتھ وہ اپنی کارروائی کرتا تھا۔ لیکن ابھی وہ زخمی اور چوٹ کھایا ہوا تھا۔ جسم سے خارج ہونے والے پسینے کی وجہ سے اچانک ایک شرارت کی طرح اس کے اندر غصہ بھر گیا۔ موسے نے اپنی آنکھیں میچ لیں۔ اسے یاد آیا کہ چوہا اس کا باپ کیوں اسے دکھائی دیتا ہے۔

پتہ نہیں کتنی دیر دونوں اسی طرح ایک دوسرے کے سامنے رہے ہوں گے۔ لیکن جب موسے نے اپنی آنکھیں کھولیں تو اس نے پہل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

ایک بھدی سی گالی دیتے ہوئے اس نے اپنے اور چوہے کے بیچ کا فاصلہ طے کیا۔ چوہا ڈھیلوں کے ڈھیر میں جا چھپا۔ لگ بھگ بجلی کی تیزی سے بے حد طاقت سے موسے نے ایک ڈھیلا چوہے پر پھینکا۔ دھوپ میں تپتی ہوئی کھیت کی مٹی بھربھری ہو گئی تھی۔ ڈھیلے کی چوٹ سے وہاں گرد کا ایک بگولا سا اٹھا اور موسے نے دیکھا، کوئی نقصان اٹھائے بغیر چوہا دوسری طرف بھاگ رہا تھا۔ موسے نے موقع کھو دیا تھا۔ اس کا پیچھا کرتے ہوئے وہ کھیت کے اس پار ڈھیلے پھینکتا رہا۔ تب چوہا اچانک پلٹ گیا اور موسے کی طرف بڑھا۔ موسے چونکا۔ اسے پتہ تھا کہ چوہا ڈھیلوں کے بیچ سے نکل کر اس کے پیروں کے پاس آ کر رکے گا۔ اور تبھی چوہے نے موسے کے سینے میں ایک بے بسی کی حرکت کر دی۔ تیزی سے جھپٹ کر وہ موسے کی ٹانگوں کے بیچ سے نکل گیا۔ وہ سخت بوکھلاہٹ سے پیچھے ہٹا اور تبھی اس نے جو کچھ دیکھا اس نے اسے ایک بار پھر ٹھٹک جانے پر مجبور کر دیا۔

اس کے قریب سامنے ایک درخت کے نیچے کھڑا ہوا اس کا باپ مسکرا رہا تھا۔ چوہے کی جگہ باپ کی موجودگی نے اسے حیرت میں ڈال دیا۔ باپ کے اس طرح اچانک ظاہر ہونے کا حادثہ موسے کے احساسات سے ٹکرایا اور اس میں یک لخت سمجھ میں آنے والی تبدیلی آ گئی۔

اس کا باپ چوہے میں بدل گیا تھا۔ چونکہ اب دونوں کے بیچ فاصلہ تھا، اس لیے اس کا باپ اس کے سامنے کھیت میں عجیب ڈھنگ سے اچھل اچھل کر چھپنے لگا۔

موسے نے دیکھا، باپ نے اپنے ہاتھ کے ڈھیلے سے ہتھیار کا وار کرنے کی تیاری کر لی ہے۔

ٹھیک اسی وقت موسلے کا پھینکا ہوا بھاری ڈھیلا اس کی کنپٹی سے ٹکرایا۔ شاید تکلیف یا گھبراہٹ کی وجہ سے باپ کے ہاتھ کا ہتھیار چھوٹ گیا اور وہ لڑکھڑایا۔ موسلے نے دوسرا ڈھیلا بھی چلا دیا۔ باپ بے ڈھنگے طریقے سے پیچھے ہٹنے لگا۔ آس پاس کا دھوپ سے تپا ہوا سناٹا کافی دور ہٹ کر اس جنگ کو دیکھنے لگا۔

ہاتھ کا ہتھیار اٹھانے کی جلد بازی میں باپ اپنی ہی ٹانگوں میں الجھ کر گر پڑا۔ موسلے نے اس صورت حال کا پورا فائدہ اٹھانے کے لیے باپ پر چھلانگ لگا دی۔ لگ بھگ اس کی کمر پر گھٹنوں کے بل بیٹھے بیٹھے اس نے ہاتھ کا بھاری ڈھیلا چلا دیا۔ وہاں بھد کی آواز ہوئی اور باپ کلکلانے لگا۔ اب وہ اپنی حفاظت کے لیے پوری طرح تیار ہو گیا تھا۔ کسی چوہے کی طرح ہی بدن مروڑ کر اس نے دونوں پنجوں سے موسلے کی پنڈلی پکڑی اور اپنے کمزور دانتوں سے کاٹنے لگا۔ دانت زیادہ گہرے نہیں گڑے تھے لیکن پنجوں کو پنڈلی سے چھڑانے کی کوشش میں اس کے ناخنوں نے کافی کھال کھرچ دی تھی۔ درد سے موسلے دانت کچکچانے لگا۔

باپ نے پنجے بڑھا کر اس کی دوسری پنڈلی بھی پکڑ لی۔ موسلے کو لگا، اس کا شکار زیادہ ہی خونخوار ہو اٹھا ہے۔ اپنی پنڈلیوں اور کمر سے لپٹتے جاتے آدمی سے چھوٹنے کی کوشش میں وہ خود بھی ڈھلک کر گر گیا، لیکن اب اس نے پھرتی کے ساتھ باپ کے ہاتھ سے گرا نوکیلا ہتھیار اٹھا لیا۔ باپ نے اسے اپنی طرف آتے نہیں دیکھا۔ مضبوط پتلے بانس کی تیکھی نوک اس کے کمر کے پاس کے گوشت میں آسانی سے دھنس گئی۔ اسے کھینچتے وقت وہاں کھال کا ایک چھوٹا سا تمبو جیسا تب تک بنا رہا جب تک ہتھیار بدن سے باہر نہیں آ گیا۔ ہتھیار باہر آتے ہی پیلے اور گرد بھرے بدن پر گاڑھا سرخ خون تیزی سے پھیلنے لگا۔

باپ سمجھ گیا کہ اس کے ساتھ کیا ہو گیا ہے۔ لیکن اب کوئی راستہ نہیں تھا۔ اس نے پنڈلی کو چھوڑ کر گردن کو موڑتے ہوئے کمر کے پاس پھیلتے اس خون کو دیکھا اور اس کے دانت اور زیادہ کھل گئے۔ اس کا منہ حلق تک ایک گپھا کی طرح بن گیا۔ موسے کا دوسرا وار اس کے چہرے پر ہوا۔ شاید اسے وہ کھلا منہ سخت ناپسند تھا۔ اس کے بعد اس نے موقع نہیں دیا۔ دہشت سے بے جان ہوتے جسم کے پاس کھڑے ہو کر دونوں ہاتھوں سے وہ بار بار اس نوکیلے ہتھیار کو گھسانے لگا۔ ہر بار ہتھیار اتنی آسانی سے دھنس جاتا تھا کہ اسے ایک قسم کی گدگدی سی محسوس ہوتی تھی۔ کامیابی کی خوشی اور اس

گدگدی کی وجہ سے اس کی آنکھیں لگ بھگ مند گئی تھیں۔ تھوڑی دیر میں اس کا ہاتھ تھک گیا اور وہ جھنجھلاتے ہوئے بڑبڑانے لگا۔ اسے اپنی کوشش کی کامیابی کا احساس ہو گیا تھا۔ لمبی لمبی سانسیں لیتے ہوئے اس نے اپنی آنکھیں کھولیں۔

دھوپ کی چمک میں کمی اسے پہچاننے میں مشکل نہیں ہوئی۔ اس سے کافی فاصلے پر جو جھنڈ کی شکلیں کھڑی تھیں، وہ پولیس کے سپاہی تھے۔

''ہوشیاری سے، خطرناک ہے'' کسی سپاہی نے آواز لگائی۔

ہوا سے چھوتے ہوئے پیروں میں بدن کے الگ الگ حصوں کی تلاش میں ایک نئی حرارت تھی۔ کوشش سے مسکراتے ہوئے اس نے کہا: ''ارے نہیں صاحب، خطرناک نہیں ہے۔ تم جری نے کاٹ کھایا ہے۔ چپ چاپ کاٹتے بہت دور سے ہیں...'' کہہ کر وہ اپنی پنڈلی دیکھنے لگا۔

٭٭

مدرا راکھشس

ہندی سے ترجمہ: شہاب الدین گیلانی

سانچی بولو راجہ

موقعے پر وہ یہ بھی بتا سکتا تھا کہ اینٹھن یا کھنچاؤ میں کس چیز کا پھنکا لگانا چاہیے۔ اگر حکیم نہ سہی تو دشمول کے کاڑھے کا نسخہ باندھ سکنے والا عطار وہ ضرور تھا۔ اور خالی عطار ہی کیوں، ویدھوں کے منجن، چورن اور انجن کی ذیادہ کافی بیچ لیتا تھا۔ یہاں تک کہ ڈاکٹر لوگوں کی ٹنکچر آیوڈین، بورک پوڈر اور وائیڈ فارم جیسی چیزیں بھی گراہکوں کی ضرورت پر پیش کرنے کی وجہ سے اسے کھاسے کمپونڈر کا جوڑی دار مانا جا سکتا تھا۔ عورتوں کے بالوں کی خضاب کا مسالہ، بوڑھوں کی بیماریوں کی دوائیں اور چاٹنے کا ستو اور بچوں کے لیے مشہور مرے کارخانے والے بیسن جوس، بات بات میں سالے بھوئی بنانے والے پتے بازوں کے لیے تو کھیے پتنگیں، پڑھنے لکھنے والوں کے لیے کاغذ، قلم، پنسل، بابوؤں کے لیے لپٹن کی تکی چائے ... غرض کہ ہریش چند اپنے میں اکیلے ہی ایک خاصے اچھے گڑ بڑ جھال بازار کا کام دے جاتا تھا۔

دکان میں ہریش چند کے علاوہ اور کوئی بیٹھ بھی نہیں سکتا تھا۔ سارا سامان ٹھنسا پڑا تھا۔ ذرا چوکے کہ ناک تیل کے پیپے میں جا گھسی، پیٹھ پر سابودانے کی ہانڈی بھدا کے کے ساتھ آ گری، تنگ چھیدوں میں جھاڑو کی سینکیں گھس گئیں، ہاتھ کے پنجے میں چوک کا پتا، تجھا الجھ پڑا اور کالا کھلیدار کنکوا انگریزی ٹائی کی طرح گردن میں آ پڑا۔ مگر ہریش چند ایسا موقع کم ہی آنے دیتا تھا کیونکہ وہ ایسی صورت میں اپنے بچاؤ کی قطعی کوشش نہیں کرتا تھا، کیونکہ اسی وجہ سے وہ قیامت آتی تھی — پہلے ہی وہ

آٹے کے پیچھے سے مد، بدہو کر بھوت بن جائے۔

''ارے بھائی ہریش چند!'' سپاہی نے بچھونے کے اندر اپنا کولہا کھجاتے ہوئے آواز لگائی۔

''حکم کیجیے حوالدار صاحب۔''

''چائے کی پڑیا ہوگی نا؟''

''ہے تو، دے جاؤں آکر کیا؟''

''نہیں نہیں، میں خود آتا ہوں۔'' کہہ کر سپاہی اٹھنے کے لیے زور لگانے لگا۔

''آئیے ماسٹر صاحب، آئیے۔ کچھ حکم کیجیے۔'' ہریش چند نے شکوے سے پوچھنے میں کانٹا لگاتے ہوئے کھیسیں نکوس کر کہا۔

''جے رام جی کی بابو جی'' بڑے لڑکے نے اپنے کو بڑا ہونے کا احساس دلاتے ہوئے پیار۔ دوسرا لڑکا بھی ایک بار باپ کی طرف اور دوسری بار بھائی کی طرف دیکھ کر بولا: ''جے رام بابو!''

''جیتے رہو، جیتے رہو، شاباش!'' ماسٹر صاحب نے بچوں کو دعائیں دیں اور بولے، ''ارے بھائی، ذرا دو آنے کی شکر تو دینا۔''

''دو آنے کی؟ بابو جی، پوری پاؤ بھر تو لے جائیے۔ ویسے شکر میں میرا منافع نہیں فائدہ ہی ہے۔ مگر آپ جانتے ہیں، اتنے دنوں سے آپ کی خدمت میں ہوں۔ ایک پیسہ لوں گا مگر ایمانداری سے ہی لوں گا۔ اور بابو جی، آپ سے اب کیا بتاؤں، اصل میں برکت ایمان کے پیسے میں ہی ہوتی ہے۔'' اس نے اپنی بھری پری دکان پر ایک نظر ڈالی جیسے کہہ رہا ہو اگر یقین نہ ہو تو اس دکان پر میرے پیسے کی برکت کا پھل دیکھ لیجیے۔

ماسٹر جی نے اس کی ایمانداری پر یقین کیا۔ اس بیچ ان کا چھوٹا بچہ، جو سویٹر کی جیب میں ہاتھ گھسیڑے تھا، اس کبڑے لڑکے کو گھورتا رہا۔ باپ نے ٹوکا: ''بیٹا، ہریش چند کو نمستے نہیں کی!''

لڑکا کچھ نہیں بولا، چپ چاپ گھورتا رہا۔ ہریش چند نے بنا نمستے کے ہی دعائیں دینی شروع کر دیں۔ ''جیتے رہو، خوب پڑھو، بڑے ہو، ایں، ہو ہو ابھی بچے ہیں بابو جی!''

لڑکا تھوڑی دیر اسے گھورتا رہا، پھر بولا: ''میں بچہ نہیں ہوں۔ کھلونے نہیں کھیلتا۔''

بنیا ہو ہو کر کے ہنسا اور ترازو پر شکر چڑھانے لگا۔ سپاہی ایک سلیٹی رنگ کا لمبا چوڑا لبادہ اوڑھ

کر دکان پر آ پہنچا۔ بھاری بھرکم جوتوں میں اس نے نال ٹھکے کے ہی پاؤں گھسیٹ رکھے تھے، لہٰذا وہ
سڑک کوٹنے والے کسی اوزار جیسے دکھ رہے تھے۔ ماسٹر صاحب نے پیچھے ہٹ کر جگہ دیتے ہوئے
ادب سے کہا: ''اوہ، حوالدار صاحب، آئیے، آئیے۔ آداب عرض۔''

''آداب عرض، آداب عرض۔'' سپاہی نے سوت میں ترشی ہوئی مونچھیں سنوارتے ہوئے
کہا۔ وہ ایک معمولی سپاہی ہی تھا مگر اس کے بھاری بھرکم جسم کو لوگ حوالدار سے کم کہنے میں ہچکچاتے
تھے۔ اس کے حوالدار ہونے کے موقعے بھی آئے کیونکہ وہ پرانا اور وفادار آدمی تھا۔ مگر ابھی تک نہ تو
اسے پریڈ میں قدم ملانے کی مشق ہو پائی تھی اور نہ چست وردی پہننی۔ قدم ملانے کی کوشش میں وہ
نہ جانے کیسے ہمیشہ اگر دایاں پاؤں آگے بڑھاتا تھا تو داہنا ہی ہاتھ بھی نکالتا تھا اور یوں عجیب بے ڈھنگی
چال چلتا تھا۔ اپنا سب چوڑا اوورکوٹ اسے کافی پسند تھا۔ اسے پہن کر وہ پیچھے سے ایک بھاری گینڈے
کی شکل کا دکھتا تھا۔ یہ کوٹ اسے کافی پسند تھا۔ یہ کوٹ اس کے لیے بہت مبارک بھی ثابت ہو چکا تھا۔
اسے وہ برساتی کے طور پر بھی استعمال کرتا تھا اور آتے جاتے بھی پرینکا کو بھی اسی خول میں بندریا کی
طرح چھپا لیتا تھا۔ ایک دن وہ اسے اپنے اوورکوٹ میں چھپائے کہیں لیے جا رہا تھا کہ اس کے حلقے
کے افسر نے دھر پکڑا۔ نوکری سے تو نہیں نکالا گیا مگر ترقی رک گئی۔ تب سے اس نے بنی پرینکا کی
ناک کاٹنے کی ٹھان لی تھی اور وہ بھاگ کر دھوبیوں کی بستی میں رہنے لگی تھی۔ اس دن سے اس کی زبان پر
ایک غزل چڑھ گئی تھی جسے وہ کبھی قوالی اور کبھی رامائن، یہاں تک کہ ہنومان چالیسا کی طرز پر گایا کرتا تھا:

کیوں آگ لگائی جاتی ہے، کیوں درد بڑھایا جاتا ہے
کیوں ہم کو نشیلی آنکھوں سے، بیہوش بنایا جاتا ہے

'کیوں' کو وہ کبھی کبھی 'بھی' سے بدل دیا کرتا تھا۔ تالیاں دیتے جانے کے ساتھ گلے کو اس قدر بھینچتا
تھا کہ آواز ہیجڑوں جیسی بن جاتی تھی۔ کسی سے ملنے پر وہ اس کی خیریت ضرور پوچھتا تھا، لیکن جواب
کی امید کیے بنا ہی یا تو اپنی بات چھیڑ دیتا تھا یا سوکھی تار جیسی اپنی مونچھیں سنوارتا آگے بڑھ جاتا
تھا۔ ''ماسٹر صاحب، اور سب حال چال ٹھیک ہے؟'' اس نے پوچھا۔ ماسٹر صاحب بتانے لگے،
''ہاں، سب آپ کی مہربانی ہے...''

لیکن سپاہی بنا پوری بات سنے ہی ہریش چندر سے پوچھنے لگا: ''آج بال سنگھ نہیں دکھا؟''

لو وہ تو آ گیا۔ ماسٹر صاحب نے اشارہ کیا۔ سپاہی کی باچھیں کھل گئیں۔ وہ ذرا اترچھا ہو کر [illegible] مونچھ [illegible] ہونٹ کا ایک سرا اوپر [illegible] دبا کر مسکرانے لگا۔ [illegible] ایک نیا گانا سیکھ آیا تھا:

[illegible]

[illegible]

[illegible] آج [illegible]

[illegible] لگے ہیں۔ کیوں ماسٹر صاحب؟"

[illegible] اور کوئی موقع ہوتا تو وہ [illegible] راجہ؟"

[illegible] آئے ہائے اہوہوا!"

"[illegible] گدھا کہیں کا!" ماسٹر صاحب بڑبڑانے لگے۔

"وہ دیکھیے ماسٹر جی کیا ہوا؟" ایک صاحب [illegible] چھوڑتے ہوئے آگے بڑھے۔

ماسٹر صاحب بولے، ''کیا ہوا، ان چھوکروں کی بات کر رہا تھا۔ ایسے پاجی ہو گئے ہیں، ابھی سے اتنی گندی باتیں سیکھنے لگے ہیں۔ سوشل اسفیئر کا کیا کہا جائے۔''

''ارے ماسٹر صاحب، ابھی بچے ہیں، آپ سمجھ جائیں گے۔ اور بڑے ہونہار ہیں یہ صاحب۔''

برلش چند چھنانک بھر ہڈیوں کی پڑیا پینتا ہوا بولا۔ آنے والے صاحب مسواک کا ریشہ تھوکنے لگے تھے۔ بولے، ''آخر بات کیا ہوئی؟''

اس پر بابا سنگھ اپنے ہونٹوں پر زبان پھیر کر کہنے لگا، ''ہوا کیا، یہ گا رہے تھے: کہاں گنوائی ساری رین ہو، سانچی بولو راجا!''

سپاہی نے پھر زور سے ایک غیر ضروری ''ہو ہو'' کی۔

''کیوں بیٹا؟'' وہ صاحب بچے کے کندھے پر ہاتھ تھپکتے ہوئے نصیحت کرنے لگے، ''ایسی باتیں سیکھا نہیں کرتے نہ بیٹے۔ ہاں!'' لڑکا انھیں گھورتا رہا۔ ''ارے یہ کیا ہے صاحب...'' وہ مسواک چباتے کہتے گئے، ''ہم لوگوں کا بھی زمانہ تھا۔ سچ تھی بھلا ہم لوگ کبھی بری باتوں پر آنکھ بھی اٹھا دیں۔ غضب ہو جائے جی۔ گھر سے نکل کر کھیلنے تک پر نہیں آ پاتے تھے۔ تبھی تو دیکھیے، جعفری وغیرہ کا ایسا اچھا فلسفہ تھا کہ بس، اب آپ سے کیا کہوں اشلوک کے ٹھنے کے تمام کلسٹریاں پڑ گئے اس زمانے سے یاد تھے کہ بس آپ سے کیا کہوں۔''

''ارے اس زمانے کی بات ہی اور تھی۔ کہاں رہا اب وہ زمانہ اور کہاں رہی وہ تہذیب۔ ویدک عہد میں تو بچوں کو گروکلوں میں رشی لوگ پڑھاتے تھے۔ تب ان کا کردار بنتا تھا۔'' ماسٹر صاحب آسمان کی طرف تاک کر یوں ادا سے بولے جیسے یہ کوئی ان کے بچپن کی بات رہی ہو۔

''دیکھو بیٹا، اب مت گانا اس گندی بات کو۔ سمجھے؟ ہاں، بڑے اچھے لڑکے ہو تم۔ اس سے سیکھا تھا یہ گانا تم نے؟'' وہ صاحب پوچھنے لگے۔

'میں اچھا لڑکا ہوں۔ یہ گانا نوکا تی ہے،'' لڑکا چھاتی پھلا کر بولا۔

وہ صاحب چونک گئے۔ ''ہونہہ' یہ سب انھی بدذاتوں کی تعلیم ہے۔ پاجی کہیں کے!''

''تھے تو بیچ بہت برے ماسٹر صاحب۔ میں کہتا ہوں، وہ لوگ اتنے برے تھے کہ اب آپ سے کیا کہوں۔ آپ خود جانتے ہیں... اگر وہ محلے میں تھوڑے دن اور رہ جاتے... بس یک

Scanned with CamScanner

[illegible]

[illegible] ہمارے لیے کیا ہوتا؟"

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]
کہنا نہیں مانو گے؟"

"نہیں۔"

[illegible]

"آئے گی۔ بابو جی کہتے تھے۔"

"او، بابو جی تمھیں جھوٹ کہتے تھے۔"

"جھوٹ؟ نہیں! آئے گی۔"

"اونہوں! پوچھ لو بابو جی سے۔"

"ہاں رے" وہ ڈپٹے۔ "اب تو بڑا شریر ہوتا جا رہا ہے۔ مگر جانتا ہے، اب ماتو کبھی آئے گی ہی نہیں۔ میں نے اسے محلے سے نکلوا دیا ہے اور اس کی حرافہ ماں کو بھی۔ سمجھا؟ گدھا کہیں کا!"

لڑکا گھورتا رہا۔ پھر بولا، "کیوں؟"

"سور کہیں کا! ادھیڑ دوں گا تجھے!" ماسٹر صاحب نے زور سے ڈانٹا۔ لڑکا روہانسا ہو کر ایک طرف چل دیا۔ اس بیچ بنیا اکڑوں ہو کر ان کی باتیں سننے لگا تھا۔ سپاہی بل سنگھ کو فس فس کرتا رہا تھا کہ اس کی جورو اس سے کتنا پیار کرے گی۔

ماسٹر صاحب بولے، "اب یہ بڑا ضدی ہوتا جا رہا ہے۔ کسی دن اٹھا کر پٹک دوں گا۔ ایک آدھ ہاتھ پیر ٹوٹ جائے گا بس!"

ہریش چند نے موقع تاڑ کر ہمدردی جتائی۔ "ارے ماسٹر صاحب، بچے ہیں..."

وہ صاحب کہنے لگے، "ارے ہاں ابھی عمر ہی کتنی، مگر بھئی، بات تو یہ ہے کہ تاڑنا تو ابھی سے ضروری ہے۔ بھئی، ضد تو ہمیں بھی قطعی ناپسند ہے۔ ہم تو اسے ذرا بھی برداشت نہیں کرتے۔ ایک دن میرا بچہ ضد پکڑ گیا: مجھے اپنے ہاتھوں سے کھلاییے۔ آخر کھا کر ہی مانا۔ میں نے اسے کافی ڈانٹا۔ کہا، تم کیا ابھی دو برس کے بچے ہی ہو؟"

اس پر بات چیت آج کل کی تعلیم پر چل پڑی۔ سپاہی نے اپنے تجربات سنائے... کیسے ایک بار اسکول جانے میں اسے دیر ہو گئی تھی تو مولوی صاحب نے اس کی ٹانگ پر ڈنڈا دے مارا تھا۔ ن کا نشان ابھی کہیں ہوگا، اس نے کہا، پر کھوجنے پر وہ ملا نہیں۔ سب بات کی بات پر لوگوں کو ہنسی آئی۔ سپاہی اپنے کو بڑا حاضر جواب سمجھتا تھا، گو کہ اس نے مذاق پر اس لیے ہنسی آ سکتی تھی کہ اسے مذاق کرنا یا ڈھنت جواب دینا نہیں آتا تھا۔ ماسٹر صاحب نے بتایا، "وہ زمانہ ہی اور تھا۔ سنسکرتی سبھیتا ہی اور تھی۔ تبھی تو بھیشم جیسے برہمچاری اور بہادر بیٹے پیدا ہوتے تھے۔ اگر زمین پر لات مار دیں تو پانی نکل آئے۔" اس بات کے امکان کو ثابت کرنے کے لیے انھوں نے زمین پر موٹے تلے والے جوتے کا پاؤں بھی پٹکا، گو کہ پانی نہیں نکل سکا۔ تب باتیں بہادری پر اتر آئیں۔ سردار نے فتح سنگھ، زورآور سنگھ کے دیوار میں چنے جانے کا قصہ سنایا۔ بتانے لگا، "جب دیوار چنتے چنتے چھوٹے کی گردن تک آ گئی تو بڑا رونے لگا۔ چھوٹے بھائی نے پوچھا، کیوں روتے ہو؟ تو بڑا بھائی بولا، میں روتا ہوں کہ تم مجھ سے

پہلے شہر چھوڑ کے جاتے ہو۔ اس پر چھوٹا لڑکا بہادری سے ساتھ بولا، وہ جو ریل گاڑی اسٹیشن پر بعد میں آتی ہے وہ پہلے چھوٹ جاتی ہے۔ میں بعد میں دنیا میں آیا ہوں اس لیے مجھے پہلے جانا چاہیے۔"
اس بات کی سب نے خوب داد دی۔ برٹش چند داد دیتے [illegible] ہو گیا۔ کسی کے دماغ میں یہ بات نہ آئی کہ گووند کے زمانے میں ریل گاڑی کا تصور بھی نہیں تھا۔

ان صاحب کی [illegible] ختم ہو رہی تھی۔ [illegible] کا ساتھی [illegible] دے [illegible] ٹھیک اسی وقت اسٹیشن سے [illegible] آ نکلی تھی۔ اس سے ہی لوگ چلنے لگے۔ چلتے چلتے ماسٹر صاحب نے کہا: "مگر یہ دونوں [illegible] جب دیکھو ناچ ہو رہا ہے، گانا ہو رہا ہے، [illegible] جم رہی ہیں۔ کیا تماشا!"

"ارے صاحب، آپ نے یہ [illegible] آپ پولیس کا سہارا لیتے تو یہ [illegible] غنڈے کہیں کے [illegible] پھرتے تھے [illegible] اب آپ سے کیا بولوں، یہ [illegible] زندگی [illegible] میری بات غلط نکلے تو مونچھ منڈوا دوں۔" وہ صاحب اپنی مونچھ پر تاؤ دیتے [illegible]

"ارے صاحب، اس میں بھی شک ہے!"

ماسٹر صاحب چلے گئے تو [illegible] بچہ نہیں تھا۔ سوچا گھر چلا گیا ہوگا۔ راستے میں وہ اسی بنگلے والے خالی گھر کے سامنے سے نکلے تو دیکھا، اندر برآمدے میں [illegible] کے سہارے اس کا لڑکا کھڑا تھا۔ وہ چونکے۔

"یہاں کیا کر رہا ہے [illegible]" [illegible] لڑکے نے ایک بار گھوم کر چپ چاپ دیکھا اور پھر [illegible] باپ نے اسے [illegible] ڈانٹ کر اسے ساتھ لے چلے۔ مگر وہ مچل گیا: "نہیں جاؤں گا۔ میں نہیں جاؤں گا۔" وہ [illegible] زمین پر لوٹ گیا۔ ماسٹر صاحب کا غصہ بڑھ گیا۔ غصے سے [illegible] ہاتھوں سے پکڑ کر کھینچا اور باہر لے چلے۔ لڑکے نے [illegible] چیخیں [illegible] ماسٹر صاحب نے زمین پر ڈال دیا۔ پھر پیٹا۔ [illegible] مگر وہ [illegible] ماسٹر صاحب

نکلے۔ لڑکے کو اندر پڑا رہنے دیا اور بروٹھے کا دروازہ باہر سے بند کر دیا۔ وہ بڑبڑاتے ہوئے پاؤں پٹختے چلے گئے۔

لڑکا وہیں پڑا رہا۔ دھیرے دھیرے اس نے سر اٹھایا۔ بروٹھے میں اندھیرا چھا گیا تھا۔ بند دروازے پر اس نے تھاپ دی۔ ''مانو' دروازہ کھولو مانو!'' اندھیرا گھومنے لگا اور وہ بند تالے پر سر گرا کر سسک اٹھا۔ اندھیرے میں مانو اور اس کی گڑیا بھر آئیں۔ وہ اسے گھیر کر ناچ ناچ کر گانے لگیں: ''کہاں گنوائی ساری رین ہو!'' اس نے دروازے پر تھاپ دے کر پھر کہا، ''مانو مانو!'' وہ ناچتی ہوئی چھایائیں اداس ہو کر بجھ گئیں جیسے مانو کی ماں کا گیت ''پر بھی تول کشور!'' وہ سسکتا رہا۔

بابر بیرک میں روٹی پکاتا ہوا سپاہی قوالی کی طرز پر گا رہا تھا:

کیوں آگ لگائی جاتی ہے، کیوں درد بڑھایا جاتا ہے
بھئی ہم کو نسیلی آنکھوں سے، بیہوش بنایا جاتا ہے

بالا سنگھ سڑک کے نل سے پانی لانے چل دیا تھا۔ وہ بھی گا رہا تھا:

تیرے پچھے میں ہوئی آں تباہ، تاریاں توں پُچھ چن وے!

اور ہریش چندا پنے بچوں کو سکھا رہا تھا: ''بیٹا دیکھو، بڑی والی لیمن چوس کی گولیاں کشی کو پتے ی دو نے جیادہ مت دینا۔'' اور چھوٹا لڑکا اس کی بات سننے سے زیادہ سوچ رہا تھا کہ اگر بڑے بھائی کی پیٹھ پر سواری گانٹھی جائے تو کیسا رہے۔

❀ ❀

مدرارا کھشس

ہندی سے ترجمہ: شہاب الدین گیلانی

رس کپی

راجہ صاحب کی کوٹھی کے چپراسی نے جب ساڑھے بارہ کا گھنٹہ ٹھونکا تو چیز بیچنے والی بوڑھی کے بیٹے شہزادے نے پچھواڑے کی کھڑکی کی طرف آواز لگائی، ''ڈھونڈھے کی اماں، ایک تو بج گیا۔''

سب کو معلوم تھا کہ کوٹھی کا چپراسی گھڑیوں سے آدھ گھنٹہ پیچھے رہتا ہے۔ ڈھونڈھے کی ماں نے اپنے پیارے بیٹے شہزادے کو ... ڈھونڈھے کی بہو نے پیٹ کا مچا دو گالی سنائی اور دیوار کے کونے میں تھوڑی سی پیک تھوک دی۔ ... تھرڈ ... سے نیچے اترنے کی تیاری تھی۔ اس کے سپوت ڈھونڈھے نے اپنا بستہ اور تختی پٹکا، ... بیٹھی ... کی داتی پھری کی کھلیّے میں ڈبل کونے کے ... کو دیکھتے ہوئے سینے میں اکائی اور ماں کو گھورتا ہوا اپنے پیٹ کے پچکے ہوئے جیسی بے طلبی ... ماں ... سمجھانے لگا۔ ماں بولی، ''ڈلی کے گھر جاتے ہو بیٹا؟''

اس نے ... سے ہامی بھری۔ ماں نے ہدایت کی: ''کھیلنا نہیں بھلا!''

''ہاں اماں، کتاب لیے جا رہا ہوں۔'' اس نے لپک اور الماری سے جلد اکھڑی ہوئی قصہ طوطا مینا کی کتاب اتاری بولا: ''عام کتاب لیے جا رہا ہوں اماں!''

ماں مطمئن ہو کر گرتی میں بٹنیں ٹھیسنے لگی۔

شہزادے کی آواز بڑی نے بھی سنی۔ وہ اس وقت اپنی دونوں چھوٹی بچیوں کو چولہا چکار رہی تھی۔ وہ لمبی، چوڑی، دبلی سی کمر اور بھینگی آنکھوں والی، کاہل قسم کی عورت تھی۔

Scanned with CamScanner

بوڑھی پیڑے والی نے اپنے ڈھیلے گدے کی طرف دیکھ کر پریشانی ظاہر کی کیونکہ اس کی تیاری میں ابھی دیر تھی۔ کندن کی پوپلی تائی نے دو تین بار جھک جھک کر کمر کی ہڈیاں چٹخائیں اور کھجور کی چٹائی کا بنڈل بغل میں دبایا۔ بچھی چند کی گنجی لگائی نے پہلے ہی اپنی تیاری پوری کر لی تھی۔ پدّن کی اماں کا منسوا اموزے والے کی دکان پر منیم تھا۔ صبح دس بجے کھانا کھا پی کر چلا جاتا تھا، اس لیے پدّن کی اماں عام طور سے ایک نیند لے لیا کرتی تھیں۔ ہمیشہ کی طرح آج بھی وقت پر جاگ کر ناک کے اوپر کے حصے میں اُگے ایک بال کو اکھاڑ کر پھینکنے کی کوشش میں مشغول تھیں۔ آواز سننے کے ساتھ ہی وہ تڑپ کر کھٹ سے باہر آئیں۔ زگی، پیڑے والی، کندن کی تائی وغیرہ قانون ساز اسمبلی کے ارکان کی طرح آ کر جٹنے لگیں۔

لوگوں کے آنے جانے کے راستے والی سیلن بھری گلی میں کندن کی تائی کی چٹائی بچھتی تھی۔

پدّن کی ماں ہمیشہ کی طرح نچلے زینے کو بطور شاہی تخت استعمال کرتی ہوئی دیوار کی ٹیک لگا کر براجمان ہو گئیں۔ وہ میٹنگ کی صدر تھیں۔ کوئی ان کا مخالف نہیں تھا۔ اس کی کئی وجوہات تھیں۔ اول تو یہ کہ ان کا خاوند منشی تھا، جو ہمیشہ دھلا کرتا پہن کر منیم گری کرنے جاتا تھا۔ دوئم یہ کہ [illegible] مرض سے باوجود انھیں [illegible] زبانی یاد تھی گویا [illegible] پر [illegible] کا جنتر [illegible]۔ کسی نئی پیدا شدہ بچی کو جمو کا دھر پکڑے تو کہاں [illegible] کے پھول اور سیندور کا تلک [illegible] یہ بھی معلوم تھا۔

گھر والیوں کے بچے مکھیوں کی طرح چاروں طرف، رینگ رینگ کر بھنبھنانے لگے، مگر ان کی ماں نے انھیں دھکیل [illegible] مکے مار کر اور کھونٹ کھونٹ کر پرے بھگا دیا۔ آج دو معاملات [illegible] زیرِ غور تھیں۔ ایک تو منشو لال کی لڑکی کا چال چلن اور دوسرے سیٹھ پرساد کی بٹیا کا بیاہ۔

جب گھر کے بچے جلسے سے پرے ہٹ گئے تو پدّن کی اماں نے اپنے ہاتھ کی چھوٹی سی پنکھیا [illegible] کارروائی کی شروعات [illegible] کی غرض سے ذرا تن کر بیٹھ گئیں۔

زگی [illegible] ایک چوری دھر پکڑی تھی پدّن کی ماں نے، اور لوگوں کو بہ آواز بلند اس بات کی اطلاع [illegible] چکی تھیں کہ [illegible] کے بہانے زگی کمبخت باغ جاتی رہی ہے۔ اس اطلاع کے حاضر ہونے سے [illegible] زگی میں ایک خاص تبدیلی آ گئی تھی۔ اب وہ خود بھی زیادہ سے زیادہ چٹ پٹی خبروں کی جاسوسی میں تن من سے لگ گئی تھی۔

آج ان کے پاس بہتر مزیدار خبر تھی۔ بیچاری ٹھنو لال کی لڑکی دراصل مرا کے گھر نہیں گئی تھی بلکہ بھاگ گئی تھی۔ یوں تو اڑتی چڑیا کے پر کاٹنے میں اپنے کو ماہر ماننے والی پدّن کی ماں نے اس امکان کا اظہار کل ہی کر دیا تھا (بھلے ہی چڑیا پر کٹنے سے پہلے ہی اڑ لی) پر پکا ثبوت آج ملا۔ وہ ثبوت ملا رگی کو، اس لیے زگی آج ذرا غول کے بیچ بیٹھی تھی۔

پدّن کی ماں کے اندازے اکثر صحیح ہوتے تھے۔ وہ مہینوں سے کہہ رہی تھیں کہ ٹھنو لال بیچاری کی لڑکی کنتیا اور بابو لال میں کچھ غلط لگشن ہے۔ پھر ابھی جمعہ جمعہ سات یا بہت آٹھ دن ہی ہوئے ہوں گے جب بھی چند کی نگائی نے اپنی آنکھ سے مندر سے دو جلتے ن کو غلی میں دونوں کو بند ہوتے دیکھا تھا۔ پھر کچھ دیر دیکھتے مدبابو انگوچھا لپیٹا، چپت اٹھتا، اپنے گھر ہو رہا اور کنتیا سوئی تلی کا ناکا تی نیچے اتر گئی۔

"اے بہنا، ایسی اندھیر کہیں نہیں دیکھی" بتو مہاراجن نے کہا اور نخرے کے ساتھ منھ بناتے ہوئے خربوزے کے بیج چھیلنے لگی، چٹ پٹ۔

"اے نے، بس کی بی" پدّن کی ماں نے فوراً زبان پکڑی۔ "اے اتنی بات میں اندھیر ہو گیا! چپ چاپ رہو بھو جی، یہ نہیں ہوا اندھیر۔"

بتو مہاراجن کی پھونک نکل گئی۔ محفل کے شرکا نے لکیا کر ہنسی کی پھلجھڑیاں چھوڑیں۔

بتو مہاراجن دراصل ذات کی سنارن تھیں اور نکھو مہاراج کے گھر بیٹھی تھیں۔ نکھو مہاراج کی اماں تو مہاراجن تھیں، پر بیوگی کے دنوں جو تیرتھ کر کے لوٹیں تو پیٹ میں نکھو کا لونڈا ہے۔ مہاراجن گھبرا کر دوا پر دوا کھانے لگیں، پر نکھو چمگادڑ کی طرح پیٹ میں ایسے چپکے کہ گرنے کا نام ہی نہیں لیا۔ بس ہوا اتنا کہ نکھو کی ایک آنکھ بالکل صاف ہو گئی اور دوسری میونسپلٹی کی بتی کی طرح چندھی ہو رہی۔ سو نکھو مہاراج نے گھر بٹھایا بتو سنارن کو، جو بعد میں بتو مہاراجن کے نام سے مشہور ہوئیں۔ نکھو کی کمر کچھ دن تو بچی رہی، پھر بائی نے دھر دبوچا۔ اس کے بعد بتو مہاراجن تو کہیں نہیں گئیں، ہاں نکھو کے ایک بیچ دار بھائی ضرور گھر آ بیٹھے۔ آئے دن نکھو اور بتو مہاراجن میں چخ چخ ہو جاتی۔

اس دن تو حد ہی ہو گئی، جب پدّن کی ماں نے اپنے روشندان تک میز کرسی لگا کر جھانکا، پدّن کی اماں کی آنکھیں پھٹ گئیں وہاں کا منظر دیکھ کر۔ چارپائی پر لیٹے نکھو مہاراج گا! بھڑ زرگا یاں بک

رہے تھے اور بھو کے دیور جی بھو کی گود میں سر دیے لیٹے آرام سے کہہ رہے تھے: "چپکے رہو بھو جی!"

پدّن کی ماں نے وہ سارا قصہ محفل میں پیش کیا تو بنو کے ہوش فاختہ ہو گئے۔ یہی بات تھی جسے کہہ کر آ، پھر پدن کی ماں نے بھو کا پتّا کاٹ دیا۔

کندن کی پوپلی تائی ذرا بھگتن قسم کی تھیں، سو ناک بھوں سکوڑ کر بولیں: "ہر ے جا ئے!"

بولنے والے کے بجیٹ کے خلاف اپنے ویٹو کا صحیح استعمال کرنے کے بعد تائی نے پنی ناک تھرائی ہی تھی کہ ڈھونڈھے کی اماں نے بترس کے سر کے میں اپنی منی ملیا تیر دی۔ "اے تائی، ابھی کیا! ابھی تو گنیا کے گن سنو، گنیا کے!"

اتنا کہہ کر وہ کھی کھی ہنسی لیکن اس کی ہنسی میں کسی نے ساتھ نہیں دیا، اور پھر وہ ہنسی جو ایک عجیب آہیں بن کر گلے سے نکلی تو منہ پھیلا کا پھیلا ہی رہ گیا۔

کلیارے کے "خری چھور پر بنی کوٹھری کے دروازے پر نہ جانے کب رمّو بھوجین چپ چاپ آ بیٹھی تھی اور سنے بھر کے آئینے کو گھٹنوں میں ٹکا کر سینگ کی کنگھی سے بالوں کے پتے کھینچ رہی تھی۔

بمو مہاراجن نے پنکھیا اٹھا کر اس کی ڈنڈی سے بھی چند کی ننگائی کو تین کھوچے مارے اور پھسپھسا کر کہا: "اے بچی، یہ کب آ گئی؟"

ڈھونڈھے کی ماں نے یاد آنے پر غڑاپ سے اپنا منہ بند کیا اور گردن لمبی کر کے رمّو کو گھورنے لگیں۔ کندن کی تائی نے آنکھیں مچکائیں اور گلی کے چھور پر دیکھا۔ پھر مچکائیں، پھر دیکھا۔ پر دکھائی کچھ بھی نہ پڑا۔ جھلا کر کچھ کہنے ہی والی تھیں کہ پیڑے والی نے گھٹنا دبا کر انھیں روک دیا۔

ان کی اس اچانک چپّی کا بھی کوئی اثر نہیں ہوا رمّو پر۔

رمّو بھوجین بھی پہلے اس بیٹھک کی رکن تھی، رکن بھی ایسی کہ ہر کوئی واہ کرے اور ہر کوئی حمایت کرے۔ وہ اس لیے ہوئی کہ وہ سب سے زیادہ اچھی رسیلی کہانیاں سنا سکتی تھی۔ باقی ارکان کچھ تو عمر کی بڑھاپے کی وجہ سے اور کچھ گھر گرہستی کے جنجال کی وجہ سے، عورت مرد کے تعلق کے رسیلے پہلو کی بجائے زچہ خانے کی تکلیفوں اور اگلے چوبارے چھنالوں کے غیر مطمئن تذکروں تک ہی محدود رہتی تھیں۔ ان میں بھی اگر کبھی چند کی ننگائی نے اگر بتایا کہ اس کے پہلوٹھی والے بچے کے وقت سارے دن لٹیاں ہوتی تھیں تو پیڑے والی نے ٹرمپ مارتے ہوئے کہا کہ یہ کون بڑی بات ہوئی،

Scanned with CamScanner

میری تو بچہ دانی ہی الٹ پلٹ جاتی تھی۔ اس طرح ہر ایک کے تجربات یک دوسرے سے ٹھیں ہی نکلتے، اور ظاہر تھا کہ ہر کوئی اپنے درد کو خفیف ثابت ہوا چاہ کر گزر جاتی۔ چھپانے کی چرچا اور بھی خطرناک تھی۔ اس میں یا تو جھوٹ و سچ کی شہادت کے نام پر تو تو میں میں ہو جاتی یا پھر یک دوسرے کی نگی پیٹ کھولنے کی نوبت آتی۔ اور واک آؤٹ ہو جاتا۔

کچھ بھی ہو، ان سے چرچے اتنے رس بھرے نہیں تھے جتنے رتو کے۔ وہ پچھلے چھ سال کے رومانی جیون میں نہ تو ماں ہی بنی تھی اور نہ ہی اس کی شادی ہوئی تھی۔ بھوجین صرف اس کے سرمئی رنگ کی وجہ سے کہا جاتا تھا ورنہ وہ ذات کی مالن تھی۔ سب سے مزے کی بات تو یہ ہے کہ بنا بیاہ ہوئے وہ مانگ میں سیندور تک بھر لیتی تھی۔

اس کی حمایت کرنے کو بھی بیتاب رہتی تھیں، پر اندر اندر ایک حسد محسوس کرتی تھیں۔ رتو منھ پھٹ بھی خاصی تھی اور چٹورن بھی۔ منھ پھٹ تھی، اس لیے اپنے اوپر باتوں کا داؤ نہیں چلنے دیتی تھی اور خود چٹوری ہونے کے باوجود دوسروں کو کھلانے میں خاصی فراخ دل تھی۔ ڈھونڈھے کی اماں کو تو اس نے ایک دن گن کر پورے سولہ گول گپے کھلا دیے۔ یہ بات دوسری ہے کہ دوسرے دن برنے کی لسی پینے کے بعد بھی انھیں شک ہوتا رہا کہ کہیں انھیں بواسیر نہ ہو جائے۔

پھر رتو پچھلے کوئی دو مہینوں سے غائب تھی۔ جس دن وہ غائب ہوئی اس سے پہلی رات محلے میں رتو بنو کا رات بھر کے لیے ناچ رکھا تھا۔ تھمل کے پیڑ کے نیچے دری بچھا کر محلے کے نٹھلوؤں سے لے کر استادوں تک کے ہجوم تک کی واہ واہی لوٹی ہوئی رتو بنو کی کشش گھر والیوں کے بیچ بھی کم نہیں تھی۔ رتو ذرا موٹی اور ٹھگنی تھی، بنو لمبی اور دبلی۔ مگر دونوں کا نرتیہ تھا، جس دونوں میں فن کالی آگئی تھی۔

ناچ گانے سے بہوئیں بگڑ نہ جائیں، اس لیے زیادہ تر بوڑھیوں نے بہوؤں کو دھکا کر اندر کر دیا اور خود رات بھر جاگرن کیا۔ ڈھونڈھے کی اماں نے آٹے چاول کے ٹین رکھ کر منڈیر سے ساری رات ناچ دیکھا۔ پدّن کی اماں نے اٹاری پر چارپائی لگا کر چڑھنے کی کوشش کی تو چارپائی چرمرا گئی اور وہ بھدبھدا کر نیچے آ رہیں۔

دو چار بار "اوئی اماں" اور "ہائے اوئی" کرنے کے بعد انھوں نے اپنی کمر تھامے تھامے صدا لگائی اور کانکھ کانکھ کر ساری رات ہک ہک جھکتی رہیں۔

تھوڑی دیر بعد رمّو بھوجین بھی پدّن کی اماں کے پاس آ دھمکی۔ عمر میں فرق ہوتے ہوئے بھی من کی ہمجولی کا ہی اثر کہیے کہ بھور تک ان دونوں 'ست بھتریوں' (سات شوہروں والیاں) کو، اودتی رہیں۔ صبح تڑکے سیڑھی سے بڑبڑاتا ہوا بدحواس پدّن اوپر آیا۔

اس کی آہٹ سے پدّن کی اماں کھسیا کر چونکی۔ لیکن پدّن نے کھسیاہٹ کی طرف دھیان دیے بنا لپک کر ان کے دونوں کندھے پکڑے اور جھنجھوڑ کر بولا: "اماں، اماں!"

"ارے بھیا کیا رے؟" اماں نے جھلا کر پوچھا۔

"اماں، وہ... وہ کہاں ہے؟"

"ارے کون رے؟"

"ک... ک... کلاوتی نہیں ہے!"

"اے کیا بات ہے رے؟" پدّن کی اماں ہڑبڑا کر کھڑی ہو گئی۔ "اے ہو گی کہیں۔"

"نہیں ہے گی اماں، کہیں نہیں ہے گی، سب جگہاں دیکھ لیں میں نے۔"

پدّن کی اماں کا کلیجہ ڈرے ہوئے چوہے کی طرح ان کی پسلیوں میں تھپ تھپ ٹکریں مارنے لگا۔ انھوں نے زور سے پدّن کو جھٹکا دیا۔ "ہائے رام، تو چلاتا کاہے ہے؟ اے ہو گی کہیں!"

رمّو ان مکالموں میں کسی راز کی بو پا کر غور سے سن رہی تھی۔ پدّن کی اماں کی نظر رمّو پر پڑی تو وہ زیادہ گھبرائیں۔ انھوں نے بات وہیں ختم کی اور سیڑھیاں اتر کر نیچے آ گئیں۔

رمّو نے اندازہ لگا لیا کہ کیا بات ہو سکتی ہے۔ پدّن کی اماں سے بھی چھپا نہ رہا کہ رمّو کو راز معلوم ہو گیا۔ اسی دن کا انھیں ڈر تھا۔ لیکن ہونی شاید ہو کر ہی رہی۔

جب سے پدّن کی بہو گونے میں آئی، اسے تین بار کوٹھری میں بند کیا جا چکا تھا، چار بار فاقے کرائے گئے تھے اور پانچ چھ بار دھنائی کی جا چکی تھی۔ لیکن ہونی پر کس کا بس چلتا ہے۔

پدّن کی اماں نے گھر کا کونا کونا چھان مارا، یہاں تک کہ مٹکوں اور بلٹیوں تک میں جھانک ڈالا، لیکن بہو کا پتا نہیں چلا۔ لاچار ہو کر اماں سے پہلے خود پدّن نے ہی سر تھام کر بھوں بھوں رونا شروع کر دیا۔

پڑے والی اس وقت کلّی کرتی۔ بی یہ سوچ رہی تھی، کیوں نہ وہ اساڑھی کے میلے میں کھوئے

کی جگہ کاغذ کی لگدی ڈال کر برفی جما لے۔ اچانک بھوں بھوں کی آواز سنی تو منہ اونچا کر کے آواز دی،

"اری او پدّن کی ماں، یہ کون رونے لگا؟"

پدّن کی اماں گھبرا گئیں پھر بھی انھوں نے بات بنالی، بولیں، "کچھ نہیں جیا، یہ پدّن سوتے سوتے بڑبڑانے لگا۔" لیکن پھر بھی انھوں نے سوچا کہ یہ خطرناک وقت ہے، کہیں کوئی آہٹ لیتا یا پوچھتا ہوا اوپر ہی نہ آ دھمکے، اس لیے وہ خود ہی دروازہ کھول کر باہر آ گئیں۔ لیکن باہر نکلتے ہی ان کا جی دھک سے ہو گیا۔ انھوں نے دیکھا کہ ان کے دروازے سے اچانک مڑ کر رنو تیزی سے زینے کی طرف جا رہی ہے۔ رنو کی اس جاسوسی پر بے بسی کے دانت پیستی ہوئی وہ تیجے کے سہارے ٹک گئیں۔ ان کی آنکھوں سے موٹے موٹے آنسو ڈھلنے لگے۔

سویرے سویرے پہلا کام انھوں نے یہ کیا کہ پدّن کو اپنی خالہ کے گھر بھیج دیا۔ اس کے بعد وہ دروازہ بند کر کے کمرے میں پڑ رہیں۔ کسی نے پوچھا تو اندر سے ہی "آہ، اوہ" کر کے بولیں کہ ان کی طبیعت خراب ہے۔ دوپہر ہوتے ہوتے پچھی چندن لگائی اور نرگی میں جانے کیا مسکوٹ ہوئی کہ وہ پدّن کی ماں کی بیماری کا حال چال لینے آ دھمکیں۔ نرگی کی چڑھی ہوئی آنکھیں دیکھ کر پدّن کی اماں کی آنکھیں سنک گئیں۔ رہی سہی کسر پوری کر دی پچھی چندن لگائی نے۔ اس نے پوچھا: "اے بہنا، بھوریا سویرے سے نہیں دکھی!"

"اے لو، بتایا تو تھی یار کہ رات میں تار آیا تھا۔ اس کی اماں بیمار ہے، سو دیکھنے گئی ہے گی۔ اور کیا پر پیچ بگھار دھواس میں تم لوگ۔" پدّن کی اماں نے بڑے تیکھے پن سے سچائی کا پردہ ڈال کر منہ موڑ لیا۔ تھوڑی دیر بعد دونوں نیچے اتر گئیں۔ پدّن کی اماں نے پیچھے تو گن کر دس بارہ گالیاں نکالیں اور پھر منہ ڈھک کر پڑ رہیں۔ بیمار وہ سچ مچ دکھنے لگی تھیں، اس لیے انھیں الجھن بن کر جہاں کی تہاں رہ گئیں۔

دوپہر چڑھتے ہی جیسے پدّن کی اماں کو بخار سا چڑھ آیا۔ انھیں اس بات کا یقین ہو گیا کہ آج کی بیٹھک میں ان کی غیر حاضری اور رنو کی جاسوسی سے جو گل کھلے گا وہ انھیں کہیں کا نہیں رکھے گا۔

لیٹے لیٹے کئی بار ان کے جی میں آئی کہ اٹھ کر وہ رنو سے ملیں، اسے پٹانے کی کوشش کریں لیکن ان سے اٹھا نہیں گیا۔ انھیں لگا جیسے ان کا خون دھیرے دھیرے سوکھتا جا رہا ہے۔ پیاس گلے میں کانٹے چبھونے لگی۔ خواہش ہوئی کہ کسی سے پانی کے لیے کہیں، پر اس کی بھی ہمت نہیں ہوئی۔ پھر

نہ جانے کب وہ سو گئیں۔

جب ان کی نیند کھلی تو انھوں نے دیکھا کہ کندن کی پوپلی تائی ان پر جھکی انھیں پکار رہی ہیں۔ پدّن کی اماں ہڑ بڑا کر اٹھ بیٹھیں۔ کمرے کے اجالے سے انھیں لگا کہ شام ہونے والی ہے۔ تائی کو دیکھ کر وہ بری طرح گھبرا گئی تھیں۔ لیکن تائی صرف حال چال لے کر ہی نیچے اتر گئیں۔ معلوم ہوا کہ دوپہر کو آج بیٹھک ہی نہیں ہوئی۔ اس بات سے انھیں بے حد اطمینان ہوا۔ لیکن اس سے بھی زیادہ سکون ہوا ایک اور خبر سے۔ رنّو صبح سے غائب تھی۔

رنّو جبّن پان والے کے ساتھ بھاگ گئی جس وقت پدّن کی اماں نے یہ فقرہ گھڑا اس وقت انھیں ایسا محسوس ہو جیسے ان کے ہاتھ میں ہنومان کی گدا آ گئی ہو، جس سے وہ کسی بھی پر پنچ کا سر توڑ دیں گی۔ ان کے چہرے کا پیلا پن غائب ہو گیا۔ کمر تن گئی۔ بھاری بھرکم کولھے سنبھال کر وہ دوسرے دن پھر اسی زینے والے شاہی تخت پر آ براجیں۔

اس دن کی بیٹھک کا نام بھی چندی لگائی نے دیا تھا "سلیما والی بیٹھک۔" خوب مزے لے لے کر پدّن کی اماں نے بتایا کہ رشّو بتّو کے ناچ کے وقت رنّو اور جبّن کے کیا کیا گل کھل رہے تھے۔ زگی نے ایک ایک باریکی پر روشنی ڈالنے کی گزارش کی اور ایک دوسرے کو ٹہوکیا کر انکانیوں نے برتن میں گلاب جامن کی طرح ڈبکیاں لگائیں۔ پدّن کی اماں رائے عامہ کو بہو کے واقعے کی طرف سے رنّو کی طرف موڑ کر اطمینان سے بیڑے چباتی رہیں۔

لیکن ابھی دو مہینے بھی نہیں ہوئے تھے کہ جبّن پان والا باقاعدہ فلمی گانا گاتا ہوا اپنی دکان پر آ دھمکا۔ وہ پدّن کا جگری دوست تھا۔ دراصل پدّن کی بیوی کے گول مال کا نائک وہی تھا۔ پدّن کی اماں نے بیسیوں بار بیٹے کو اس کے بارے میں آگاہ کیا تھا۔ خود جبّن کو بھی بالواسطہ گالیوں کا تحفہ بھجوا چکی تھیں۔ لیکن پدّن کی مجبوری یہ تھی کہ وہ افیم کھاتا تھا اور جبّن افیم کے نشے کی ندیا پار کرنے والا واحد مانجھی۔

نتیجہ سامنے تھا۔ ناچ کے دن اس نے پدّن کو ایک ڈبل خوراک نگلوا دی اور اس کے بعد اس کی گوری گوری، گول گول بیوی کو لے کر چمپت ہو گیا۔

اسی بیچ پدّن کی اماں نے پہلے تو بیٹھک کی ارکان کو طرح طرح کی اطلاعوں میں الجھائے رکھا ور پھر ایک دن بہو کے بیمار پڑ جانے کی خبر دے ڈالی۔ اس بیچ منشی جی پہلے سے بھی زیادہ صبح چلے

جاتے اور دیر سے لوٹتے۔ آخرکار ایک صبح اچانک پدّن کی اماں نے آنسو بہا کر لوگوں کو بتایا کہ بہو بیچاری جاتی رہی۔

لیکن اس ماتم کو ایک ہفتہ بھی نہیں بیتا کہ جمّن آ پہنچا۔ سب سے پہلے پچھاڑ کھالی پدّن نے۔ اسے یہ بخوبی معلوم تھا کہ اس کی بیوی کس کے ساتھ گئی ہے، پر وہ اس خیال سے تھا کہ جمّن کے ساتھ بیوی بھی لوٹ آئے گی ہی۔ جمّن اکیلا لوٹا تو اس نے سر پیٹ لیا۔

مگر اماں کو ایک اور فکر ستانے لگی۔ غنڈا تو غنڈا، محلے کے چھچھوروں سے بہو کی چرچا ضرور کرے گا، چھوکرے بات پھیلائیں گے۔ اس لیے احتیاطی تدبیر کے طور پر انھوں نے ایک نیا شگوفہ چھوڑا بیماری کی بات کا۔ یہ سچ تھا کہ کم سے کم کچھ ان لگائیوں کا دھیان بٹائے رکھنے کے لیے یہ تمہ کافی تھا۔ تب کچھ اور سوچا جاتا۔

پر اب یہ آپہنچی منو۔ باپ رے باپ! پدّن کی اماں کو لگا جیسے انھیں کسی نے سر کے بل الٹا کھڑا کر دیا ہو۔

منو کی طرف منہ پھیلائے تاکتی لگائیوں کو جب ہوش آیا تو وہ پھر پدّن کی اماں کی طرف مخاطب ہوئیں۔ لیکن کرسی ایک دم خالی تھی۔ پتا نہیں چلا کہ اماں کب سرک لیں۔ ایک دوسرے کو سٹپٹائی، کونچتی لگائیاں کچھ دیر تو بیٹھی رہیں کہ شاید اماں لوٹیں، لیکن جب وہ نہیں لوٹیں تو بیٹھک کی ارکان کا ہجوم ان کے کمرے کی طرف خبر لینے چلا۔ کمرے کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ اندر سے پدّن کی اماں کے کراہنے کی آواز آ رہی تھی۔ کسی نے دھیرے سے دروازہ تھپتھپایا۔ تھوڑی دیر بعد کراہتے ہوئے پدّن کی ماں نے اندر سے کہا کہ ان کی طبیعت پھر خراب ہو گئی ہے۔

❀❀

مدرارا کھشس

ہندی سے ترجمہ: زیبا علوی

آسیب

وہ سمجھ نہیں پا رہے تھے کہ "آخر ان کا مکان گیا کہاں؟ سوچا، مکان کیا کایک غائب ہو سکتا تھا؟ کیا ایسا بھی ممکن تھا کہ سب کچھ ویسا ہو، بس ان کا مکان ہی کہیں غائب ہو گیا ہو؟ گلی، گلی کے چبوترے، مزار، پیپل کا درخت، بدبو پھیلاتی ہوئی موریاں، گلی میں کھیلتے بچے، پخانے گھروں سے پھینکا گیا کوڑا — سب کچھ تو تھا۔ گلی کے باہر جا کر تراہے سے وہ گلی میں پھر داخل ہوئے۔ پھر وہی الجھن۔ اس بار وہ بڑی احتیاط سے ہر چیز کو پہچانتے گئے تھے، پر نہیں دکھا تو ان کا اپنا مکان۔ ٹھیک ٹھیک بھرپورا کہا جا سکتا ہے، ایسا مکان تھا۔ بیوی، بچے، ایک چھوٹے متوسط گھرانے کا سامان۔ کیا ایسا سچ مچ ممکن ہو سکتا تھا کہ باقی سب کچھ وہاں موجود ہو اور ان کا مکان ندارد ہو جائے، بیوی بچوں سمیت؟

کیا انھیں ہی کوئی دھوکا ہوا تھا یا وہ کسی غلط گلی میں آ گئے؟ کیا ان کی گلی کوئی دوسری ہے؟ کہیں اور ہے؟ دھیرے دھیرے وہ گلی سے باہر آئے۔ گلی میں جس طرف سے وہ داخل ہوئے تھے ادھر ایک تراہا تھا اور اس تراہے سے ہٹ کر پانچ گلیوں کا ایک چھوٹا سا چوک تھا۔ وہ تراہے تک ہی نہیں، پانچ گلیوں کے اس سنگم سے چوک تک واپس آ گئے۔ یہاں بیچوں بیچ جھنڈے کے لیے لوہے کی چھڑ گڑی تھی۔ اسے انھوں نے غور سے دیکھا۔ اس پر پندرہ اگست اور چھبیس جنوری کو پرچم لہرایا جاتا تھا۔ چوک کے ایک کونے پر بہت پرانا نیم کا درخت تھا اور درخت کے تنے سے سٹا چھوٹا سا ایک مندر۔ اسے بھی انھوں نے پہچانا۔ اس مندر کو وہ پسند نہیں کرتے تھے، بلکہ اگر ان کا بس چلتا تو وہ اسے

Scanned with CamScanner

تو نہیں دیتے۔ ان کا تعلق آریہ سماج سے تھا اور وہ بت پرستی کے سخت مخالف تھے۔ انھیں ایک مرتبہ اس بات پر غصہ بھی آیا تھا کہ آریہ سماج کے چیئرمین ... دیوی نندن اس مندر میں ہونے والی بھگوتی جاگرن کی شوبھا بڑھا رہے تھے۔

اس مندر کے پاس انھوں نے دیکھا ... دوارہ گاؤں کی طرف سے ... وہاں کوئی سارا راستہ جاتا تھا۔ ایسے سب راستے ایک سے ہی تھے۔ کبھی تو تجاوزات کی وجہ سے راستے بڑے تنگ ہو گئے تھے۔ کئی راستوں پر لوگوں نے اپنے چبوترے تک بڑھا دیے تھے۔ کبھی پر راستہ گھیر کر ... لگانے والے نیچوں چارپائیاں ... سے گھیر رکھے تھے۔ انھی گلیوں سے ... کبھی کبھی چپ چاپ کوئی ... اور ... تھا اور شادی ... میں گزرتے ہوئے لوگ انھی ... سے ایک دو کو زخمی بھی کر دیتے تھے۔

... وہ کوئی ... نہیں ... چاہتے تھے۔ آخر عمر ہو گئی تھی۔ عمر بڑھنے پر تھوڑا بہت ... کمزوری کا مسئلہ ہوتا ہی ہے۔ ... ایسے ... کمزوری کیوں ... ہے؟ ... باتیں ... سوچتے ... تھے۔ انھیں ... پتہ تھا ... ہوئے تھے ... میں ... انھوں نے سوچا ... چلے ... تھے۔ ... کھانے سے دماغ میں طاقت آتی ہے۔ انھوں نے سوچا تھا ... ضرورت نہیں ... اور گھر کا راستہ بھی ... میں ... انھوں نے اپنی گلی کی ... پر ... چاہا۔

جلدی ہی ... گلی ... ان ... دماغ میں ایک سنگیت ... اور سنگیت کی وہ جس سے وہ ... تھے بھگوتی جاگرن کا وہ سنگیت۔ اس چھوٹے سے چوک کے نکڑ سے مندر ... انھیں وہ یاد آیا تھا اور ... کے پیچھے ... جا رہا تھا۔ ... کے ساتھ انھوں نے ... جیسے ... کی ... ان سے ... جیسے ان کے ... چپکا۔ اس سنگیت کا شور بہت زیادہ تھا، تماشا زیادہ ... باقی کی چیز کی جگہ وہ ان کے

دماغ میں نہیں چھوڑ رہا تھا۔ کوئی تصویر بھی وہاں تک نہیں پا رہی تھی۔ اس شور کے چلتے سڑک کو پہچاننے میں دماغ کیسے لگے آخر؟ اس بار، اب بار تو گھر پہنچنا ہی ہے۔ وہ پتہ گھر کھوج نہیں پا رہے، یہ بات بھی تک کسی اور کو پتا نہیں تھی۔ انھوں نے آس پاس دیکھا۔ ہلو سبزی والا اپنے ٹھیلے پر رکھی سبزی نالی کے پاس لگے ہینڈ پمپ سے بھگو رہا تھا۔ اس سے وہ خوش نہیں تھے۔ وہ ہر سبزی کا دام زیادہ بولتا تھا اور انھیں لگتا تھا کہ وہ صرف انھی سے زیادہ دام بولتا ہے۔ شاید ان سے چڑتا ہے۔ پر وہ انھیں باقاعدہ نمستے بھی کرتا تھا۔ انھیں دیکھتے ہی اس نے نمستے کیا اور سبزی پر پانی کے چھینٹے مارنے لگا۔ سے مسکرا کر جواب دینے کے بعد وہ آگے بڑھ آئے۔ بہت زور زور سے فلمی گانے بجاتا ہوا مدھی تمبو قنات کا سامان سنبھال رہا تھا۔ س سے ان کا کئی بار جھگڑا ہو چکا تھا۔ آریہ سماج کی تقریبوں کے لیے تمبو قنات وہی لگاتا تھا اور ہر بار کوئی نہ کوئی گھٹیا پن کرتا رہتا تھا۔ چاٹ والا پنڈل بھی دکھائی دیا۔ اس کے یک کمرے کے مکان میں اس کے نہانے دھونے کی جگہ بھی تھی، کھانا بنانے کی بھی اور سات بچوں سمیت ، رے کے سارے سوتے بھی وہیں تھے۔ اپنی چاٹ کا سامان وہ چھت پر بناتا تھا۔ اس وقت وہ اپنے غصے سے دیگچیوں اور مسالے، تیار رہا تھا۔

انھیں لگا کہ ان کے دماغ میں گھومتا سنگیت غائب ہو گیا ہے۔ انھیں خاصا اطمینان ہوا۔ اب وہ یہ بھول جانا چاہتے تھے کہ وہ اپنا مکاں بھول گئے ہیں اور پھر سے کھوجنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ شاید اس طرح سہج ہو جانے پر وہ حادثہ پھر نہ ہو۔ وہ اب اطمینان سے آگے بڑھے۔ انھیں یقین ہو چکا تھا کہ اس بار اپنے آپ ان کے قدم اپنے گھر کے سامنے ہی پہنچ کر رکیں گے۔

اب انھیں اپنے آپ پر تھوڑی ہنسی آئی۔ غنیمت ہے کہ انھوں نے گھبراہٹ میں کسی سے کہا نہیں کہ وہ اپنا گھر بھول گئے ہیں۔

پچھلے کچھ عرصے سے ان کے ساتھ کچھ گڑبڑیاں ہونے لگی تھیں، پر وہ ان کا سامنا ہمت سے کر رہے تھے۔ انھوں نے یک بار غور کیا کہ گھر میں جہاں وہ پیشاب کرتے تھے وہاں چیونٹے لگنے لگے ہیں۔ انھوں نے حکمت اور ویدک کی بہت سی پرانی کتابیں اکٹھی کر رکھی تھیں۔ کئی روز انھیں الٹنے پلٹنے کے بعد معلوم ہوا، یہ ذیابیطس کی بیماری کی نشانی ہے۔ اب انھوں نے اس کا علاج شروع کیا۔ وہ ڈھولک ور ہارمونیم بہت اچھا بجاتے تھے۔ دونوں باجے بہت اچھی حالت میں رکھتے تھے۔ پر

ذیابیطس کے لیے انھوں نے اپنے اس طبلے کا دایاں کھول ڈالا جسے انھوں نے کچھ دن پہلے ہی خریدا تھا۔ چمڑے کی ڈوری اور منڈھی ہوئی کھال کے ساتھ طبلہ ملانے والے لکڑی کے گٹے ایک تھیلے میں باندھ کر حفاظت سے رکھ دیے تھے۔ طبلے میں وہ رات کو پانی بھر لیتے تھے۔ وہی پانی وہ دوسرے دن پیتے تھے۔ اس کے علاوہ وہ جامن کے پیڑ کی چھال لے آتے تھے۔ اسے وہ چندن کی طرح ہر صبح پیستے تھے اور پی لیتے تھے۔ یہ سب وہ کرتے رہے اور کسی کسی دن پیشاب میں چیونٹے لگتے نہ دکھائی دیتے تو وہ خوش بھی ہوتے تھے۔ پر دو چار روز بعد چیونٹے پھر لگنے لگتے۔ ایک دن راستے میں انھیں چکر آ گیا۔ سب کچھ بہت تیزی سے گھوما اور وہ بری طرح لڑکھڑائے۔ بجلی کے ایک کھمبے کا سہارا لے کر پان کی دکان کے چبوترے پر بیٹھ گئے۔ دکاندار نے انھیں ایک گلاس پانی پلایا۔ سنبھل کر وہ گھر لوٹے اور اپنی کتابیں پھر کھول لیں۔ کتابوں میں دیکھ کر کئی دن تک پان کا رس پیتے رہے اور دوبارہ چکر نہیں آیا تو خوش ہوئے تھے۔ طبلے کو دوا میں بدل لینے کے بعد وہ اب ڈھولک پر زیادہ انحصار کرتے تھے۔

وہ پیشہ ور بجانے والے نہیں تھے۔ گاؤں میں ہی انھوں نے شوقیہ طور پر ڈھولک سیکھ لی تھی۔ بعد میں انھیں شہر کے کباڑی بازار میں ایک پرانا ہارمونیم مل گیا تھا جسے وہ سائیکل کے پیچھے باندھ کر لائے تھے۔ اس کو بجانے کی بھی اچھی مشق ہو گئی۔ ان کے آس پاس کے لوگ کہتے تھے کہ ان کے ہاتھوں میں نائی ہو کر بھی سنگیت کے استادوں کا فن ہے۔ جیسا لگتا تھا، وہ جلدی ہی سچ مچ استاد ہو جائیں گے اور استاد ہو جانے کے بعد ان کے وجود میں گھسا ہوا ایک آسیب انھیں آزاد کر دے گا۔ یہ ایک ایسا آسیب تھا جو نسلی وراثت کی طرح انھیں اپنے پتا سے ملا تھا۔ کبھی کبھی کوئی ایسا بچہ بھی پیدا ہو جاتا ہے جسے ماں باپ دونوں سے ناک، کان، منھ، آنکھ، رنگ روپ کے ساتھ ساتھ کسی بیماری کے ان جراثیم بھی مل جاتے ہیں، جیسے کسی روگ کے۔ ٹھیک ویسی ہی وراثت انھیں بھی ملا تھا نائی ہونے کا ورثہ۔ جب تک وہ چھوٹے تھے، اس ورثے پر ان کا سیدھا قبضہ نہیں ہوا تھا۔ ساتھ کھیلنے والے بچے بھی کبھی مذاق میں اپنی ہتھیلی پر انگلی سے استرا تیز کرنے کی اداکاری کرتے تھے اور وہ بہت جلدی سمجھ جاتے تھے کہ ان کا اشارہ کیا ہوتا ہے۔ تب تک وہ نائی کے بچے بھر ہی تھے۔ پر وہ جلدی ہی بڑے ہو گئے تھے، دوسرے بچوں کے مقابلے میں ان سے پہلے، ان سے کم عمر میں ہی۔ بیمار

تھے اور چودہ برس کی عمر میں ہی انھیں پنڈت رادھے شیام کے ساتھ شہر جانا پڑا تھا، ایک شادی کے سلسلے میں۔ نائی کیا ہوتا ہے، اسے کیا کرنا ہوتا ہے، اسے کیسے اٹھنا بیٹھنا ہوتا ہے، یہ سب وہ ایک دن میں سیکھ گئے تھے۔

غنیمت ہے، پتا جلدی ٹھیک ہو گئے اور گلے میں آ پڑا طوق انھوں نے پھر پتا کو ہی سونپ دیا تھا۔ پتا بھی اس بات سے ناخوش نہیں تھے، بلکہ انھیں یہ اچھا ہی لگتا تھا کہ آس پاس کے گاؤں میں بھی ان کا بیٹا ڈھولک یا گاہے بگاہے ہارمونیم بجاتا تھا اور اچھا ہی بجاتا تھا۔ اس کا گلا بھی برا نہیں تھا، اس لیے وہ کبھی کبھی گاتا بھی تھا — کونو البیلے کی نار جھما جھم پانی بھرے...

ن کی شادی ہوئی تو ان کے پتا انھیں بہو کے ساتھ کامیشور پنڈت کی حویلی لے گئے۔ کامیشور پنڈت برہمن تھے، پر کسی لٹھیت ٹھاکر کی ادا سے رہتے تھے۔ کھیتی تو تھی ہی، قصبے میں دال مل بھی لگا رکھی تھی۔ وہ انھیں دیکھ کر زور سے ہنسے۔ اپنا آشیرواد دیا، پھر بولے، "بھئی جب آئے ہو تو کچھ ہو جائے۔ وہ کیا گاتے ہو، جھما جھم پانی بھرے۔"

فرمائش ہوتے ہی پتا دوڑ کر ان کا باجا لے آئے۔ گانا سن کر کامیشور پنڈت نے گانے کی تعریف کی اور ایک بار پھر آشیرواد دیا۔ پھر پتا سے بولے، "اب تو بیٹا جوان ہو گیا ہے۔ تمھارا بوجھ ہلکا کرنا چاہیے۔ کیوں بھئی، ایسا کرو، اس کو لے کر کل ہماری دال مل پر آ جاؤ۔ مل کے سامنے سڑک کے کنارے ہماری کافی زمین ہے۔ کئی لوگ دکانیں کھولے ہوئے ہیں۔ تھوڑی سی جگہ یہ بھی لے لے، وہاں ایک سیلون کھول لے۔ حجامت کی دکان وہاں ہے نہیں، خوب چلے گی۔ کل آ جانا۔"

وہ پتا کے پیچھے پیچھے گھر لوٹے۔ پتا بے حد خوش تھے پر انھیں لگا تھا جیسے یہ ایک سازش ہے، ایک بہتر کام سے دور رکھ کر انھیں استرے کے ساتھ باندھ دیا گیا ہے۔

ان کی دکان کامیشور پنڈت کی دال مل کے پاس خاصی ٹھیک چلی۔ دکان سے انھوں نے سمجھوتہ کر لیا تھا، پر دکان کے ماتھے پر لگا نام پٹ (سائن بورڈ) انھیں کھلتا تھا ہیئر کٹنگ سیلون، ماسٹر نندلال نائی۔ نام پٹ بھی چونکہ کامیشور پنڈت نے ہی بنوا دیا تھا، اس لیے وہ اسے اتار نہیں سکتے تھے، پر نائی ہونے کا ایسا اعلان انھیں تکلیف دیتا تھا۔ ان کے پتا نے ان کا یہ سیلون دیکھا تو بہت خوش ہوئے تھے۔ ان کے خاندان میں پہلی بار کسی کی ایسی دکان کھلی تھی۔ اس خوشی نے نندلال کو اور زیادہ

Scanned with CamScanner

اداس کر دیا تھا۔ وہ سنگیت کے گیانی یعنی گائک یا ساز بجانے والے ہو جاتے، اس کا کوئی خاص تصور انھوں نے نہیں کیا تھا، پر جتنی دیر وہ بجاتے یا گاتے تھے، استرے کی دھار ان کی گردن سے دور ہٹ جاتی تھی۔ یہ استرا عجیب چیز تھا۔ ان کے سامنے کرسی پر بیٹھے آدمی کی حجامت بناتا تھا، پر حجامت بنانے سے پہلے بڑی صفائی سے ان کی اپنی گردن کاٹ کر ان کی اپنی خودداری کو برش، کنگھی، پانی کی پچکاری اور قینچی کے بیچ رکھ دیتا تھا۔ ہر شام انھیں اپنے دھڑ سے الگ ہو گئی خودداری کو دوبارہ اپنے کندھے پر لگانا پڑتا تھا اور تب وہ پاگلوں کی طرح دیر تک ڈھولک بجاتے تھے۔

ایک دن وہ اپنی دکان سے گھر لوٹے تو دہشت سے بھر گئے۔ اب تک ان کے تین بچے ہو چکے تھے۔ بیچ والی بچی کو بٹھا کر ان کے بڑے بچے نے گلے میں چھوٹا سا کپڑا لپیٹ دیا تھا اور کہیں سے آئس کریم کی چھوٹی سی لکڑی کی پٹی اٹھا لیا تھا۔ اسے اس نے استرا بنا لیا تھا اور حجامت بنانے کا کھیل کھیل رہا تھا۔

"اب حجامت ہی بنانی ہے تم سب کو بھی سالو" وہ چیخے تھے اور انھوں نے بچوں کو پیٹا تھا۔ بیوی کی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ اس غصے کا مطلب کیا تھا۔ آخر اور کریں گے کیا؟ کیا وہ دال مل بھی کھول سکتے ہیں؟

وہ دہشت ان پر کئی دن سوار رہی تھی۔ آخر ایک دن انھیں موقع مل ہی گیا۔ وہ قصبہ چھوڑ کر وہ شہر آ گئے۔ شہر میں انھیں ایک چھوٹی سی جگہ رہنے کو مل گئی۔ اب وہ اپنا پچھلا سب کچھ چھوڑ دینا چاہتے تھے۔

موقع انھیں خود بخود ہی ملا۔ کامیشور پنڈت نے اس بیچ دال مل کے سامنے سڑک کے اُس پار ایک مکان بنوا لیا تھا۔ یہیں سے اپنی بیٹی کی شادی کی تھی۔ اس شادی میں انھوں نے سارے باراتیوں کی حجامت بنائی تھی اور یہیں انھیں ان کا چاہا موقع بھی ملا۔ گانے بجانے کے لیے پارٹی شہر سے آئی تھی اور اس گانے بجانے کے بیچ انھوں نے بھی اپنا ہنر دکھایا تھا۔ یہی پارٹی انھیں شہر لے آئی تھی۔ اب وہ گاؤں سے اپنا ہارمونیم بھی لے آئے تھے۔ جھم جھم پانی بھرے کے علاوہ جلدی ہی انھوں نے کچھ فلمی گانے بھی سیکھ لیے تھے۔ مگر اس سنگیت پارٹی میں ان کا زیادہ کام گانا نہیں، بجانا ہوتا

Scanned with CamScanner

تھا، خاص طور سے ڈھولک۔ اور اب ان کا ایک نیا لیکن بیہڑ سفر شروع ہوا۔

اپنا استرا، قینچی وغیرہ انھوں نے کاغذ میں لپیٹ کر صندوق میں رکھ دیا تھا۔ خود اپنی حجامت کے لیے بھی انھوں نے باقاعدہ سیفٹی ریزر اور بلیڈ خرید لیے تھے۔ اب وہ اس پہچان کا سب کچھ اپنے سے دور کر دینا چاہتے تھے جس کی وجہ سے ہر پل اپنا سر کندھوں سے اتار کر نیچے رکھنا پڑتا تھا۔ بچوں کو انھوں نے اسکول بھیجا اور جب بچے پڑھنے لگے تو انھوں نے خود بھی کچھ پڑھنا شروع کر دیا۔

سنگیت پارٹی کا کام زیادہ دن نہیں چلا، پر انھیں ایک تمبو قنات والے کے یہاں کام مل گیا۔ تمبو قنات والے کے یہاں بھی مزدور ان پڑھ تھے۔ اکیلے نندلال ہی ایسے تھے جنھوں نے دو حرف سیکھ لیے تھے، اس لیے دوسروں کے مقابلے میں انھیں زیادہ اہمیت مل رہی تھی۔ تمبو قنات والے کا بہت سا سامان لگاتار ایک درزی کے یہاں تیار ہوتا رہتا تھا۔ اس کی دیکھ ریکھ بھی انھیں کے ذمے تھی۔

سردیوں کے موسم میں انھیں ایک بار پھر اپنے کندھوں پر رکھے سر کو چھپانے کا موقع ملا۔ آریہ سماج کا سالانہ جلسہ تھا۔ وہاں تمبو قنات لگانے کے بعد شام کو شروع ہونے والے پروگرام میں وہ بھی بیٹھ گئے۔ انھوں نے دور سے بہت لوگوں کو بہت طرح سے بھاشن کرتے دیکھا تھا، پر کبھی دھیان نہیں دیا تھا کہ وہ کیا اور کیوں بول رہے ہیں۔ انھوں نے کچھ دھرمی جلسے بھی دیکھے تھے، پر وہ جانتے تھے کہ ان جلسوں کا رشتہ ان سے نہیں ہے۔ وہ جلسے صرف ان کے ہوتے تھے جن کی حجامت وہ بنایا کرتے تھے۔

آریہ سماج کا یہ جلسہ انھیں پسند آیا۔ بڑے مقرر کا بھاشن تو بہت ہی اچھا تھا۔ مقرر نے بڑے پرزور ڈھنگ سے مندروں، مورتیوں، پرانوں کو ڈھکوسلا قرار دیتے ہوئے کہا کہ انھی باتوں سے سماج زوال پذیر ہے۔ ذات پات پر انھوں نے جو کہا وہ نندلال کو پہلی بار لگا کہ ان کے کندھوں پر رکھا ہوا سر سچ مچ انھی کا ہے اور اسے وہ وہیں رکھ سکتے ہیں۔ مقرر نے کہا کہ ذات تو کرم سے ہوتی ہے، جنم سے نہیں؛ اگر کوئی پڑھ لکھ کر ودوان ہو جاتا ہے اور ذات سے شودر ہے تو اسے برہمن ماننا چاہیے۔

جیون میں پہلی بار کسی کی کہی ہوئی باتیں انھوں نے بڑی ہوشیاری سے یاد کر لی تھیں۔ بیوی اور بچوں کے سامنے وہ باتیں انھوں نے کئی بار کئی طرح سے دہرائی تھیں۔ اگلے روز وہ پھر وہ انھی مقرر کو سننے گئے تھے۔ مقرر اپنے بھاشن کے بیچ بیچ بھجن بھی گاتے تھے۔ بھجن کے ساتھ ڈھولک بجانے

وہ شاید اناڑی تھا۔ بنا کسی سے کچھ کہے وہ منچ تک گئے اور ڈھولک خود لے لی تھی۔ بیچ میں مقرر نے انھیں ایک اور منتر رٹائے تھے۔ آریہ سماج نام کی تنظیم سے ان کا رشتہ ایسے ہی بنا تھا۔

پھر انھوں نے باقاعدہ اور محنت سے پڑھنا لکھنا سیکھنا شروع کیا۔ آریہ سماج کی عمارت میں شام کے وقت کچھ لوگوں کو درزی کا کام سکھایا جاتا تھا۔ وہ انھوں نے سیکھا تاکہ سلائی کی ایک دکان کھول لیں، مگر زیادہ دلچسپی یا تو ڈھولک اور ہارمونیم میں تھی یا پھر پڑھنے میں۔ جلدی ہی انھیں پوجا کے کچھ منتر بھی یاد ہو گئے اور تب انھوں نے سنسکار ودھی نام کی ایک کتاب خریدی۔ انھیں یقین تھا کہ اس کتاب کا اچھی طرح مطالعہ کر لینے کے بعد وہ پوجا یا شادی بیاہ کی رسومات ضرور کرا لیں گے اور ان کے دھندے پر آئی ان کی خودداری اس طرح سے ہٹ گئی نہیں۔

یہ تبدیلیاں ہونے کے بعد ان میں بڑی تبدیلی آ گئی۔ اپنے چھوٹے سے گھر کی پتائی کرانے کے بعد انھوں نے سبزی بازار سے خریدی گئی دو پرانی کرسیاں بھی رکھ لیں۔ وہ کچھ ایسے جملے کئی بار ضرور بولتے تھے جس کا مطلب ہو ... پڑھے، جیسے بچوں کو اچھے سنسکار دینے چاہئیں یا انسان اپنے کرموں سے ہی اچھا یا برا بنتا ہے، وغیرہ۔ ایسے زیادہ تر جملے وہ آریہ سماج کے جلسوں سے سیکھ لیتے تھے۔ آریہ سماج میں بھی ان کی اہمیت بڑھ گئی تھی۔ وہاں زیادہ تر لوگ آس پاس چھوٹا کاروبار یا چھوٹی نوکری کرنے والے تھے۔ انھیں اس وقت تو لگ جاتا تھا کہ اتوار کی صبح کی سبھا میں آ جائیں یا کبھی جلسے وغیرہ میں شام گزار لیں، مگر وہاں کی گئی باتوں کو یاد کرنے کا وقت یا موقع ان کے پاس نہیں ہوتا تھا۔ ان کے بیچ نندلال کی قابلیت خاصی اہمیت رکھتی تھی اور لوگ متاثر بھی ہوتے تھے۔ نندلال کے لیے یہ صورتِ حال بہت اطمینان بخش تھی۔ وہ پُرجوش ہو کر مہذب ہوتے گئے اور زیادہ محنت کرتے تھے۔

ایک بڑے مقرر کے بھاشن میں انھوں نے سنا تھا کہ ویدک منتر تین سُروں میں گائے جاتے تھے۔ انھوں نے اکیلے میں اس کی کچھ مشق کی۔ ایک اتوار کو آریہ سماج میں ہونے والے ہون میں اس وقت بہت سے لوگ منتر پڑھ رہے تھے، تھوڑا سا پیچھے بیٹھ کر انھوں نے بھی سُر لگا کر منتر پڑھے۔ پتا نہیں کسی نے دھیان دیا یا نہیں، پر اتوار اسی طرح منتروں کو یاد کرنے کے بعد وہ تھوڑا آگے کھسک آئے اور انھوں نے بھی آہوتیاں دیں (چڑھاوے چڑھائے)۔ اب انھیں لگا، وہ

کامیشور پنڈت سے کہیں، پنڈت جی، دیکھیے، آپ کے آشیرواد سے اب بہت کچھ بدل گیا ہے۔ پر وہ واپس گئے نہیں۔ انھیں لگتا تھا کہ وہاں ان کا جو استرا تھا وہ ان کے ساتھ شاید آج بھی وہی سلوک کرے۔ اس استرے سے اب وہ بڑی ہوشیاری سے دوری بنائے رکھنا چاہتے تھے۔ کبھی کبھی انھیں لگتا تھا کہ استرے کی دھار بہت زیادہ تیز ہوتی ہے۔ کیوں ہوتی ہے اتنی تیز؟ وہ چہرے کے بال ہی نہیں کاٹتی، اس کی دھار سے ان کی گردن کہیں زیادہ صفائی سے کٹتی ہے۔

ایک دن آریہ سماج میں ہونے والی ایک شادی کے دوران ان کے منہ سے ادا کیے ہوئے منتروں کے بیچ اچانک ان کا وہی استرا ان کی گردن سے آ لگا۔

استرے کی ایک خاصیت ہوتی ہے۔ آپ کی انگلی اگر اچانک اس سے کٹ جائے تو ایک لمحے کے لیے آپ کو ہلکی سی گدگدی سی محسوس ہوگی، لیکن ایک لمحے کے بیتتے نہ بیتتے ایک زبردست ٹیس اور جلن ابھر آتی ہے۔

بچپن میں ایک بار پتا کے استرے کو ہتھیلی پر تیز کرنے کا کھیل کرتے ہوئے ان کی ہتھیلی کٹ گئی تھی۔ اس وقت انھیں بالکل ایسا ہی لگا تھا۔ وہ حیران ہوتے تھے کہ کٹنے کے بعد انھیں جو تکلیف ہوئی تھی وہ اس وقت کیوں نہیں ہوئی جب ہتھیلی کٹ رہی تھی؟

استرے سے کٹنے سے وہ بچ نہ سکے تھے۔ ان کا منتر پاٹھ حلق میں ہی کہیں پھنس گیا۔ وہ یقین سے نہیں کہہ سکتے تھے کہ گہری تکلیف نہ ہونے کے باوجود ان کا سر ان کے کندھوں پر ہے یا نہیں۔

شادی کی جو تقریب اس دن تھی، اس میں لڑکے والوں کی طرف سے ایک شخص کو وہ پہچان گئے تھے، کیونکہ اس شخص نے بھی انھیں پہچان لیا تھا۔ اس شخص کو کوتاہ گردن کہا جا سکتا تھا، بلکہ وہ اس سے بھی زیادہ ہی کچھ تھا۔ گردن نام کی چیز اس شخص کے جسم میں تھی ہی نہیں۔ اس کا سر اس کے کندھوں پر ایک چھوٹے موٹے ٹیلے کی طرح جڑا ہوا تھا۔ وہ شخص کامیشور پنڈت کی بیٹی کی شادی میں آیا تھا۔ بارات کے سارے لوگوں کے ساتھ نند لال نے اس کی بھی حجامت بنائی تھی اور چونکہ رات کے منورنجن میں نند لال نے نہ صرف ڈھولک بجائی تھی بلکہ کچھ اچھا گایا بھی تھا، اس لیے اس شخص نے انھیں پہچاننے میں بھول نہیں کی۔

بیاہ کی رسم پوری ہونے کے بعد اس بنا گردن کے شخص نے بہت خوش ہوتے ہوئے کہا تھا،

"میں تو دیکھتے ہی پہچان گیا تھا۔ کیسے ہو؟"

نمسکار کا جواب انھوں نے خاصی بشاشت کے ساتھ دیا تھا۔ وہ خود ایک اندرونی تکلیف سے مر رہے تھے مگر ابھی تک ظاہری طور پر کوئی خاص گڑبڑی نہیں ہوئی تھی۔ پھر کھانے کا وقت ہو گیا۔ آنگن میں کھانے کا انتظام تھا۔ لوگوں کی تعداد زیادہ نہیں تھی۔ دونوں طرف کے ملا کر [illegible] لوگ ہوا کر کوئی چھتیس لوگ ہوں گے۔ آنگن کے چاروں طرف تہہ کر کے چاندنی بچھا دی گئی تھی۔ یہیں بیٹھ کر وہ بھی کھانا کھا رہے تھے۔ اچانک اس بزرگ شخص نے پوچھا، "بھئی، تمھارا نام کیا ہے؟ میں بھول گیا۔"

انھوں نے نام بتایا۔ وہ شخص بولا، "بھائی، تم گاتے بہت اچھے ہو۔ ہم نے تمھیں [illegible] شام آ جاؤ [illegible] یہ بات ہے ایسا [illegible] گا۔"

انھوں نے دھیرے سے ہامی بھری۔ تب ہی اس شخص نے پوچھا، "ہاں تم نے اپنی دکان بند کر دی ہے کیا؟ میں ایک بار گیا تو دکان بند ہی تھی۔"

اس شخص نے ایک گانے کا بول دہرا کر گاتے ہوئے کہا، "کاشی ور پنڈت کی بیٹی کی شادی میں گایا تھا تب [illegible] کا گانا سنا تھا۔ [illegible] کیا گایا تھا! آپ تو تھے [illegible] لوگوں کی ہمت بڑھ [illegible]۔ تب تو ہم سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ کیا اتنا عمدہ گاتے ہیں [illegible] سماں باندھ دیا تھا۔"

لوگ کھاتے کھاتے انھیں دیکھنے لگے۔ انھوں نے کسی کی طرف نہیں دیکھا، پر وہ جانتے تھے کہ لوگ انھیں دیکھ رہے ہیں اور ان کے پاس کوئی ایسی جادوئی شکتی نہیں تھی کہ وہ لوگوں کے دیکھتے دیکھتے غائب ہو سکتے۔

مگر یہ سوچنا بھی شاید صحیح نہیں تھا۔ وہ غائب تو ہو رہے تھے۔ دیکھتے دیکھتے منتر پڑھ کر [illegible] والے اور گانے بجانے کے لیے معروف نندلال اس کوتاہ گردن شخص کی بات ختم ہوتے ہوتے سیٹی بجاتے ہوئے آسمان تک جانے والی آتش بازی کی ڈبی کی طرح اوپر گئے اور خالی ہو کر نیچے گر رہے۔ اب وہاں صرف نندلال نائی بچ گیا تھا۔

ان کے ذہن میں [illegible] بے مزہ اور روکھا ہو گیا تھا۔ لیکن وہ ایک ایسی مشین کی طرح [illegible] رہے تھے جو نوٹ چھوٹ کر [illegible] میں تبدیل ہو چکی ہو۔ اور اسی کے بعد انھوں نے محسوس کیا تھا کہ وہ

جہاں پیشاب کرتے تھے وہاں چیونٹے لگنے لگتے تھے۔

بہت کوشش کے باوجود، اب وہ دوبارہ وہ نہیں ہو پائے جو ہونے کے بعد وہ خاصے مطمئن رہنے لگے تھے۔ ایک بار انھوں نے گاؤں لوٹنے کا بھی فیصلہ کر لیا تھا۔ بوکھلا کر بچوں نے پوچھا تھا، "وہاں کیا کریں گے؟"

"وہی جو پشت در پشت کرتے آئے ہیں،" انھوں نے بڑی گمبھیرتا کے ساتھ کہا۔ پر گھر والے ہی نہیں، خود ان کی قوتِ ارادی نے ان کا ساتھ نہیں دیا تھا۔ لیکن وہ جانتے تھے کہ اب ان کے اندر کی کوئی چیز ان کا ساتھ دینے کو تیار نہیں تھی۔ کبھی انھوں نے آئینے میں دیکھ کر بچوں سے کہا تھا، "ابھی پچیس سال کی عمر تک میرے بال پکیں گے نہیں۔" پر انھوں نے دیکھا، بال چاندی تک پکنے لگے تھے۔ طبلے پر انھوں نے کبھی مشق کی ہی نہیں تھی۔ وہ اس جوش میں خرید لائے تھے کہ آریہ سماج کے بھجن گانے والے کی سنگت وہ ڈھولک نہیں، طبلے سے کریں گے۔ پر ذیابیطس کے لیے طبلے میں رات بھر رکھا پانی پینے کے لیے انھوں نے دایاں بے جھجک کھول ڈالا تھا۔ اب انھیں بہت اُداس تو نہیں محسوس ہوتا تھا، لیکن جامن کے تنے کی چھال وہ لے ہی آتے تھے۔ آج بھی وہ جامن کے درخت کی وہی چھال لے کر لوٹ رہے تھے۔ اسے چندن کی طرح سل پر رگڑنے میں بھی تو وقت لگتا تھا۔ پر کہاں ہے ان کا گھر؟

اچانک انھیں کچھ یاد آیا۔ اپنے پتا سے جو آسیب ان کے وجود میں نسلی ورثے کی طرح آیا تھا، وہ اتنے دن چپ رہنے کے بعد اس بے گردن شخص کے کچھ جملوں سے ہی جیسے بلبلا کر ان کے اندر دوبارہ جیسے اٹھ پڑا تھا۔ کیا یہ اسی آسیب کی کرتوت تھی کہ وہ اپنا گھر بھول گئے تھے؟ یا سب کچھ چھوڑ کر اپنی آسیبی طاقت سے اس نے صرف ان کا گھر غائب کر دیا تھا؟

اپنی تمام احتیاط کے باوجود وہ حادثہ پھر ہوا۔ اب تھوڑا اندھیرا بھی ہونے لگا تھا۔ انھیں لگا، ان کی گلی کچھ زیادہ ہی لمبی اور گھماؤدار ہو گئی ہے۔ کچھ پہچان کی چیزیں انھوں نے ڈھونڈنے کی کوشش کی۔ پر [illegible] صاف کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ [illegible] وہ مانا نہیں ماننا چاہتے تھے۔ [illegible] رہے تھے۔ جہاں وہ رکے تھے وہاں [illegible] ایک بہت چوڑی اور [illegible] [illegible] تھے۔

Scanned with CamScanner

سے تو کوئی گلی کسی چوڑی سڑک پر نہیں نکلتی تھی۔

ٹھیک اسی وقت شاید بتی چلی گئی۔ یا شاید یہ بھی ان کا وہم ہو۔ ان کے اندر یک گھڑگھڑاہٹ کے ساتھ کوئی چیز گھومی جیسے کوئی لوہے کا پہیہ، اور پھر اس کی رفتار بڑھنے لگی۔ بڑھتی رفتار کے ساتھ ایک تیکھی، جیسے میں سوراخ کرنے والی آواز بھی بڑھنے لگی۔ اس گھپ اندھیرے میں تیز گھومتے پہیے پر ٹکے ہوئے انھوں نے اپنے دونوں ہاتھ پھیلائے، پر وہ کہیں پہ تو بھی چھو نہیں پا رہے تھے۔

❁ ❁

مدرارا کھشس

ہندی سے ترجمہ: زیبا علوی

ایک بندر کی موت

دور سے سننے والے کو وہ رونے کی آواز بھی لگ سکتی ہے۔ یہ جستجو اس گلی میں رہنے والا کوئی نہیں کرتا کہ وہ گانے کی آواز ہے یا رونے کی۔ گلی میں رات کوئی ایک بجے سے خاموشی ہوتی ہے، تب وہ آواز صاف سنائی دیتی ہے۔ ویسے وہ آواز رونے کی نہیں، گانے کی ہے۔ ایک بوڑھی، بے حد دبلی عورت گاتی ہے۔ گلی کے تیسرے ادھ گرے مکان کی اوپری منزل پر ایک کمرہ ہے اور کمرے کے آگے ٹین کا سائبان۔ ٹین روکنے والی لکڑیوں کو ایک لمبے عرصے سے کیڑوں نے کھایا ہے اور ان میں سے ایک کسی مری کی ٹانگ کی طرح لٹک آئی ہے۔ سائبان کے بیچوں بیچ فرش پر ایک بڑا سا سوراخ ہے جس سے نیچے سے کمرے کے اندر جھانکا جا سکتا ہے۔ اسی سوراخ کے پاس بیٹھ کر وہ گاتی ہے۔

وہ کیا بناتی ہے، کیا کھاتی ہے، کوئی نہیں جانتا۔ گو کہ اس میں رہنے والے ہر کسی کا ہر کسی سے واسطہ ہے، پھر بھی اس بوڑھی عورت سے ہر کوئی بے خبر ہے۔ خود اس کا بیٹا مجّو بھی۔ شاید ہی کبھی کسی نے مجّو کو اوپر جاتے دیکھا ہو۔

صرف ایک بار لوگوں کا دھیان اس عورت کی طرف گیا تھا۔ پر وہ بہت پرانی بات ہے، شاید تیس بتیس یا اس سے بھی زیادہ۔ وہ چھوٹا سا دو منزلہ مکان اس وقت بھی ایسا ہی تھا۔ نیچے کے کمرے میں کھلنے والا چھت کا وہ دو بالشت دائرے کا سوراخ بھی ایسا ہی تھا۔ پر اس وقت اس میں ایک الگ ہی قسم کی زندگی ہوا کرتی تھی۔ کچھ مزدور صبح شام آتے تھے۔ یہ صبح بھری ہوئی بوری لاتے تھے اور

شام کو لے جاتے تھے۔ بورے میں [illegible] اور ہر کے دانے ہوتے تھے۔ شام کو جب وہ لے جاتے تھے تو وہی بوری میں [illegible] ہوئی تھی۔ ایک بڑی بوری میں ادھر کے دانوں سے چھلکے ہوتے تھے، جنہیں کوئی اڑا لے جاتا تھا، اور ایک چھوٹے تھیلے میں دانوں کے چھوٹے ٹکڑے ہوتے تھے۔

دراصل [illegible] پر اس عورت نے ایک چھوٹی سی چکی لگا رکھی تھی۔ اسی میں وہ سارا دن [illegible] مٹی بھر بھر کر ڈالتی تھی اور چکی سے چاولوں اور دالوں اور چھلکوں کا ڈھیر نکل جاتا تھا۔ [illegible] فرش پر [illegible] جاتی تھی۔ [illegible] جانے [illegible] سب کا [illegible] انگوٹھے [illegible] ہو جاتے تھے۔

عورت چکی چلاتے وقت بڑے [illegible] سے پرانے گیت گاتی تھی۔ میں کتنے من [illegible] کوٹوں [illegible] میں [illegible] ساس ماتھے سے [illegible] برتنوں کا اونچا ڈھیر دے رہی ہے...

اس وقت [illegible] پاس کے سب لوگوں [illegible] وہ عورت گاتی ہے۔ پر اس کے بعد ایک دن [illegible] بھاری [illegible] ہو گیا۔ پڑوس کے [illegible] بچے [illegible] عورت نے اپنے بچے کے ساتھ مل کر چھت کے چھید سے نیچے فرش پر [illegible] اس پر ہوا نہیں [illegible] تھے، کھیلتے بھی تھے۔ [illegible] میں ایک بچے نے چکی کے [illegible] چھید میں ایک موٹا پانی ڈال [illegible] اس عورت کے لیے یہ کوئی خوش ہونے والا واقعہ نہیں تھا [illegible] نہ صرف بہت ساری [illegible] کا نقصان ہوا تھا بلکہ چکی بھی [illegible] کام [illegible] نہیں [illegible] تھی۔ [illegible] بہت [illegible] اس [illegible] دکھائی دینے لگے اور بال جیسے [illegible] ہو گئے تھے۔ شرارت کرنے والا بچہ ابھی تک پاس رہا تھا، پر اسے [illegible] عورت نے غصے سے [illegible] ایک زور [illegible] دیا۔

[illegible]

سے جنگلی جانور ایک ساتھ چھوڑ دیے ہوں۔ محلے کی گلیوں کی ایک خاص صفت ہوتی ہے۔ جہاں عام طور پر زیادہ بھیڑ نہیں دکھائی دیتی اور زیادہ تر لوگ اس سے، بے جان سے لگتے ہیں، وہیں چھوٹے سے چھوٹے واقعے پر یہ بڑی مستعدی سے اور زیادہ سے زیادہ تعداد میں جمع ہو جاتے ہیں۔ یہی ہوا۔

اس کے بعد پولیس نے تو کوئی خاص کارروائی نہیں کی، پر اس چھت پر چکی کی آواز بھی بند ہو گئی اور گانے کی بھی۔ وہ عورت کہیں چلی گئی۔ اس کے ننھے بیٹے بجڑو کو شاید نہ تو اس کے وہاں ہونے سے کوئی خاص سروکار تھا اور نہ اس کے غائب ہو جانے سے۔ جب سب بچے چھت کے چھید سے تڑتی دال پر انگوچھے سے ہوا کرنے کا مزہ لے رہے ہوتے تھے، بجڑو گلی کے موڑ کے دھوبی کی استری میں کوئلے سلگاتا ہوتا تھا یا گلی کے مہانے پر شیامسندر حلوائی کے چبوترے پر بیٹھا، امرتیوں کے لیے اڑد کا آٹا گھوٹتا رہتا تھا۔ بجڑو کے لیے وہ سب کام اس سے بہتر تھے جو اس کی ماں کیا کرتی تھی۔ ماں کا کھانا بھی کچھ عجیب سا تھا جو بجڑو کو کبھی پسند نہیں آیا۔ ماں جس ارہر سے چکی پر دال تیار کرتی تھی، اسی کا ایک حصہ اسے مختانے میں مل جاتا تھا۔ وہ یہی دال ایک برتن میں چڑھا دیتی تھی اور پکتے وقت اس میں آٹے کی ٹکیاں بنا کر ڈالتی جاتی تھی۔ باسی ہونے پر اسے یہ کھانا اور لذیذ لگتا تھا۔

پر بجڑو نے شاید ہی کبھی وہ کھایا ہو۔ اس کی ماں کو بھی اس بات کا ملال کبھی نہیں ہوا۔ کبھی کبھی بہت پڑھی لکھی اور کھاتی پیتی دنیا کے خاندانوں میں بھی یہ ہوتا ہے: والدین کی دنیا سے بیٹے کی دنیا کٹ کر رہ جاتی ہے، پر ایسا کچھ عمر زیادہ بڑھنے پر ہی ہوتا ہے۔ بجڑو اور اس کی ماں کی دنیا اس وقت سے الگ ہو گئی تھی جب سے بجڑو نے تھوڑا سا چین بولنا سیکھا تھا۔ اسے لگتا تھا کہ ماں کا کام بھی گھٹیا قسم کا ہے اور اس کا بنایا کھانا بھی۔ وہ گاتی ہے یا روتی ہے، اس پر بھی اس نے کبھی دھیان نہیں دیا۔

ماں غائب ہو گئی تب بھی بجڑو کو کوئی خاص فرق نہیں پڑا تھا۔ اور جب وہ اسی طرح بغیر آہٹ واپس لوٹ آئی تب بھی بجڑو پر کوئی خاص اثر نہیں ہوا۔ بجڑو کی عمر میں ضرور اضافہ ہو گیا تھا اور جو کچھ اپنے ننگے بدن پر وہ پہنتا تھا اس سے باہر اس کے جسم کے حصے کچھ بڑھ گئے تھے۔ اتنے برسوں میں مکان بھی کچھ زیادہ پرانے ہو گئے تھے اور گلی بھی [illegible] میں جڑی ہوئی [illegible] سے [illegible] سے تھے۔ پر سب سے بڑی تبدیلی کچھ دور سے ہی دکھائی دے جاتی تھی۔ گھروں میں سب [illegible] استعمال زیادہ تھا اور ہر باشندے نے پانی کے سینٹرل [illegible] لگوا لیے تھے۔

سرکاری زبان میں اس 'ترقی' نے گلی کی شکل کچھ عجیب ہی کر دی تھی۔ گلی کے سرے پر جو بجلی کا کھمبا تھا اس پر سرکاری تار صرف پانچ تھے، پر گھروں میں جو تار بتی جلانے کے لیے تھے ان کا گچھا بہت بھاری ہو گیا تھا۔ دور سے دیکھنے پر لگتا تھا وہ بجلی کا کھمبا نہیں، مکڑی کا جال اتارنے والا ایک بانس ہو جس پر بری طرح مکڑی کا جالا لپٹ گیا ہو۔ اتنی ہی عجیب شکل مکانوں کے چبوتروں کے پاس پانی کے نلوں کی تھی۔ وہاں اتنے زیادہ نل تھے کہ وہ مکان نہیں کسی کارخانے کے بوائلر لگتے تھے۔

انہی میں سے ایک میں اب ایک زنجیر سے ننھا بندر رہتا تھا۔ یعنی ایک بندر۔ یہ بندر عتیق آٹھ روپے دے کر خرید لایا تھا۔ بندر بالکل بندر جیسا ہی لگتا تھا، پر عتیق نے پیار سے اس کا نام رکھ دیا تھا ذہین الدین۔ اس کا خیال تھا کہ وہ ننھا بندر بے حد سمجھدار ہے۔ پر یہ نام زیادہ چلا نہیں۔

ان دنوں کچھ لوگ ایک تحریک چلا رہے تھے۔ اسے وہ 'ہندو جاگرن ابھیان' کہتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ سارے ہندو سو رہے تھے اور مسلمان جاگ رہے تھے۔ مسلمان جاگ رہے تھے اس لیے مزے لوٹ رہے تھے۔ اس تحریک کے چلتے پاس کی کالونی کے لڑکے بہت پرجوش تھے۔ یہ کالونی شہر کے بیچ ایک بڑے راجہ کے باغیچے میں بسائی گئی تھی جو شہر کی گھنی آبادی کے بیچ ایک خوبصورت نخلستان تھا۔ اس میں سنگت رام جوہری کی بھی کوٹھی تھی، اور بجلی کا سامان بیچنے والے اننت مشر کی بھی۔ اس میں کچھ ریٹائرڈ افسر بھی رہتے تھے اور بین الاقوامی ہندی تحریک چلانے والے ٹھاکر سرودمن کا مکان بھی یہیں تھا۔ ان لوگوں کی لڑکیاں شادی سے پہلے پڑھائی اور پوشیدہ پریم میں مگن رہتی تھیں اور لڑکے بیچ کے چھوٹے پارک میں کرکٹ کی مہنگی تھاپیوں سے ایک قسم کی ٹھوس گیند کھیلتے رہتے تھے۔ یہ لڑکے ایسے جلوسوں میں کافی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے جن سے انہیں اپنے دھرم کا سمبندھ دکھائی دے جائے۔ 'ہندو جاگرن ابھیان' میں بھی وہ حصہ لے رہے تھے۔ اس کالونی سے بڑی سڑک کی طرف نکلنے کے لیے ایک بڑا پھاٹک تھا اور ایک پتلی سی گلی۔ اس گلی کے دونوں طرف بھی راجہ صاحب کے نوکروں کی کوٹھریوں کی قطار تھی۔ وہی کوٹھریاں اب کوئی آدھی صدی کے عرصے میں چھوٹے چھوٹے دومنزلہ مکانوں میں تبدیل ہو چکی تھیں جن میں سے کئی کئی میں چار یا پانچ خاندان بھی رہتے تھے۔ جس سے کبھی راجہ کے ہاتھی اندر آتے تھے اس شاندار اور وسیع پھاٹک کے دونوں پایوں میں درزی، حلوائی، پرچونی اور انڈے مکھن بیچنے والوں کی دکانیں تھیں اور اوپر کی منزل میں

راجہ صاحب کے خاندان کی رہائش تھی اور ایک بڑی سی تختی جس پر لکھا تھا: "مہاراج ادھیراج گوپو رائے ہاؤس"۔

"ہندو جاگرن ابھیان" کا چھوٹا سا جلوس لے کر گلی سے گزرتے ہوئے مہاراج ادھیراج کا پوتا، سنجے کمار سنگھ عرف منو، عتیق کے بندر کو دیکھ کر ایک دم بھڑک اٹھا۔ اس نے سینہ پھلا کر پان مسالے کی پیک تھوکتے ہوئے رعب دار آواز میں للکارا: "ابے و عتیق کے بچے، باہر نکل!"

عتیق بڑا ہی کمزور تھا۔ دبی آواز میں اس نے پوچھا: "کیا بات ہو گئی راجہ بھیا؟ میں نے تو آپ کی جھنڈی لگا رکھی ہے۔"

"ابے تجھوا لگا کر کون سا احسان کیا تو نے رے؟ جھنڈا نہیں لگائے گا تو کیا پاکستانی جھنڈا لگائے گا؟ یہ بندر تیرا ہے؟" سنجے کمار سنگھ عرف منو نے پوچھا۔

"میرا ہے راجہ بھیا، کیوں؟"

"کیا نام رکھا ہے اس کا؟"

"اس کا؟ اس حرامی کا نام کیا ہوتا! پر میں نے اس کا نام ذہین الدولہ رکھا ہے۔" کہہ کر عتیق ہنسا۔ "سالا بندر ہو کر خاصا ذہین ہے۔"

تب تک "راجہ بھیا" کے لقب سے مخاطب کیے گئے منو لڑکے نے اس کا گلا پکڑ لیا۔ عتیق چلایا۔ بہت بھدی گالیاں دے کر اپنے ساتھیوں سے بولا: "حرامی، شری رام بھگت ہنومان کو بندر بتا رہا ہے؟ اسے … بندر ہے؟"

سمجھتے ہی ہیں، وہ تھوڑا سا پٹا، زیادہ نہیں۔ ان لوگوں کی دلچسپی پیٹنے سے زیادہ اپنی بات کا وزن ثابت کرنے میں تھی۔ اچانک راجہ بھیا کو یاد آیا: "اور ہاں، یہ ذہین الدولہ کیا نام ہوا؟ یہ بندر مسلمان ہے؟"

گلی میں بہت لوگ بھی اس دلیل پر حیران ہوئے۔ خود عتیق بھی بہت جلدی سمجھ گیا کہ بندر مسلمان نہیں ہے۔

اس واقعے کے بعد عتیق نے بندر کا نام بدل دیا۔ اب اس نے اس کا سیدھا سا نام منے رکھ دیا۔ لیکن اس نئے نام کے ساتھ ایک مصیبت بھی کھڑی ہو گئی۔ ایک دن بہت صبح پورے شہر میں اتھل

چتھل مچ گئی۔ ہر کوئی آس پاس کے بندروں کی مورتیوں کو دودھ پلانے بھاگا جا رہا تھا۔ عورتیں، مرد، بچے، بوڑھے سبھی۔ راجہ کے باغیچے کی کالونی میں بنے ایک مندر میں بھی یہی ہو رہا تھا۔ لوگ خوشی سے اچھل رہے تھے۔ بھگوان دودھ پی رہے تھے، سچ مچ۔ لوگ مورتی کے منہ کے پاس چمچہ لگاتے تھے اور دودھ دھیرے دھیرے غائب ہو رہا تھا۔ سنجے کمار ستو عرف ملّو عرف راجہ بھیا سب بندوبست دیکھ رہا تھا اور دودھ کا انتظام بھی۔ سارے شہر میں ہی نہیں، سارے دیش میں یہ ہو رہا تھا، یہ کیا جا رہا تھا۔

پر اس سے نہ عتیق کا کوئی تعلق تھا نہ ہی اس کے بندر ننھے کا۔ عتیق اپنے بندر کو ہر صبح سرکاری ڈیری سے ملنے والا سستے دودھ کا آدھے لیٹر والا ایک پیکٹ دیتا تھا۔ جلدی ہی بندر دانت سے اس میں سوراخ کر کے سیدھے اسی سے دودھ پینا سیکھ گیا تھا۔ کبھی کبھی یہ پیکٹ عتیق اس کے لیے پجو سے بھی منگا لیتا تھا۔ پجو پیکٹ بندر کی طرف اچھال دیتا تھا اور بندر ہوا میں کسی نٹ کی طرح قلابازی کھا کر اسے تھام لیتا تھا۔

جس دن مندروں میں مورتیاں دودھ پی رہی تھیں اس دن سارے شہر سے دودھ غائب ہو گیا تھا۔ دودھ پلانے کے لیے سب جاں لوگوں کی کافی مدد راجہ بھیا نے کی تھی۔ جہاں کہیں بھی دودھ ہو سکتا تھا، وہاں سے وہ جٹا رہا تھا۔ کہ تبھی اس نے دیکھا، عتیق دودھ کا ایک ننھا پیکٹ لیے جا رہا ہے۔ راجہ بھیا نے کسی باز کی طرح اسے دبوچا۔ "ابے تو یہ دودھ کہاں لیے جا رہا ہے؟ کیا بازی کرے گا؟"

"کیا بات کرتے ہیں راجہ بھیا" عتیق گھبرا کر بولا، "میں تو یہ ننھے کے لیے لے جا رہا ہوں۔"

"ننھے؟ ننھے کون ہے بے؟"

"ننھے، وہی اپنا بندر۔"

"بندر! یہ سالا بندروں کو دودھ پلائے گا!"

اس دن عتیق [illegible] بندر [illegible] گرفتاری لگائی۔ عتیق [illegible] اندرونی حیثیت سمجھ گیا۔ وہ وہاں سے [illegible]

دیکھ گیا تھا۔ عتیق اس کے بعد اس سے اتنا کھنچ گیا تھا کہ اس نے اسے ننھے نام سے بھی پکارنا بند کر دیا تھا۔ پہلے اسے اپنی دکان کے کمپیوٹر کے ساتھ ساتھ بندر سے بھی لگاؤ تھا، پر اب اس کی دلچسپی کمپیوٹر تک ہی رہ گئی تھی۔

کمپیوٹر بجلی سے کام کرنے والی ایک خاصی ترقی یافتہ مشین ہے۔ عتیق کسی وقت گلی کے اپنے اسی تنگ سے گھر میں چھاپ خانے کے لیے چھوٹی موٹی کمپوزنگ کیا کرتا تھا۔ ایک بار سعودی عرب سے لوٹے اس کے کسی دوست نے اسے یہ مشین دکھائی۔ کچھ نقد کچھ ادھار رقم جٹا کر عتیق لے آیا۔ اس کے ذریعے وہ کمپوزنگ سے زیادہ کچھ بھی کر لیتا تھا۔ اس مشین نے مجّو کو بھی اپنی طرف کھینچا۔ کچھ دن وہ بڑی لگن سے اس کی صفائی کرتا رہا، پھر ایک دن اس نے ہمت کر کے اس پر انگلیاں بھی چلائیں۔ دھیرے دھیرے عتیق سے زیادہ اچھا کام وہ خود کرنے لگا، خاص طور سے تصویریں بنانے والا کام۔ چونکہ پڑھا لکھا نہیں تھا، اس لیے عبارت میں مار کھا جاتا تھا۔

مجّو کمپیوٹر پر کام کرتا تھا، پر مزدوری یا نوکری نہیں۔ یہ بھی ہوتا تھا کہ صبح وہ تھوڑا سا کام بجلی کی اس مشین پر کرے، پھر دوپہر کو تھوڑا کام کسی حلوائی کی بھٹی پر کرے اور شام کو منگت کی مسا۔ پیسے والی مشین کی صفائی کر آئے۔ ایک دن بہت بڑا کام اسے بغیر کسی دوڑ دھوپ کے مل گیا تھا۔ گلی کے اسی بجلی کے کھمبے کے تاروں سے لٹک کر ایک مرتبہ ایک بندر مر کر نیچے آ گرا تھا۔ گلی والوں نے دیکھا، گلی جہاں بڑی سڑک سے ملتی ہے وہیں پر مجّو ایک نئے سرخ کپڑے کے ٹکڑے پر بندر کی لاش لے کر بیٹھا ہے۔ لاش پر کسی نے گیندے کے پھولوں کا ہار ڈال دیا تھا۔

شام تک اس کا وہ لال کپڑا سکوں سے بھر گیا تھا۔ بندر کی لاش کے لیے گلی کے ہی اکرم نے ومان (جہاز) بنانے کا سامان دے دیا۔ اکرم پتنگیں بناتا تھا۔ اکرم کے دیے پتلے لال پیلے کاغذ اور بانس کی چری ہوئی تیلیوں سے ناؤ جیسا ایک ومان بنایا گیا اور آس پاس کے لوگ بڑی عقیدت کے ساتھ بندر کی وہ لاش ندی کے کنارے گاڑ آئے۔ تب وہاں راجہ بھیا نے کیرتن بھی کرایا تھا۔

مجّو کی ماں ایسے ہی دنوں میں واپس آئی تھی۔ زیادہ لوگوں نے اسے نہیں دیکھا تھا، پر جو جا بہت دور تک ہو۔ گپ چپ۔ کسی نے اسے اس کے بعد نیچے اترتے نہیں دیکھا۔ کوئی اوپر بھی نہیں

گیا۔ کوئی بچہ بھی نہیں۔ اتنے برسوں میں اور مرے دال بنانے کا کام بھی بند ہو گیا تھا۔ مجھو کی ماں اب بچی کا گیت نہیں گاتی تھی۔ بہت زیادہ رات بیت جانے پر جو سنائی دیتا تھا وہ ایک دوسرا ہی گانا تھا، بہت دھیما ایک سیاپے جیسا۔ کبھی کبھی بہت دھیان دینے پر پتا لگتا تھا وہ گا رہی ہے — "پیٹھ دیکھو رے مائی' میری پیٹھ دیکھو، جیسے دھوبی کا پاٹ، اس طرح مارا ہے۔"

مجھو کو جلد ہی ایک بار پھر لوگوں نے ایک مرا ہوا بندر دے کر بھیج دیا۔ اسی طرح لال کپڑے پر سجائے۔ اس بندر کو لوگوں نے گلی میں مرتے نہیں دیکھا تھا۔

"یہ کیسے مرا؟" گلی کے ایک لڑکے نے پوچھا۔

"گر کر۔"

"کہاں گرا تھا؟"

"وہاں، امانی گنج میں۔"

"اب یہ تیرے بدن کو کیا ہوا؟ کیا بندر کے ساتھ تو بھی گرا تھا؟"

مجھو ناراض ہو کر چپ ہو گیا۔ اس کے کندھے اور پیٹھ پر خراشیں اور چوٹیں تھیں۔ اس کے لال کپڑے پر اس بار اور زیادہ پیسے جمع ہو گئے، کیونکہ یہ منگل کا دن تھا، جب لوگ ہنومان کی پوجا کرتے ہیں۔ اگلے روز باقاعدہ جلوس کے ساتھ لے جا کر اس بندر کو بھی زمین میں دبا دیا گیا۔ مجھو پھر اپنے معمول کے کاموں میں لگ گیا — حلوائی کے یہاں بھٹی تیار کرنا اور کمپیوٹر کی دم سے بندھے چوہے کی مدد سے تصویریں تیار کرنا۔ اس کے علاوہ ایک اور کام بھی اس کا تھا۔ وہ فرصت کے وقت میں عتیق کے بندر کو چھیڑتا تھا اور اس طرح اس کو نہیں، دوسرے لوگوں کو بھی مزہ آتا تھا۔ لیکن معلوم نہیں کیسے مجھو سے اس کام میں گڑبڑی پیدا ہو گئی۔ عتیق کا بندر اس سے چڑنے لگا۔ بہت زیادہ ہی۔

اس کے چڑنے پر مجھو کو جھنجھلاہٹ ہوتی۔ ایک دن اس نے سوچا کہ وہ اس بندر کو ایک تھپڑ رسید کرے۔ نزدیک جاتے ہی وہ ننھا بندر زور سے چیخا اور اچھلا، پھر اچھل اچھل کر چیختا ہی گیا۔

مجھو کے نزدیک جانے پر بندر کے اس طرح اچھلنے اور چیخنے پر لوگوں کا بھی دھیان گیا۔

مجھو عتیق کے لیے کسی گاہک سے چیک لینے گیا تھا۔ گراہک نے چیک تو نہیں ہی دیا، پرچے پر بنائی ہوئی تصویروں میں بھی جم کر نقص نکالے۔ تصویریں مجھو ہی نے بنائی تھیں اور بری تو نہیں ہی

تھیں۔ وہ خاصا ہی کھسیا ہوا تھا۔ عتیق کی دکان کے پاس پہنچنے پر اس نے دیکھا غل سے بندھا بندر بری طرح چیختا ہوا اچھلے جا رہا تھا۔

عتیق کی دکان کے سامنے والے مکان کے چبوترے پر پان مسالے کے چھوٹے چھوٹے پیکٹوں کی لڑیوں، اور سگریٹ بیڑی کی ایک ننھی سی دکان تھی۔ یہ دکان گنگارام بڑھئی کے مرنے کے بعد اس کی بیوی نے کھول لی تھی۔ دکان پر بہت چھوٹے بچوں کی پسند کی بھی کچھ چیزیں بکتی تھیں۔ چبوترے کی اس دکان کے آس پاس خالی چبوترے پر گلی کے کئی جوان لڑکے آ بیٹھتے تھے۔ چونکہ ان کے پاس بہت زیادہ خالی وقت ہوتا تھا، اس لیے ایک دوسرے کو گالیاں دینے کے علاوہ وہ عتیق کے بندر سے چھیڑ خانیاں بھی کرتے تھے۔ انھیں بھی مجو کے ساتھ بندر کے اس بدلے تیور پر تعجب ہوا۔

''ابے سالے نے کسی نے بندریا کو چھیڑا ہوگا۔'' ان میں سے ایک نے کہا اور سب بے تکے مذاق پر بھی ہنسے۔

آج مجو نے بندر کو بالکل نہیں چھیڑا تھا، بلکہ اس کی طرف دیکھے بغیر دکان پر آ کر کمپیوٹر کے سامنے بیٹھ گیا تھا۔ وہ بندر اس کی بے توجہی کے باوجود اسی طرح چیخ رہا تھا۔

''تعجب ہی ہے۔'' عتیق ادھ جلی سگریٹ جیب سے نکال کر سلگاتا ہوا بولا، ''آخر تو نے اس کے ساتھ کیا کیا ہے؟''

''میں کسی دن اس کی گردن مروڑ دوں گا۔'' چڑ کر مجو نے کہا۔

''ہاں۔ اس کی گردن مروڑ دے، پھر لال کپڑے پر اس کی لاش لے کر بیٹھ جا'' عتیق نے طنز کیا۔

عتیق کے اس طنز پر مجو کو جیسے مرچیں چڑھ گئی۔ اس نے کمپیوٹر کے چوہے پر سے ہاتھ ہٹا لیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

''ابے کیا ہوا؟''

مجو نے عتیق کو جواب نہیں دیا۔ دکان سے نیچے اترا اور ایک طرف چل دیا۔

''ابے، حد ہو گئی! سالا بنا کوئی جواب دیے ہی سرک لیا۔''

''عتیق میاں اس مجو کے بچے کو بھی، اسی بندر کے ساتھ بیٹھا دو۔ اچھا تماشا رہے گا۔'' لڑکے

Scanned with CamScanner

بچے اس بھونڈے سے مذاق پر کھل کھلا کر ہنسنے لگے۔ عتیق نے بڑبڑاتے ہوئے سگریٹ جلائی اور خود بھی [illegible] تصویر۔ پردے کے بیچ گنیش کی ایک تصویر تھی اور کونے پر ایک تکونا جھنڈا تھا۔ یہیں پر مذہبی جشن کا پرچہ تیار ہو رہا تھا۔ پرچے کے کونے میں جھنڈا بنا تھا اور جھنڈے سے [illegible] گنیش کی تصویر [illegible] گنیش کے پیر کے پاس ایک چوہا بھی بنا دیا تھا۔

عتیق چیخ گیا۔ "اس کو تو دیکھو۔ سالی اپنی تصویر بھی بنا دی ہے۔"

[illegible] کے ہوش میں آئے۔ "اپنی تصویر؟ [illegible] سب نے [illegible] سمجھا۔"

"[illegible]" عتیق [illegible]۔ "[illegible] کا جھنڈا ہوگا۔ اس سے [illegible] گنیش جی کی تصویر [illegible]۔ [illegible] ہوگا۔ [illegible] گا؟ [illegible] دکھائے گا۔ عقل [illegible] نہیں۔"

عتیق سے [illegible] جھنڈے سے بیچ گنیش کی تصویر [illegible] گا مگر جلدی ہی [illegible] کی طرف چلا گیا۔ [illegible] اور [illegible] ہے۔ یا چاہے [illegible] کیا کہاں؟ [illegible] نہیں تھا۔

دراصل اپنے [illegible] گلی [illegible] ہی [illegible] گیا۔ [illegible] جا رہی تھی۔ جیسی [illegible] وہ [illegible] کی [illegible] کی شوہر کے ساتھ [illegible] تک چلتا تھا [illegible] کی سبزی کی لوٹ [illegible] کے ساتھ ساتھ بچے بھی [illegible] چلتے تھے۔ آج [illegible] کشش میں وہ [illegible] بھی [illegible] اور [illegible] سے ساتھ پھول اچھالے جا رہے تھے، پر اس کے ساتھ نہیں تھے۔

یہ [illegible] ہے؟ [illegible] اچھالے گئے تھے بچے بھی اٹھاتے تھے، پر اس کام میں [illegible] کامیاب ہوتا تھا، کیونکہ وہ بڑا تھا، بچوں [illegible] بھی سکتا تھا۔ اعتراض کوئی [illegible] لیے نہیں کرتا تھا [illegible] بچوں جیسا ہی [illegible] تھا۔ پر اس [illegible] نہیں اچھالے جا رہے تھے۔ اس کی موت سے [illegible] ہو سکتا تھا بھلا؟ وہ [illegible] میں [illegible] چلا گیا۔

جب وہ گلی کی طرف [illegible] اس وقت خاصی رات بیت چکی تھی۔ بہت رات تک جاگنے والی

عورتیں بھی سو گئی تھیں یا خاموش تھیں۔ اس سناٹے میں پہلی بار اس نے پتلی، مری مری آواز میں گایا جاتا چچی ماں کا وہ گانا سنا— ''پیٹھ دیکھو رے مائی! میری پیٹھ دیکھو، جیسے دھوبی کا پاٹ اس طرح مارا ہے...''

مجزو کے جسم پر اس دن جو چوٹیں آئی تھیں اور جن کے بارے میں اس نے کسی سے کچھ نہیں کہا تھا، وہ چوٹیں کچھ اس طرح چنخنے لگیں جیسے ان کی پپڑیوں کے نیچے کچھ بڑھنے یا پھولنے لگ گیا ہو، جیسے چوٹوں کے پھیپھڑوں میں سانس بھر رہی ہو۔ ان میں جلن ہونے لگی۔ جلن صرف وہیں نہیں، جسم کے اندر تک۔

ایک بار مجزو نے گلی کے آر پار دیکھا۔ گلی میں زیادہ اندھیرا نہیں تھا۔ عتیق کے بندر کی نیند ٹوٹ گئی تھی اور وہ بہت خاموشی سے آنکھیں پھاڑ کر مجزو کو دیکھ رہا تھا۔ مجزو نے بھی اسے دیکھا۔ بندر کچھ زیادہ چوکنا ہو گیا۔ مجزو کے جبڑے بھنچ گئے۔ وہ یکساں رفتار سے آگے بڑھتا گیا۔ قریب آتے ہی بندر چیخا اور اچھلا۔ مجزو بے حد پھرتی سے بندر کی زنجیر کی طرف جھپٹا۔ بندر چیخ چیخ کر اچھلنے لگا۔

بند دروازوں کے اندر سے عتیق کی جھلائی، اُنیندی آواز آئی: ''اب کیا ہے؟ سالا کتوں کو دیکھ کر ونگل کر رہا ہے۔''

باقی کوئی کچھ نہیں بولا۔ کوئی باہر بھی نہیں آیا۔ مجزو نے بندر کی زنجیر کھول لی اور اسی طرح گھسیٹتا ہوا تیزی سے اپنے گھر کی سیڑھیاں چڑھ گیا۔ اوپر کی منزل پر ٹین کے سائبان کے نیچے کے فرش پر بنے سوراخ کے پاس بیٹھی اس کی ماں اسی طرح گاتی رہی ''میری پیٹھ دیکھو رے مائی!''

چیختے اچھلتے بندر کو زنجیر سے لگ بھگ ٹانگے ہوئے مجزو کنارے کی دیوار پر پنجہ پھنسا کر ٹین کے اوپر چڑھا اور اوپر کی بنا منڈیر کی چھت پر چلا گیا۔ اگلی دو چھتیں پھلانگنے میں اسے دشواری نہیں ہوئی۔ اور اب وہ ٹھیک وہاں پہنچ گیا تھا جہاں بجلی کے کھمبے کا وہ سرا تھا جس میں مکڑی کے جالے کی طرح سینکڑوں تار الجھے ہوئے تھے۔

اب اسے صرف بندر کے گلے سے زنجیر کھولنی تھی۔ بندر نے اچانک چیخنا بند کر دیا۔ مجزو کو اطمینان ہوا کہ بندر شاید تھک گیا ہے۔ اس کی زنجیر کھول کر اسے کھمبے کے تاروں کی اس گنجلک پر اچھال بھر دینا ہے۔ باقی کام خود ہو جائے گا۔ اسے سرخ کپڑے پر پڑی بندر کی لاش اور سکے دکھائی

دیئے۔ ٹھیک اسی لمحے اس بندر نے اچھال ماری اور اس کے کندھے کے پاس چپٹ گیا۔ دانتوں اور ناخنوں سے ہوئے اس حملے سے بچنے کے لیے اس نے اپنا سر پیچھے کھینچا اور اس کے بعد جو کچھ بھی بچا میں چھپے چند لمحوں میں بند ہوا تھا۔ اس لیے اسے وہ تاروں کی سی گھنک پر گرا۔ کافی دیر تک عمل کے تار پٹاخوں کی سی آواز کر کے آتش باری سی چھوڑتے رہے۔ ہاتھ میں پھنسی زنجیر کے ساتھ بندر سیدھے ہوئے ویسے ایک لمحے کے لئے چند لمحے تک ان تاروں کی آتش بازی میں تیرا، پھر چیختا ہوا گلی میں جا گرا۔ گلی میں چند دیر ویسا کا ویسا ہی سناٹا چھایا رہا، پھر یکبارگی ایک ساتھ چاروں طرف سے آتی ہونے لگی۔

مدرارا کھشس

ہندی سے ترجمہ: زیبا علوی

جلے مکان کے قیدی

کسی جلی ہوئی عمارت میں قیدی ہونا ایک عجیب تجربہ ہوتا ہے ہم لوگ ایسی ہی عمارت میں تھے۔
اس کے مالک کو میں جانتا تھا — م نسیم۔

1975 میں اندرا گاندھی نے جب اس ملک میں ایمرجنسی نافذ کی تھی ان دنوں انھیں اس بری طرح ذلیل کیا گیا تھا کہ وہ، وہ انھیں کبھی کسی نے نہیں دیکھا۔ ایک افواہ اڑی کہ انھوں نے خودکشی کر لی ہے۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ وہ زیارت کو نکلے تھے اور آج بھی درگاہوں میں سے کسی میں نظر آ جاتے ہیں۔ جنھوں نے انھیں درگاہوں میں بھٹکتے دیکھا تھا، انھوں نے ان کی صورت کو بھی کافی بدل دیا تھا۔ بہترین تراشی ہوئی صاف چمکیلی کالی داڑھی کی جگہ الجھی ہوئی بے ترتیب اور سفید داڑھی مونچھیں، پتلون، کوٹ، ویسٹ کوٹ اور عمدہ ٹائی کی جگہ کالا چوغہ، وغیرہ۔

یہ سب بہت پہلے کی بات ہے دھیرے دھیرے م نسیم بالکل بھلا دیے گئے۔

اسی عمارت میں ان کا چکن کے کپڑوں کا کافی بڑا کاروبار تھا۔ کام کچھ دن ان کی بیوی اور ان کے نوکر دیکھتے رہے، بس اتنا اب لوگ جانتے تھے۔

نسیم یونیورسٹی میں کلاس فیلو تھے۔ انگریزی اور فلسفہ ہم لوگ ساتھ پڑھتے تھے، پر دوستی زیادہ گہری نہیں تھی۔

اس جلی ہوئی عمارت میں داخل ہوتے ہی م نسیم کی یاد آئی تھی۔ بہت چپ۔ چہرے پر نہ

Scanned with CamScanner

مسز ہمت نہ غصہ۔ بہت گورا چہرہ، بڑی بڑی آنکھیں۔ نہ تجسس نہ بے چینی۔ بہت ملائم آواز، جیسے شہد میں لپٹے ہوئے کانچ کے پار روشنی کھلونے ہوں۔

یہ سب کوئی بہت ترتیب سے یاد نہیں آتا تھا۔ اس وقت ہم سب کے چہروں پر ایک زبردست تناؤ تھا۔ میری ایک بانہہ چوٹ سے ملگجی جھلس گئی تھی اور دوسرے ہاتھ کی دو انگلیاں، جو جوتے سے دب کر سکڑ گئی تھیں، اس طرح جل رہی تھیں کہ دوسرے حالات کا تجزیہ کرنا بڑا ہی مشکل تھا۔ یہاں قید کیے جانے سے پہلے ہم لوگ ایک برباد کیے کارخانے کے گودام میں رکھے گئے تھے، جہاں سانس لینا بھی مشکل تھا۔ اس سے یہ جگہ بہتر تھی۔ مرنیم سے اس مکان کو میں نے پہچان لیا تھا۔ شاید وہ چھاؤنی کا یہ ایک جانے پہچانے مکانوں میں سے ہے۔

مکان کے آس پاس چار دیواری بہت اونچی تھی۔ اس میں رہنا زیادہ تکلیف دہ نہ ہوتا اگر مردوں کی تعداد بہت زیادہ نہ ہوتی۔ کمروں کے علاوہ کافی بڑا ایک آنگن بھی تھا لیکن اس کا استعمال مشکل تھا، کیونکہ موسم بارش کا تھا۔

بارش کم ہو جاتی تو تھوڑی ہی دیر بعد اتنی زیادہ امس ہو جاتی تھی کہ ہم لوگ پسینے سے تر ہو جاتے تھے۔

ان لوگوں نے پہلے سے ہی چاروں طرف کی ٹوٹی ہوئی چوکھٹوں پر مضبوط کیلوں سے موٹے موٹے تختے جڑ دیے تھے جن کی وجہ سے بے پناہ بدبو بھرنے لگی تھی۔ چھت پر تختے تھے، مگر جو آگ لگائی گئی ہوتی وہ اتنی بدصورت تھی کہ کھڑکیاں اکھڑ گئی تھیں اور سڑنے تک آگئے تھے۔ چھت تک کی سیڑھیوں کا دروازہ بھی تختے جڑ کر بند کر دیا گیا تھا۔

یوں تو اس کمرے میں اٹھنے بیٹھنے کی گنجائش ہی نہیں تھی، پر ہم سوتے سوتے مرے اور کالے پڑ گئے تھے، کیونکہ دیواروں پر دھواں جما ہوا تھا۔ یہ کمی تھی کہ جیسے چھت پر بدمعاش بیٹھے ہوں، ہم میں سے کسی کو بھی بے خبر پا کر حملہ کرنے کو تیار۔

مکان میں قید کیے جانے کے بعد کچھ دیر ہم لوگ چاروں طرف اس کے پڑے ہوئے سامان کا ڈھیر ادھر ادھر سے اٹھا اٹھا کر دیکھتے رہے۔ جب خطرہ کم ہو گیا اور ان کے بیچ سے کوئی ٹکڑا ایسا بھی نکل آتا تھا جو جلنے سے بچ گیا ہو۔ اس کاٹھ کباڑ میں ایک کتاب بھی ملی کافی جلی ہوئی۔ دراصل وہ

Scanned with CamScanner

کتاب نہیں، جلد بندھا ہوا مسودہ تھا۔ سرخ اور کالی سیاہی سے ناگری لپی میں لکھی وہ جیوتش کی ایک کتاب تھی، جو ضرور م نسیم کے ذخیرے کی باقیات ہوگی۔

ہمیں زیادہ چلنا نہیں پڑا تھا، پر ہم سب بری طرح تھکے ہوئے تھے، اس لیے بھی کہ پچھلی رات میں ہم میں سے شاید ہی کسی کو بیٹھنے کا موقع ملا ہو۔ اس بیچ کھانا بھی شاید ہی کسی نے کھایا ہو۔ ان میں سے زیادہ تر لوگ اندھیرے میں ہی گھروں سے اٹھا لیے گئے تھے۔ چونکہ آگ کی وجہ سے وہاں ایسا کچھ بھی نہیں تھا جو کالا نہ ہو گیا ہو اس لیے اندھیرا اترتے ہی ایسا لگا جیسے رات بہت تیزی سے گہری ہو گئی۔

اس اندھیرے میں ایک دہشت بھی جڑ گئی تھی۔ ہمیں اندر ڈھکیلنے کے بعد جب بہت پھرتی سے دروازے پر بھی بہت موٹے موٹے تختے جڑے جانے لگے تو ہم نے دیکھا، ان لوگوں میں سے ایک لوہے کا ایک ٹین چہار دیواری کے پاس پٹک گیا تھا۔ ٹین میں مٹی کا تیل ہے، یہ ہمیں جلدی ہی پتا لگ گیا تھا، کیونکہ اس کی گندھ تیزی سے چاروں طرف پھیل گئی تھی۔

اس ٹین کو ہم لوگ بہت دیر تک گھورتے رہے تھے، بلکہ جب دروازہ ان تختوں سے پوری طرح بند ہو گیا تو بھی ہم لوگ سناٹے میں آئے دیر تک کھڑے رہے تھے۔

دراصل بنا کچھ بولے ہم لوگوں میں سے ہر کسی نے یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ ہم لوگوں کے باہر نکلنے کا راستہ پوری طرح بند ہو جانے کے بعد وہ لوگ ٹین کا یہ تیل چاروں طرف چھڑک کر ایک بار پھر آگ لگا دیں گے۔ دروازے کے قریب کھڑے لگ بھگ سبھی لوگوں نے یہ تصور کیا ہوگا، کیونکہ تھوڑی دیر میں اس بدبو کے اور بڑھتے ہی وہاں ایک ہلچل ہوئی۔ سبھی لوگ پیچھے ہٹنے لگے۔

میں نے تصور کیا کہ اس طرح آگ لگا دیے جانے پر مجھے کیا کرنا ہوگا۔

م نسیم کا مکان میں نے کبھی اندر سے نہیں دیکھا تھا۔ کیا اس میں کوئی چور دروازہ بھی ہوگا؟ کیا چھت سے بچ نکلنے کا کوئی دروازہ بھی ہوگا؟

میں نے سوچا، اگر مٹی کا تیل دروازے سے اندر نہیں آتا تو اندر تھوڑی دیر زندہ رہنے کا موقع ضرور ملے گا۔

لوگ دہشت کے پہلے دھکے میں پیچھے ہٹے ضرور، لیکن پھر ٹھٹک گئے تھے۔ ایک تو اس لیے

بھی کر چکے بہت سختی کی رہی، کچھ لکش نہیں تھی اور جو اس نے بھی رات تک جو پڑھ چکا تھا، اس نے ہمارے ذہن کو بھی کسی قدر تھکا دیا تھا۔ بہت زیادہ بے محسوس ہونے والے پتھروں سے بعد ہی ہمیں پتا لگا۔ صورت حال پتہ اور تھی۔ آس پاس کہیں بھی روشنی نہیں تھی اور وہ لوگ ہمیں سے کئی کے تیل کی لالٹینیں لے آئے تھے۔

باہر کسی کی آواز بھی سنائی دی تھی: ''اب اتنے بڑے مکان میں تو صرف لالٹینوں سے کام ہوگا؟''

کسی نے دور سے جواب دیا: ''آئی ہی کی ہیں۔ اور تھکے بھی تو ضرورت ہے۔''

''سب لے آئیں زیادہ تعداد میں سو رہے ہیں یہیں۔''

''کوئی ترا مزہ دو نا تک بھی، دیکھا ہے تو کاٹ کر پھینک دینا۔'' دوسرے نے اس طرح کہا جیسے اپنے ساتھیوں سے زیادہ وہ ہمیں سنانا چاہ رہا ہو۔ ''ویسے صبح تک اور انتظام ہو جائے گا۔ اس وقت کام چلا لو۔''

''کام تو چل ہی جائے گا۔'' پہلا پھر بولا۔ ''یہ لالٹینیں بھی نہ ہوتیں تو بھی کام چلا لیتے۔ تیندوے کی آنکھیں ہیں، اندھیرے میں بھی دیکھ لیتی ہیں۔''

کوئی تیسرا تھوڑی دور سے بڑے خوش دلی سے بولا: ''ان حرامیوں کو تو ہم سونگھ کر بھی جان لیتے ہیں۔ سیوا سال دور سے ہی مسئلے کی ذرمی کی طرح آتا ہے۔''

اس بات پر بہت سے لوگ ہنسے۔ پھر انہیں میں سے کسی نے ٹکڑا لگایا: ''ذرمی کہاں کی ذرمی؟''

اس پر بھی وہ لوگ اس طرح ہنسے جیسے کوئی بہت ہی عمدہ قسم کا مذاق کیا گیا ہو۔

اب تک تو پتہ ہو چکا تھا کہ فقط ہمیں تکلیف پہنچانے میں بالکل ہی ناکام ہو رہے تھے، بلکہ اس لیے چونکہ ہمیں یہ احساس ہو چکا تھا کہ وہ فی الحال ہمیں زندہ جلانے نہیں جا رہے تھے، اس لیے ہمارا گھبراہٹ کا تاؤ کچھ ختم ہو گیا تھا۔

آخر عجیب سی جیل میں ہمیں کب تک رہنا ہوگا؟

لالٹینیں جلتے وقت تک کافی شور ہوتا رہا، پھر یکایک وہ ختم ہو گیا جیسے کسی نے کوئی حکم دیا ہو۔

کچھ دیر قدموں کی آہٹ سنائی دیتی رہی، پھر کوئی اونچی آواز میں بولا: ''پہرے میں کوئی

داخل نہ آنے پائے۔"

اس کے بعد ایک عجیب قسم کی پرارتھنا انھوں نے شروع کر دی۔ پتا نہیں کہاں سے ایسے وقتوں کے لیے ان لوگوں نے نہ صرف پرارتھنا لکھی تھی، بلکہ اس کی دھن بھی یاد کر رکھی تھی۔ گو کہ وہ پرارتھنا کسی فلم کے گانے کی نقل تھی، پر اس کے بول الگ تھے۔

تھوڑی دیر میں ہمیں یہ احساس ہو گیا کہ وہ پرارتھنا صرف مرنسیم کی عمارت میں نہیں گائی جا رہی تھی بلکہ وہ لوگ شہر میں جہاں کہیں بھی تھے، یہی پرارتھنا دہرا رہے تھے۔ پرارتھنا کے بعد انھوں نے اپنے وہ پانچ عہد بھی دہرائے جن کا کسی وقت ہم لوگ خاص مذاق اڑایا کرتے تھے۔

اس پرارتھنا اور عہد سے ہم پر ایک اثر ضرور ہوا۔ انھیں سن کر ہمارے اندر ان کے لیے جو نفرت پیدا ہوئی اس نے ہمارے صدمے کو تھوڑا کم کر دیا اور اس جلی ہوئی اندھیری اور تنگ جگہ میں ہم ایک ٹھکانا کھوجنے لگے۔

اصل بھیڑ کا احساس ہمیں اب ہوا تھا۔

آدمی کی ایک عجیب عادت ہوتی ہے۔ چاہے جس حال میں بھی وہ کیوں نہ ہو، ایک ایسا ٹھکانا سب سے پہلے کھوجتا ہے جسے وہ اپنا مان سکے، بھلے ہی اسے اپنا کہنے یا ماننے کی اس کے پاس کوئی وجہ نہ ہو۔ یہ کام وہ سب سے پہلے کرتا ہے۔ عام حالات میں تو لوگ اس کا تجربہ کرتے ہی ہیں مگر غیر معمولی حالات میں یہ میلان نہ صرف زیادہ طاقتور ہو جاتا ہے بلکہ اس میں ایک طرح کا سفاک تشدد بھی آ جاتا ہے۔

گلی محلوں میں رہنے والے لوگوں میں تو یہ میلان بہت عام ہوتا ہے۔ اکثر وہ یہ بھی برداشت نہیں کرتے کہ آپ کی بیوی ان کی طرف کی منڈیر پر اپنا تولیہ پھیلا دے۔ عوامی تحریکوں تک میں یہ مسابقت میں نے دیکھی ہے۔

ایک بار ہم لوگ بمبئی جا رہے تھے۔ مرکزی کانگریسی سرکار نے بڑی مقدار میں گیہوں برآمد کر دیا تھا۔ ہم لوگ اس برآمد کے خلاف بندرگاہوں پر دھرنا دینے جا رہے تھے۔ ریل گاڑی بمبئی کے اسٹیشن پر تقریباً گیارہ بجے رات کو پہنچی۔ ہمارے پورے جتھے کو چوپاٹی نام کی جگہ پہنچ کر رات بتانی تھی۔

Scanned with CamScanner

ٹھہرنے کی اس جگہ کو دیکھ کر ہم گھبرا گئے۔ بالو کے اوپر کافی دوری تک تمبو تان دیے گئے تھے۔ بالو کے اوپر ناکافی سی دریاں ڈال دی گئی تھیں جو نیچے کی بالو سے اٹی پڑی تھیں۔ جو لوگ پہلے پہنچ گئے تھے، انھوں نے اپنے اپنے بستر کھول لیے تھے۔

بری حالت میں تھکے ہونے کے باوجود ایک متوقع صاف دری کے سرے پر جگہ پانے کے لیے آنند موہن سراؤگی اپنی بوڑھی عمر کے لحاظ سے تیزی سے لپکے۔ ایسا کرنے میں ان کی ایک چپل پیچھے چھوٹ گئی۔ اپنا بستر اور تھیلا چنی ہوئی جگہ رکھ کر وہ چپل کے لیے واپس لوٹے۔ چپل جلدی نہیں ملی۔ پیچھے آرہے لوگوں کے پیروں سے دب کر وہ بالو میں چھپ گئی تھی۔

چپل جھاڑتے ہوئے جب سراؤگی واپس لوٹے تو انھوں نے پایا۔ ان کا تھیلا اور بستر تھوڑا سرکا کر ایک گنا چوہان گوسائیں نے اپنی چادر بچھا رکھی تھی۔

آنند موہن سراؤگی اس پر بری طرح ناراض ہوئے۔ زبردستی انھوں نے گوسائیں کی چادر کو جھٹکا دے کر کھینچ لیا۔

جہاں چادر بچھی تھی اس جگہ کے مقابلے میں اس کے پاس کی جگہ کوئی خاص بری نہیں تھی، بلکہ دونوں جگہیں ایک سی ہی تھیں۔ دونوں ہی جگہ دھول اور بالو میں جسم کو اٹھنا تھا اور دونوں ہی جگہ گزرنے والوں کے پیروں کی ٹھوکر لگنی ہی تھی۔ مگر ایک تصوراتی بہتری کا اندازہ لگا کر پہلی جگہ سے قبضہ کوئی نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ بلکہ دہلی میں جب ہم لوگ حق جتانے کے اس موہ کا مذاق اڑا رہے تھے تو سراؤگی نے بہت جھینپ کر بتایا کہ اس جگہ قبضہ پا جانے کے بعد وہ رات بھر پیشاب روکے لیٹے رہے تھے، کیونکہ انھیں ڈر تھا کہ ان کے اٹھتے ہی گوسائیں پھر اسی جگہ آ جائے گا۔

اندھیرا چونکہ بہت زیادہ تھا، اس لیے ہم نہیں کہہ سکتے کہ ہم میں سے کس کے پاس لیٹنے کے لیے بہتر جگہ تھی۔ بیٹھتے لیٹتے باہر سے "ہوشیار، خبردار" کی آوازیں آنے لگی تھیں۔ شاید وہ لوگ گھوم گھوم کر پہرہ دے رہے تھے۔

داہنے ہاتھ کی کہنی پر چونکہ بہت زیادہ چوٹ تھی، اس لیے میں بائیں کروٹ سو گیا۔ چت لیٹنے پر ہی کسی دوسرے سے جا ٹکرائے تھے۔ کیمپ فرش پر لگاتے ہی جلی ہوئی چیزوں کی بدبو زیادہ نزدیک سے محسوس ہوئی تھی۔

آگ بجھ جانے کے بعد جلی ہوئی چیزوں میں ایک عجیب بو آتی ہے۔ بو بہت دیر تک جلائے جانے کا اُلاہنا دیتی رہی۔ پتا نہیں کہاں کیا جل کر گرا ہوگا، جو اس وقت میری کنپٹی سے سٹا ہوا تھا۔ ایک ہاتھ کی کہنی اور دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں تکلیف نہ ہوتی تو شاید میں چہرے کے پاس سے وہ کوڑا ہٹانے کی کوشش کرتا۔

یہ عجیب بات تھی کہ ہم میں سے ہر کوئی بہت زیادہ خاموش تھا۔ صرف جگہ بنا کر لیٹنے کی کوشش کی آواز یا کسی کی کھانسی کو چھوڑ کر وہاں سناٹا تھا۔

گہرے اندھیرے میں بھیڑ بھی ہو تو بھی آدمی کافی تنہا ہو جاتا ہے، بشرطے کہ سب چپ ہوں۔ اس خاموشی میں سب سے پہلے مجھے بیوی کا خیال آیا۔

جس وقت وہ لوگ مجھے گھسیٹ کر دھکے دیتے ہوئے باہر لا رہے تھے، وہ ان سے چیخ کر کچھ کہہ رہی تھی۔ پیچھے مڑ کر دیکھنا ممکن نہیں ہوا۔

وہ لوگ تعداد میں کافی تھے۔ رات کے اندھیرے میں اور وہ بھی اتنے تیز حملے میں انھیں گن پانا ممکن بھی نہیں تھا۔

حالانکہ ہمیں کئی دن سے لگ رہا تھا کہ ان لوگوں کی طرف سے کوئی ایسا حملہ ہوگا، پر ہمیں یہ نہیں پتا تھا کہ اچانک اس طرح سب کچھ ہوگا۔ کچھ دنوں سے دو تین موٹر سائیکلوں پر کچھ لوگ ادھر سے اس طرح گزرتے تھے گویا میرے گھر کی ٹوہ لے رہے ہوں۔ ان میں سے بہت تندرست اور مضبوط ایک آدمی سادھوؤں کی طرح پیلے کپڑے پہنے ہوتا تھا۔

اس کے بعد جب ایک دن میں اپنے کتے کو گھمانے نکلا، میں نے دیکھا، باہر کے پھاٹک کے دونوں کھمبوں پر گیرو میں ڈبائے ہوئے ہاتھ کے پنجے چھپے تھے۔

اس کے ٹھیک اگلی صبح گھر پر بھاری پتھراؤ ہوا تھا۔ پتھراؤ سے بیوی بری طرح گھائل ہوئی تھی۔ اس کے سر سے ٹپکا خون بہت دنوں تک چہار دیواری کے اندر کے فرش پر چھترایا رہا تھا اور ہمارے کتوں نے باہر نکلتے ہی اسے سونگھنا شروع کر دیا تھا۔

اس طرح گھائل ہونے میں کافی کچھ غلطی میری بیوی کی ہی تھی۔ میں اس وقت سب سے پیچھے کمرے میں سو رہا تھا۔ نیند میں ہی میں نے سنا، وہ کہہ رہی تھی: "جلدی اٹھیے، میرا سر پھٹ گیا ہے۔"

جاگنے پر بھی دوپٹے میں کچھ نہیں پایا تھا۔ جو شلوار قمیص اس نے پہن رکھی تھی، اس کا کافی حصہ تازہ خون سے بھیگا ہوا تھا اور خون سے تر دوپٹے کو اس نے سر کے اوپر باندھ رکھا تھا۔

دراصل بہت سے ان لوگوں نے گھر پر پتھراؤ کیا تھا۔ تب سے وہ زور زور سے چلانے لگے تھے۔ بیوی نے دروازہ کھول کر دیکھنا چاہا کہ بات کیا ہے۔ اس بیچ ذرا سی دیر میں ہی ان کا پیارا چھوٹا سا کتا نکل گیا۔ اسے وہ دروازے سے باہر بھی نہیں جانے دیتی تھی، کیونکہ ایک تو وہ بہت معصوم تھا اور دوسرے بالوں کی وجہ سے اس کی آنکھیں پوری طرح ڈھکی رہتی تھیں۔ ایک بار سڑک پر نکل جانے کے بعد اس کا لوٹ پانا مشکل ہو جاتا۔

بیوی اسے پکڑنے کے لیے دروازے سے باہر آئی، پتھر کی اینٹ کا ٹکڑا اس کے سر سے ٹکرایا۔ کتے کو پکڑتے پکڑتے وہ خون میں لت پت ہو چکی تھی۔

مجھے جتنے ہوئے لوگوں سے پہلے بیٹے کا ان میں ایک عجیب طرح کی ہمت ہے۔ یقیناً ان لوگوں نے اسے بھی پکڑا ہوگا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ ان سے لڑی ہو۔ وہ لڑ سکتی تھی۔ کسی بھی قیمت پر سمجھوتہ نہ کر سکتی تھی۔ جس بدتمیزی سے وہ لوگ عورتوں کے ساتھ پیش آتے تھے اسے دیکھتے ہوئے ان کی تشدد پسندی کے ساتھ بھی وہ بے دھڑک نہیں تھی۔ یہ میں جانتا ہوں۔ لیکن یہ بھی سچ ہے کہ اس کی وجہ سے تشدد پسند زیادہ جارح ہو گئے ہوں گے۔

پتھراؤ کے واقعے کو قریب ایک سال ہو چکا تھا۔ یا شاید زیادہ ہی۔ ان دنوں راشٹریہ سویم سیوک سنگھ اور اس کی ساتھی جماعتیں ایک عجیب تحریک چلا رہی تھیں۔ وہ دنگا کر رہی تھیں۔ ایک جھنڈا لے کر وہ لوگ نکلتے تھے جن میں سے بہتوں کے ہاتھوں میں تو پیلے رنگ کی جھنڈیاں ہوتی تھیں، جن پر باتیں یا نعرے لکھے ہوتے تھے۔ کسی بھی گلی محلے سے گزرتے ہوئے وہ بری طرح شور کرتے تھے۔ کسی مسلمان کا مکان دیکھ کر وہ ان کے دروازے پر ہوائیاں پٹکتے تھے، جس سے ایک دہشت پھیل جاتی تھی۔

ان لوگوں کا نشانہ مسلمان ہوتے تھے، وہ ہندو بھی اسی طرح دہشت زدہ کیے جاتے تھے جن کے بارے میں خبریں تھیں کہ وہ ان تشدد پسندوں سے متفق نہیں ہیں۔ کبھی کبھار اپنی نفرت ظاہر کرنے کے لیے وہ ان کے دروازوں پر تھوکتے تھے یا کھلے عام پیشاب کر دیتے تھے۔

ایک بار ایسی ہی حرکت کرنے پر آمادہ لڑکوں کو بیوی نے بری طرح ڈانٹا تھا، بلکہ غصے میں اس نے بڑے والے کتے کو ان پر چھوڑ دینے کی دھمکی بھی دے ڈالی تھی۔

لڑکے بے شرمی سے ساتھ ہنستے اور چلاتے ہوئے آگے بڑھ گئے تھے۔

بیوی کے ساتھ ہوئے اس حادثے کے بعد ایک شام میں نے دروازہ کھولا ہی تھا کہ پانچ لمبے تڑنگے نوجوان دکھائی دیے۔ وہ شاید اسی لیے گھنٹی بجانے والے تھے۔ دروازہ کھلتے ہی ان میں سے ایک تھوڑی تلخ آواز میں بولا: "مجھے آپ سے کچھ بات کرنی ہے۔"

"مگر، ابھی تو میں جا رہا ہوں۔ آپ لوگ پھر کبھی آئیں،" میں نے کہا۔

دو قدم اور آگے بڑھ کر انھوں نے کہا: "نہیں ابھی بات کرنی ہے۔"

"کیا بات کرنی ہے؟"

تھوڑا سا پیچھے کھڑا نوجوان آگے آیا: "کل آپ نے جو چھپوایا ہے، ہمیں اس کے بارے میں بات کرنی ہے۔"

کمرے میں آکر ان میں سے صرف دو ہی بیٹھے۔ باقی آس پاس کھڑے رہے اور لگ بھگ ایک ساتھ غصہ ظاہر کرتے رہے۔ وہ بے حد ہیجان میں تھے اور کوئی بھی دلیل قبول کرنے کو تیار نہیں تھے۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟ آپ کو پتا ہے آپ کس سے بات کر رہے ہیں؟" چونکہ میری بیوی وہاں آ کھڑی ہوئی۔ "یہ کوئی بات چیت کا طریقہ ہے؟ اتنے بڑے آدمی سے اس طرح بات کی جاتی ہے؟ بڑے بڑے لوگ ان کے پیر چھوتے ہیں۔"

میری اہمیت کے بارے میں کبھی کبھی میری بیوی ایسا کچھ کہہ جاتی تھی کہ مجھے بھی تعجب آئے، مگر حیران کن بات تھی کہ ان نوجوانوں کی آواز میں اتنی تیزی نہیں رہ گئی تھی۔

بیٹھے ہوئے نوجوان بھی کھڑے ہو گئے۔ جاتے جاتے انھوں نے دھمکی بھی دی۔ صاف تو نہیں، پر انھوں نے یہ ظاہر کیا تھا کہ اگر میں نے اپنے خیالات نہیں بدلے تو وہ ہم سے نپٹ لیں گے۔

ان کی اس دھمکی سے نہیں، بلکہ اس بات نے مجھے الجھن میں ڈال دیا تھا کہ وہ کوئی بھی دلیل سننے کو تیار نہیں تھے۔ وہ ان پڑھ نہیں تھے، پر ایسے لوگ اب آسانی سے مل جاتے تھے جو دستخطوں میں ہندی

کئی کٹھ پتلیوں کی طرح عمل کرتے تھے۔ کسی بھی دلیل کو وہ رد کر دیتے تھے۔ کسی بھی سوال کا ایک ہی جواب ان کے پاس ہوتا تھا۔ "آپ لوگ ہندو مخالف ہیں۔"

صرف آپ جیسے جمہوری ذہن والے لوگوں پر ہندو مخالف ہونے کا ایک قصہ بہت دلچسپ ہے۔

ایودھیا میں شام تک بابری مسجد پوری طرح مسمار ہو چکی تھی۔ ہندوستانی میڈیا پر اس وقت کسی غیر ملک میں کھیلا جا رہا کوئی کرکٹ میچ نشر کیا جا رہا تھا۔ ہمیں مسجد مسمار ہونے کی خبر برٹش براڈکاسٹنگ کارپوریشن سے ملی۔ اوروں کو بھی وہیں سے خبر ملی ہوگی۔

ہمارے مکان سے تھوڑے فاصلے پر ایک مکان میں کئی سالوں سے سنگھ پریوار کی بڑی سی تنظیم کے مذہبی تقریبوں کا اہتمام شروع ہو گیا تھا۔ صبح شام وہاں زور شور سے آرتیاں کھول کر بے حد بے سری آواز میں کیرتن گائے جاتے تھے یا پھر لاؤڈ اسپیکر کے ساتھ زور و شور سے ہندو گرنتھوں کا پاٹھ ہوتا تھا۔

بابری مسجد ٹوٹنے پر وہاں کیرتن بند ہو گیا اور وہ سارے لوگ سڑک پر نکل کر دیر تک نعرے لگاتے رہے تھے۔

اسی بیچ کافی فون آئے۔ فون پر ہندو لوگ بھی بات چیت کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ میری الجھن بڑھتی جا رہی تھی۔ ایک عجیب سی بے چینی بھی۔ تبھی میں نے سنا، میری بیوی باہر کسی سے اونچی آواز میں بول رہی تھی۔

پچھلے حادثوں سے اندیشے بڑھ چکے تھے۔ فون بیچ میں ہی رکھ کر میں باہر کی طرف لپکا۔ باہر کی چہار دیواری پر چڑھے ہوئے لڑکے ہاتھوں میں چھوٹی جھنڈیاں لیے ہوئے تھے۔ ایک نیچے کھڑا تھا۔ میں فوراً سمجھ گیا۔ وہ ہاتھ بڑھا کر دیوار پر لگی اس ہینگل کی چھڑی پر جھنڈی باندھنا چاہتے تھے جس میں بجلی کا بلب لگا ہوا تھا۔

بیوی زور زور سے بول رہی تھی: "نیچے اترو۔ چلو، نیچے جاؤ۔ کس سے پوچھ کر چڑھے ہو؟ اسی طرح گھر میں چوریاں ہوتی ہیں۔ اس دن تم لوگ کیبل کا تار چپ چاپ کاٹ کر لے گئے۔ کتنی چیزیں گھر میں پڑی رہتی ہیں۔ ایک ہتھوڑی غائب ہے۔ کہاں چلی گئی آخر؟"

مذہبی جنونیت کو، یہ ادا و نگا کر میں بھی پختگی نہیں دے سکتا تھا۔

ٹکٹے میں آئے لڑکے کچھ جھنجھنائے۔ نیچے کھڑے لڑکے نے کہا، ''اتر آؤ۔''

وہ لوگ نیچے اتر آئے اور پلٹ پلٹ کر ہمیں گھورتے اور بڑبڑاتے ایک طرف چلے گئے۔

بیوی نے ایک عجیب و غریب ہتھیار کا استعمال کیا تھا — چوری، وہ بھی کیلے کے گچھے کی اور ایک عدد معمولی سی ہتھوڑی کی۔ شاید چوری کے اس بچے الزام سے ہی وہ لاجواب ہوئے ہوں گے۔ ڈکیتی کے الزام سے وہ اشتعال میں آسکتے تھے، اور شاید جواب بھی دیتے۔

گہرے تناؤ کے باوجود مجھے ہنسی آگئی: ''یار، یہ گھٹیا سی ہتھوڑی کی چوری!''

''آپ نہیں جانتے، یہ چور ہوتے ہیں۔ اور پھر ہتھوڑی کام کے وقت نہ ملے تو کتنی پریشانی ہوتی ہے۔'' کہہ کر وہ اندر آگئی۔ میرے مکان پر فتح کا جھنڈا نہیں لہرایا جا سکا تو صرف اس وجہ سے کہ ایک عدد ہتھوڑی کہیں گم ہو گئی تھی!

لیکن اس بار صورت حال ویسی نہیں تھی۔ میں مانتا ہوں کہ اس بار حملہ کرنے والوں کو نہ تو کیلوں اور ہتھوڑی کی چوری پست کر سکتی تھی نہ میرے اتنے اہم شخص ہونے کا میری بیوی کا اعلان۔

انتہائی غصے میں وہ کس حد تک آگے جا سکتی ہے، میں اس کا تصور کرنے لگا۔ کیا کسی چیز سے اس نے حملہ کیا ہوگا؟ مگر کس چیز سے؟ ہمارے سونے کے کمرے میں کوئی چیز ایسی مشکل ہی سے تھی جس سے چوٹ کی جا سکے۔ ہتھیار کے نام پر ہمارے گھر میں صرف باورچی خانے کا سامان ہی تھا۔

بہت پہلے اپنے پتا کی یادگار کے طور پر ان کے کچھ اوزار اٹھا لایا تھا۔ ہتھیار کے طور پر وہ خاصے ازمنۂ وسطیٰ کے تھے۔ مثلاً دو بھالے، ایک زنگ لگی کٹار، ایک کھانڈا نما ہتھیار اور طبلے۔ طبلے ایک مرتبہ منڈھوانے کے لیے دیے اور وصول کیے تھے۔ باقی اوزار سجانے لائق تھے نہیں، اس لیے ادھر اُدھر پڑے زنگ کھاتے رہے اور مکان کی بربنائی کے بعد ان میں سے کوئی نہ کوئی غائب ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ ہمارے یہاں کوئی ڈنڈے جیسی چیز بھی نہیں بچی۔ بھالے کافی دن احتیاط سے لپیٹے رکھے رہے، پھر وہ بھی جانے کہاں غائب ہو گئے۔

اوزار ہوتے تو بھی، ان کا کوئی استعمال ہم لوگ کر پاتے، اس کا تصور مشکل تھا۔ اوزاروں کے بارے میں اپنے پتا کی جانکاری اور مہارت سے تھوڑا بہت میں بھی آشنا تھا، پر ان کی طرح ہتھیاروں

کے استعمال میں ماہر بھی نہیں ہو پایا۔ وہ تو شواجی والے پٹے سے لے کر لکھنؤ کے بانکے استادوں والی بانک تک سبھی کا استعمال جانتے تھے۔ کچھ دن، جب میں بہت چھوٹا تھا، انھوں نے محلے کے کچھ نوجوانوں کو ہتھیار چلانا سکھایا بھی تھا۔ وہ پورے قواعد کے ساتھ ہتھیاروں کا استعمال سکھاتے تھے اور ایک، دو، تین، چار بولتے جاتے تھے۔ مجھے بھی چاقو، بھالا، تلوار، لاٹھی وغیرہ چلانا کچھ دن سکھایا تھا، لیکن بعد میں چھوڑ دیا تھا کیونکہ وہ چاہتے تھے کہ میں بہت پڑھ لکھ کر یونیورسٹی کی ڈگریاں لوں اور وکیل یا جج بن جاؤں۔

یہ بھی حیران کن بات ہے کہ ان دنوں اور آج کے حالات میں کافی کچھ یکسانیت تھی۔ یہی نہیں، اگر آج میرے بابا زندہ ہوتے تو یقیناً ہاکی نہیں بھگسکھا لے کر مسلمانوں اور ہم جیسے لوگوں کے دروازوں پر دہشت پیدا کر رہے ہوتے۔

بابا کے اوزار گھر سے غائب ہو جانے کے بعد اکثر ہم فکرمند رہا کرتے کہ اگر اچانک چور آ گئے تو ہم کیا کریں گے؟

ایک بار پڑوس میں چوری ہو جانے کے بعد ہمیں لگا تھا کہ اپنی حفاظت کا کوئی انتظام ضرور کرنا چاہیے۔ چوروں سے حفاظت کا بندوبست ایک شام ہم نے بہت ہی شاندار طریقے سے کیا۔ پورے برآمدے میں فرش سے کوئی تین فٹ اونچائی پر ہم نے تانبے کا ایک تار جڑ دیا۔ میں سوتے وقت اس تار میں کرنٹ دوڑا دیتا تھا۔ میرا خیال تھا کہ چور اس تار سے چپک کر مر جائے گا۔

دو رات وہ تار وہاں لگا رہا تھا۔ اس کے بعد میں نے ہٹا دیا تھا، کیونکہ اس تار سے ایسی حالت میں مجھے بھی زبردست خطرہ تھا، جب میں کرنٹ بند کیے بنا خود اس سے ٹکرا جاؤں۔

میں بہت دیر تک لیٹے لیٹے یہ سوچتا رہا کہ میری بیوی نے اس حملے کے وقت کیا کیا ہوگا؟ حملہ آور اس بار ویسے نہیں تھے جو ہتھوڑی یا کپڑے کی چوری کا الزام سن کر شرمندہ ہو جاتے۔

چھ دسمبر کو بابری مسجد ٹوٹنے کے بعد ملک کے فساد زدہ علاقوں کا دورہ کرتے وقت ہندو دھرم اندھوں کی جو تصویر مجھے ملی تھی وہ خاصی ہی ڈراونی تھی۔ ایک جگہ تو انھوں نے باقاعدہ چھ عورتوں کے سارے کپڑے اتار لینے کے بعد انھیں پیٹتے ہوئے سڑکوں پر دوڑایا تھا اور بڑے اطمینان سے اس منظر کی فلم بھی تیار کی تھی۔

باہر شاید پانی برسنا شروع ہو گیا تھا۔ وہاں بند کیے گئے لوگوں میں سے کچھ تازی ہوا کے لیے برآمدوں میں بیٹ گئے ہوں گے۔ اب چونکہ پانی برسنے لگا تھا اس لیے وہ دوسروں کو کھسکاتے ہوئے پیچھے کھسک رہے تھے۔

بارش کی وجہ سے دھیان بٹ گیا۔ میں یہ امید بھی کرنے لگا کہ پانی تھوڑا زیادہ برسنے پر گرمی سے کچھ راحت ملے گی۔ یہ سوچتے سوچتے مجھے نیند آ گئی۔ اور تب میں نے ایک بار پھر وہی خواب دیکھا جسے میں نہ جانے کتنے برسوں سے دیکھتا آ رہا تھا۔ یہ خواب سال دو سال میں ضرور دکھائی دیتا رہا ہے۔ کبھی کبھی کچھ جلدی بھی۔

خواب لگ بھگ اپنے مکمل بھیانک انجام تک دکھائی دیتا رہا ہے۔ یہ اتنا حقیقی ہوتا ہے کہ جاگ جانے کے بعد بھی جیسے چھاتی پر بیٹھا رہتا ہے، کبھی کبھی تو کئی دن تک۔

خواب ختم ہو جانے پر ایسا لگتا ہے جیسے ایک بہت لمبا زہریلا سانپ سرکتا ہوا گردن کے اوپر سے نکل گیا ہو۔ نیند ٹوٹ جانے پر بھی دیر تک ہلنے کی خواہش نہیں ہوتی۔

ٹھیک ہمیشہ کی طرح خواب مجھے تن، لیکن جاگا ہوا چھوڑ کر میری گردن سے سرکتا ہوا نکل گیا۔ وہ سانپ کا لمس، اس کا ٹھنڈا خوف، اور اس کی خاموش گھسٹن میں پوری طرح آنکھ کھولے پڑا ہوا دیر تک محسوس کرتا رہا۔

اندھیرا کچھ کم ہو گیا تھا اور باہر سے ان لوگوں میں سے ایک بہت اونچی آواز میں اس سُر تال سے منتر پڑھنے لگا جیسے اذان دے رہا ہو۔ ایسے ڈھنگ سے منتر پاٹھ میں نے زندگی میں پہلی بار سنا۔ اذان کی یہ نقل ختم ہونے کے بعد رات والی پرارتھنا پھر دہرائی جانے لگی۔

اب تک میری نیند پوری طرح ٹوٹ چکی تھی، مگر زیادہ تر لوگ مجھ سے پہلے ہی جاگ چکے تھے۔ وجہ کچھ دیر سے ہی پتا چلی۔ دراصل ہر کوئی صبح کی حاجت کے لیے فکرمند تھا۔ اس بڑی عمارت میں سات غسل خانوں میں ایک ساتھ صرف سات لوگ ہی فارغ ہو سکتے تھے۔ یہ غنیمت ہے کہ ہم میں سے ہر کسی کا دھیان ایک دوسرے کی شکلیں دیکھ کر بٹ گیا۔ اس مکان کے ہر کمرے، ہر کونے میں پچھلے جس کالے ملبے میں لوٹ کر ہم لوگوں نے رات بتائی تھی اس نے ہم سب پر بری طرح کالک پوت دی تھی۔ اگر ہم لوگ مل ڈل نہ رہے ہوتے تو ہم لوگوں کی حالت ایسی ہو چکی تھی جیسے ہم لوگ جلی

لکڑیوں کا ڈھیر ہوں۔ تکلیف اور دہشت کے اس ماحول میں بھی ہم لوگوں میں سے بہت سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔

اس جلے مکان کی لابی کے سامنے جس صدر دروازے پر تختے جڑ دیے گئے تھے، وہاں کسی کی اونچی آواز سنائی دی: ''ارے مورکھو، منتر شدھ تو پڑھو! مورکھو، ان پڑھو! ارے منتر بھی شدھ نہیں پڑھ سکتے تم لوگ!''

تبھی ایک تھوڑی دبی ہوئی آواز آئی: ''چھوڑیے بھی مہاشے جی، ہمیں کیا کرنا — شدھ منتر پاٹھ کریں یا نہ کریں۔''

''ارے واہ، کوئی بات ہوتی ہے!'' روکنے والے نے آواز اور اونچی کر دی۔ ''ان کو منتروں کے بگاڑنے کا حق دیا کس نے؟ جاہلو، بند کرو یہ منتر پاٹھ کا تماشا۔''

باہر کا وہ منتر پاٹھ اس آواز سے نہیں پر تھوڑی دیر میں خود ہی بند ہو گیا۔ اور تبھی باہر کوئی دہاڑتی آواز میں بولا: ''یہ کون سالا خوں خوں کر رہا ہے؟''

آواز دبا کر بولنے والے نے پھر کہا: ''چھوڑیے بھی مہاشے جی! آپ ادھر آئیے۔ کرنے دیجیے جو کرتے ہیں۔''

باہر سے وہی دہاڑتی آواز پھر سنائی دی: ''تھوڑا صبر جاؤ، تمھاری یہ نندا (نکتہ چینی) تمھارے حلق میں نہ گھسیڑ دی ہو تو ہم کاہے کے...''

آواز دبا کر بولنے والا شدھ منتر پاٹھ پر تنقید کرنے والے مہاشے جی کو شاید اندر کی طرف گھسیٹ رہا تھا۔ ''چپ، چلیے۔ میں کہتا ہوں کیوں ان لوگوں کے منہ لگتے ہیں، چلیے۔''

پھر دوسری بھی آوازیں آئیں۔ ''جانے دیجیے مہاشے جی!''

کچھ دشواری سے لوگ جنھیں لابی سے برآمدے میں لائے، انھیں ان کے اوپر چٹی کالک کے باوجود میں پہچان گیا۔ وہ مہاشے سدانند شاستری تھے، شہر کی آریہ سماج نام کی تنظیم کے سیکرٹری۔ مجھے دیکھ کر چونکے اور بولے، ''ارے بھائی صاحب، آپ بھی؟''

''یہ تو مجھے پوچھنا چاہیے تھا آپ سے۔ آپ یہاں کیسے؟''

اچانک شاستری جی ہنسے۔ ''کہاں دیکھیے بھائی صاحب، کالک ہم لوگوں پر پتی ہے، اور وہ

بدمعاش جو شدھ منتر پاٹھ نہیں کر سکتے، صرف دھلے گھوم رہے ہیں۔"

اس بات پر ایک دو اور لوگ بھی ایک پھیکی سی ہنسی ہنسے، پر جو صاحب انھیں گھسیٹ کر لا رہے تھے، وہ خاصے گمبھیر ہو گئے۔ جو حالات تھے انھیں دیکھتے ہوئے لوگ کسی ہلکی بات کے لیے جگہ بنانے کو تیار نہیں تھے۔ وہاں زیادہ تر لوگ پانی یا غسل خانے جیسی چیزوں کو لے کر پریشان تھے۔ ابھی ضرورتوں تک وہ محدود بھی رہنا چاہتے تھے، پر یہی مسئلہ سب سے زیادہ خوفناک ہوا۔ نلوں میں آنے والے جس پانی کی وجہ سے وہ بے فکر تھے وہ جلدی ہی ختم ہو گیا اور تب لوگوں کو لگا کہ جنھوں نے اس کا استعمال نہانے کے لیے کیا تھا انھوں نے بے جوش میں باقی سب کو مشکل میں ڈال دیا تھا۔ ابھی کافی لوگ فارغ ہونے کے انتظار میں تھے۔ تکلف کے باعث انھیں حاجت کے لیے پہل کرنے میں تھوڑا لحاظ ہوا تھا، پر پانی ختم ہونے کے اعلان پر وہ لحاظ ایکا یک ختم ہو گیا۔ پاخانے میں جھانک کر بدبو کے کارن پیچھے ہٹ آئے کسی نے اونچی جھنجھلائی ہوئی آواز میں کہا، "آخر ابھی نہانا کون سا ضروری ہو گیا تھا، ایں؟"

جو نہا چکے تھے وہ دھیرے سے کھلے آنگن کی طرف جا کھڑے ہوئے۔ وہاں ایک شور اٹھ کھڑا ہوا۔ کئی لوگ غصہ ظاہر کرنے لگے۔

تبھی ایک آواز آئی، "دیکھیے، اب جو ہوا سو ہوا۔ سوال یہ ہے کہ پانی کا مسئلہ حل ہو تو کیسے؟"

"یہ اچھی رہی۔ جب یہاں ایسے عقلمند لوگ موجود ہیں جو حالات جانتے ہوئے بھی پانی نہانے میں خرچ کرنے کی عیاشی نہیں بھولتے تو مسئلے کا حل کیا ہوگا؟" کسی نے اونچی آواز میں کہا۔

پہلا شخص ہی پھر بولا، "حل نکلے گا کیوں نہیں؟ جنھوں نے ہمیں یہاں اس طرح قید کیا ہے ان کی بھی تو کوئی ذمے داری ہے۔"

اس بیچ کسی نے رفع حاجت کا حل نکال لیا۔ اسے اپنی کھوج پر آرشمیدس سے کم خوشی نہیں ہوئی۔ جب تک لوگ اس حل کو سمجھ پائے وہ بے حد جوشیلا شخص کچھ کھوجنے لگا۔ وہاں کسی کا بھی نام جاننے کی کسی کو نہ فرصت تھی نہ ضرورت، پر اس آدمی کو بہت لوگ پہچاننے لگے تھے۔ جب تب وہ کسی کو بھی پکڑ لیتا تھا اور سمجھانے کی کوشش کرتا تھا کہ اس کی بیوی اور بچیوں پر بڑا ظلم ڈھایا گیا۔ یہ وہی شخص تھا۔ جلدی ہی اسے باغبانی کا ایک اوزار مل گیا۔ آنگن کے دو طرف اونچی دیوار سے لگی کافی چوڑی

Scanned with CamScanner

کیاریاں تھیں، جن میں کچھ جھلسے ہوئے پودے لگے تھے۔ دیوار پر چڑھی بیلیں بھی خاصی جل چکی تھیں۔ وہ آدمی کچی زمین کھودنے لگا۔ کھودتے ہوئے بولا: ''کھڈی کی طرح استعمال کرو اور اسی مٹی سے ڈھک دو، بات ختم۔ کچی زمین بہت کافی ہے۔ اب سہنا تو پڑے گا ہی۔ کیا بتاؤں، میری بیوی اور بچوں کے ساتھ جو ہوا...''

بہانے کی وجہ سے بحث کا جھگڑا یکایک ختم ہو گیا۔ لوگ پر جوش ہو کر اس آدمی کو دیکھنے لگے تھے۔ کسی نے کہا: ''کھڈی تو ٹھیک ہے، پر پانی کا کیا ہوگا؟''

ایک بار پھر وہاں سناٹا ہو گیا۔

یہ مشکلیں صرف نئی ہی نہیں تھیں بلکہ یہ شروعات تھی۔ شاید بہت معمولی شروعات۔ ہم میں سے بہت سے لوگ بات کرتے تھے کہ آخر ان کا راج آگیا تو سب سے پہلے ہم پر چوٹ کی جائے گی۔ جس طرح ہمارے گھروں پر حملہ ہوا تھا، ہم سمجھ رہے تھے کہ آگے بھی شروعات اسی سے کی جا رہی ہوں گی۔ دھمکی، کچھ پٹائی، گالیاں اور بے عزت کرنے کے چھوٹے موٹے طریقے اپنائے جائیں گے، پھر شاید ان لوگوں کا دل بھر جائے۔ ویسے بہت سے لوگوں کو تو یہ سب پتا ہونے کی توقع نہیں تھی۔ مہاتما جی جیسے لوگ باقاعدہ کہتے تھے کہ حکومت میں آنے کے بعد حکمرانی کی آسائشوں میں یہ لوگ اتنے مشغول ہو جائیں گے کہ یہ سب انہیں یاد بھی نہیں رہ جائے گا۔

پر یہ سب شاید انہیں یاد رکھنے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ یہ یاد رکھا ان لوگوں نے جن کی طرف سے وہ حکومت میں آئے تھے۔ جو سرکار چلا رہے تھے، وہ وقتی اس معاملے میں بڑے معصوم تھے۔ سب نے قوانین بھی دے دیا تھا کہ جو کچھ ہو رہا تھا وہ ان کے ایجنڈے میں نہیں تھا۔ لیکن پارٹی کے بہت سے لوگوں کے ایجنڈے میں یہ سب سب سے اوپر ہے۔ پہلے دور میں ان لوگوں نے چھوٹے ادارے اپنے ہاتھ میں لے لیے، جیسے ریڈیو، ٹی وی، یونیورسٹیاں، اکادمیاں وغیرہ۔ ان میں مار پیٹ یا زور زبردستی کی نہیں ہوئی، بس وہ جگہیں پارٹی کے لوگوں نے لے لیں۔ بڑے انکسار سے۔ اس پر ہم لوگوں سے خاصی بڑی تکرار کی۔ کچھ مظاہرے ہوئے، دھرنے دیے گئے، بھاشن ہوئے۔ بہت جگہ بہت سے لوگوں نے اس صورت حال کے خلاف لکھا بھی۔

اور پھر یکایک اندھیرا ہو گیا۔ اخباروں میں اس طرح کا کچھ بھی چھپنا بند ہو گیا۔ اس کے

ساتھ ہی سڑکوں، گلیوں، محلوں میں ایک خاص طرح کی ہلچل شروع ہو گئی۔ کچھ لڑکوں کا گروہ کسی بھی محلے سے خاصی اونچی آواز میں ٹھہاکے لگاتا ہوا گزر جاتا۔ چوراہوں پر اونچی آواز والے لاؤڈ سپیکر لگ گئے تھے۔ ان پر یکایک بھجن شروع ہوتا اور مذہبی نعرے لگنے لگتے۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ یہ آوازیں کہاں سے آتی تھیں۔ کبھی کبھی کسی گھبرائے اکیلے شخص کو گھیر کر لڑکے کچھ دیر تک شور غل کرتے تھے اور پھر اس کی لنگی یا پاجامہ اتروا لیتے تھے۔ اس کے ننگے ہو جانے پر شور مچاتے ہوئے وہ اسے وہاں سے دوڑا دیتے تھے۔ یہ ایک طرح کی کوشش تھی کہ کوئی جوابی کارروائی ہو۔ وہ ہوئی۔ کسی نے اس طرح گھرنے کے پہلے ہی ان لڑکوں کی طرف ایک سستا سا ہتھ گولا اچھال دیا۔

یہی وہ واقعہ جس کا انھیں انتظار تھا۔ چھت سے ہم لوگوں نے کئی روز دیکھا، رات کے گہرے نیلے آسمان پر تھوڑی دیر جیسے کالک سی پٹ جاتی تھی، اور پھر کالک کے بیچ سے سرخ، پیلی روشنی ابھر آتی تھی۔ گھر اسی طرح جلتے تھے۔ ظاہر ہے، نسیم صاحب کا مکان بھی ایسے ہی جلا ہوگا۔

ہر کسی کو امید تھی کہ اس قید میں دیر سے ہی سہی، وہ لوگ پانی اور کھانے کا کچھ انتظام ضرور کریں گے، پر ایسا کچھ ہوتا نظر نہیں آیا۔ بہت زیادہ گرمی اور ٹھہری ہوئی ہوا سے بے حال لوگوں نے دیکھا، دوپہر کے بعد آسمان پر بادل آئے اور ٹھہر گئے۔ ہمیں لگا شاید بارش ہو۔ گرمی سے راحت تو ملتی ہی، شاید وہ بارش کا پانی کسی طرح پینے کے کام بھی آ جاتا۔ پر بادل جو آئے تو وہیں ٹھہرے رہے، جیسے کسی کھانے کی چیز پر پھپھوند جم گئی ہو، چپٹی زہریلی۔

یونیورسٹی کے پروفیسروں کے لیڈر موہن لال نے پھر وہی بات دہرائی، ''ہم جنگی قیدی ہیں آخر۔ ہمارے ساتھ ایسا سلوک کیسے کیا جا سکتا ہے؟''

صبح سے وہ بہت بار یہ بات دہرا چکے تھے۔ سب جانتے تھے کہ جو ہو رہا ہے وہ صحیح نہیں ہے۔ پر اس پر احتجاج کیا جائے تو کیسے، اس بات کا فیصلہ ابھی کوئی نہیں کر پایا تھا۔

دھندلکا ہونے لگا تھا اور اندر تک ابال دینے والی امس بھری گرمی کو گھیر کر کھڑی ہوا بالکل ساکت ہو گئی تھی۔ بھوک اور پیاس سے پریشان لوگ ایک بار پھر بیٹھ جانے یا لیٹ جانے کے لیے جگہ کھوجنے لگے، لیکن ایک دوسرے سے بچتے ہوئے۔ تب بھگ سب لوگ یہ سمجھ گئے تھے کہ وہ لوگ جنگی قیدی تو نہیں ہی ہیں۔ اس سناٹے میں ایک آواز ابھری، ''لعنت ہے! شرم کی بات ہے! ہم لوگ

اس طرح یہاں ہمیشہ گھروں کی طرف مڑ رہے ہیں۔ ارے پہلے تو رہتے تھے ہم لوگ، کچھ ہاتھ پاؤں تو چلا سکتے تھے۔"

یہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر کی تقریر تھے۔ پر اس کی آواز میں ایک عجیب کھوکھلاپن تھا۔ دوستوں نے جیسے کسی ردعمل کے بغیر یہ بات سن لی۔ صرف مہاشے جی نے دھیرے سے چہرہ گھما کر [illegible] کی طرف دیکھا، جیسے انہیں ان پر کسی ردعمل کی امید ہو۔ پر یہاں سے کوئی ردعمل نہیں ہوا۔ اور اب میں نے غور کیا، وہاں بھی بالکل سناٹا تھا۔ شام کی دوپہر رفتہ بھی نہیں سنائی دی تھی۔ کیا اب [illegible] سنائی دیں گے جیسے پچھلے دنوں ہم لوگ سنتے تھے؟ گلی کے نکڑ پر [illegible] کی خاموشی ہوا کرتی تھی اور پھر [illegible] پر بہت سے لوگ بے حد گھبرائی ہوئی نظروں سے [illegible] ہوئے گزر رہے تھے۔ ہر دروازے اور کھڑکی کی درزوں سے ایک سنسنی خاموشی گھروں کے اندر دیر تک گھستی رہتی تھی۔ ایسے موقعوں پر میری بیوی جان بوجھ کر تھوڑی تھوڑی [illegible] رہتی تھی [illegible] ہوئے رہتی تھی تاکہ اپنی طرف سے مجھے تھوڑی تسلی دے سکے۔

اچانک مجھے کچھ یاد آگیا۔ جب ان حالات میں ہوئی موتوں کے ساتھ ان لوگوں کی بربریت کی بات سے مجھے پتہ چلا تھا۔ کس غیر انسانی طریقے سے ان لوگوں نے ہمارے گھروں پر حملہ کیا تھا [illegible] دیکھتے ہوئے ان سے کس طرح کی انسانیت کی امید تو نہیں کی جا سکتی تھی۔ پر کیا ہوا ہوگا اس کا [illegible] کیا اسے بھی اسی طرح رکھا گیا ہوگا؟

[illegible] کی خاموشی ایک خوف کی شدت سے ٹوٹتا ہوا کوئی ایک آدمی کی آواز میں سنائی پڑا۔ "[illegible]" [illegible] مسجد کے خلاف ہم نے سنا تھا یہ نعرہ زور سے پڑھنے پر [illegible] کا تھا، کیونکہ جس کتاب آنند مٹھ سے ان لوگوں نے یہ نعرہ سیکھا تھا وہاں یہ مسلمانوں کے خلاف جنگ کے طور پر استعمال کیا گیا تھا۔

اس نعرے کے بعد بھارت [illegible] جیسے چمگادڑوں نے گروہ کی طرح [illegible] اور گہری ہوتی رات کے [illegible] جہاں تہاں [illegible] گئی۔ ایک گھنٹے [illegible] کے [illegible] میں ایک اچھال [illegible] ہم لوگوں نے سنا، باہر کوئی [illegible] آواز میں ختم [illegible] تھا، یا شاید جوان لوگوں کی صبح کی

Scanned with CamScanner

قواعد میں دیا جاتا تھا۔ ایک ساتھ کئی لوگوں کے پیر پٹک کرنے تال سے چلنے کی آوازیں آتی رہیں۔ تھوڑی دیر بعد ساری آوازیں بند ہو گئیں۔ اس سناٹے میں دور سے کوئی ٹرک جیسا آتا سنائی دیا۔ وہ شاید وہیں آرہا تھا۔ عمارت کے قریب آکر تھوڑی دیر وہ ٹرک غراتا رہا، پھر بتیاں بھی بند ہو گئیں اور انجن بھی۔

اندر اندھیرے میں کسی نے کہا: "لگتا ہے یہ لوگ ہم لوگوں کو کہیں اور لے جانے کی تیاری میں ہیں۔" اس بات کو لوگوں نے خاموشی سے سنا۔ تبھی کچھ لوگ دوڑتے ہوئے اس دروازے تک آئے جس سے ہمیں اندر ٹھونسا گیا تھا اور بعد میں کیلوں سے مضبوط تختے جڑ دیے گئے تھے۔ لوہے کی کوئی وزنی چیز ڈھکیل کر وہاں اڑا دی گئی اور بیلچوں سے تختے اکھاڑے جانے لگے۔ کسی نے چیخ کر کہا: "باہر نکالتے وقت یہ بدمعاش کوئی غلط حرکت نہ کرنے پائیں، دھیان رکھنا۔"

تھوڑی دور سے کوئی اور آواز آئی: "دو دو کر کے لائے جائیں گے۔"

کئی روز سے گلی محلوں کے سناٹے کو روندتی عفریتی ہنسی کی طرح ہی اس ہلچل نے ہماری نسوں میں ایک سنسنی بھر دی۔ تختے جلدی ہی اکھڑ گئے، پر سارے نہیں۔ نیچے سے کچھ تختے اکھاڑنے کے بعد وہ وزنی لوہے کی چیز ڈھکیل کر وہاں اڑا دی گئی۔ دراصل وہ لوہے کی جنگلے دار ایسی مضبوط دیوار تھی جسے پولیس سڑکوں پر رکاوٹ کے لیے رکھ دیتی تھی۔ باہر سے کسی نے چیخ کر کہا، "ایک ایک کر کے باہر آؤ۔ دو لوگ۔"

اندر لوگ سناٹے میں آئے کھڑے رہے۔ تختے اکھڑنے سے بنی جگہ پر اڑی روک کے بیچ سے باہر کی ہلکی سی جھلک ملتی تھی۔ باہر کئی لوگ مشعلیں لیے کھڑے تھے۔ ٹرک کہیں نہیں دکھائی دے رہا تھا۔ ضرور تھوڑا ہٹ کر کھڑا کیا گیا ہوگا

"ہم کہہ رہے ہیں، ایک ایک کر کے باہر آؤ،" کسی نے پھر کہا۔

تھوڑی ہچکچاہٹ کے ساتھ مہاشے جی نے اونچی آواز میں کہا، "لیکن کیوں؟"

"ہم لوگ تمھیں رہا کرنے جا رہے ہیں۔"

یہ بات کسی کو بھی قابلِ یقین نہیں لگی۔

"تو اس طرح باہر نکالنے کا کیا مطلب ہے؟" پروفیسر منی سنگھ نے ہم لوگوں سے کہا۔ ان کی

Scanned with CamScanner

آواز شاید باہر والوں نے سن لی تھی۔ باہر آنے کے لیے للکارنے والا بولا: "ہم لوگ کچھ لکھا پڑھی کریں گے، پھر چلے جانا جہاں مرضی آئے۔"

"لیکن اس وقت؟"

"ہاں اسی وقت۔" باہر سے کسی نے فیصلہ دیا۔ "چلو، سب چپ چاپ باہر آ جاؤ۔"

اندھیرے میں اندر خاموش کھڑے لوگوں میں سے کوئی بولا: "چلو نا، کھڑے کیوں ہو؟"

وہ آدمی لوگوں کو ہٹا کر دروازے کے کھلے حصے کی طرف جانے لگا۔ تبھی پیچھے سے مہاشے جی چیخے: "خبردار، کوئی باہر نہیں جائے گا۔ کوئی نہیں نکلے گا۔"

"جب وہ لوگ بلا رہے ہیں۔ اور پھر یہاں سب تنگ رہتے ہیں؟" دروازے کے پاس سے ایک اور آواز آئی۔

"نہیں، بالکل نہیں، خبردار!" شاید مہاشے جی ہی تھے جو لوگوں کو دھکیلتے ہوئے دروازے تک گئے اور چوکھٹ پکڑ کر کھڑے ہو گئے۔ "میں جانتا ہوں، تم لوگ نہیں جانتے۔ دھوکا دیا جا رہا ہے تم لوگوں کو۔ میں کہتا ہوں کوئی باہر نہیں جائے گا۔"

باہر کہیں دور سے کسی نے للکارا: "پنڈت، ذرا دیکھ تو کون ہے۔" جسے پنڈت سے مخاطب کیا گیا تھا، شاید وہی بولا: "ابھی دیکھتا ہوں اس چوہے کو۔ ذرا روشنی اندر دکھانا۔"

وہ تین لوگ مشعلیں دروازے کے کھلے حصے کے پاس لے آئے۔ اسی وقت جھک کر ایک بہت ضخیم آدمی اندر داخل ہوا۔ اس کے اندر گھستے ہی دروازے کی طرف مڑ کر چیخے مہاشے جی دھکا کھا کر پیچھے کھڑے لوگوں سے جا لگے۔ پیچھے مڑ کر دھکیلنے والے کو دیکھ کر وہ بولے: "یہ کیا ہے؟"

"اچھا تو تم ہو! تمھاری تو..."

لوگوں کے دیکھتے دیکھتے اس گرانڈیل آدمی نے مہاشے جی کو اٹھایا اور کسی کھل گئے بستر بند کی طرح انھیں دروازے کے کھلے حصے سے باہر اچھال دیا۔

باہر کچھ آوازیں آئیں: "مارو سالے کو!"

وہ گرانڈیل آدمی اپنے ننگے بدن پر جسم سنبھالتا ہوا بھیڑ کی طرف گھور کر بولا: "تم لوگوں کو بھی دیکھتا ہوں۔"

تبھی اس بھیڑ میں ہلچل ہوئی۔ جس شخص نے کچی زمین میں گڑھے بنا کر حاجت کے مسئلے کو حل کرنے کی ترکیب بجھائی تھی، وہ جیسے لوگوں کے اوپر تیرتا ہوا آیا اور "مارو!" کی آواز کے ساتھ اس نے زمین کھودنے میں استعمال کی گئی چیز سیدھے اس گرانڈیل آدمی کے پیٹ میں دھنسا دی۔ وہ جھاڑیوں کو کترنے والی ایک بھاری بھرکم قینچی تھی۔ قینچی اس پہلوان نما آدمی نے دونوں ہاتھ سے پکڑی اور لگا اسے کھینچ کر باہر نکالنے۔ پر ایسا کچھ نہیں ہوا۔ بے حد دہشت زدہ نگاہیں جھکا کر اس نے اپنے پیٹ میں دھنسی بڑی قینچی کی دونوں موٹھیں دیکھیں اور گھٹنے کے بل بیٹھ گیا۔ اس کا منھ تھوڑا سا پھیل گیا، پر آواز کوئی نہیں نکلی۔ اس کے بہت آہستہ سے ایک طرف لڑھک جانے کے بعد سب سے پہلے باہر کھڑے مشعل والے چیخے۔

کسی نے کہا نہیں، پر راکھ سے کالے ہوئے ہر شخص نے سمجھ لیا کہ فیصلہ کن لڑائی شروع ہو چکی ہے۔

❀❀

مدرارا کھشس

ہندی سے ترجمہ: ذکیہ علوی

جنگ

''ابھی نہیں آئے'' شوہر نے کھڑکی سے الگ ہٹتے ہوئے اکتا کر کہا۔ بیوی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ چپ چاپ اپنے بالوں کو سنوارتی رہی، گویا کوئی مہمان آنے والا ہو۔ بال سنوار چکنے کے بعد اس نے اپنے ہونٹوں کو احتیاط سے رنگا اور انگلی میں بچا ہوا رنگ اپنے نرم گالوں پر رگڑنے لگی۔ شوہر اکتا کر پھر اسی کھڑکی پر جا کھڑا ہوا۔ ایک بار اس نے جھانک کر باہر دیکھنے کی کوشش کی، لیکن دور کہیں زوردار دھماکا ہوا اور اس نے گردن کھڑکی کے اندر کر لی۔ بیوی ہنس پڑی۔ شوہر نے ہنسی سنی لیکن اندر پلٹ کر نہیں دیکھا۔

''آئیں گے ضرور!'' بیوی نے اسے جیسے تسلی دی۔ شوہر نے کوئی جواب نہیں دیا۔

آئیں گے ہی، جب سارے شہر کے لوگ کہہ رہے ہیں تو صحیح ہوگا۔ شہر خالی بھی ہو چکا ہے۔ جنھیں بھاگنے کا موقع نہیں ملا وہ کہیں نہ کہیں چھپنے کی کوشش میں تھے۔ لیکن وہ جانتا تھا کہ اب چھپنا بیکار تھا۔ بھاگنا بھی بیکار ہی تھا۔

اچانک ایک ساتھ کئی دھماکے ہوئے اور کمرے کی کھڑکی کا شیشہ ٹوٹ کر نیچے آ رہا۔ شوہر کھڑکی سے الگ ہوا اور ایک کرسی پر پیر ٹکا کر بیٹھ گیا۔

کیا ٹینک دھیرے دھیرے آگے بڑھتے ہیں لوگ؟ ایک دھماکا اور ہوا اور اس مرتبہ اس کا سارا مکان ہل گیا۔ کمرے میں بری طرح دھول بھر گئی۔ اس قدر دھول بھر گئی کہ اسے دیر تک [illegible]۔

دیا۔ وہ خود کرسی سے نیچے آ گرا تھا۔ دھیرے دھیرے اٹھ کر اس نے دھول جھاڑی اور کمرے میں نگاہ دوڑائی۔ اس کی بیوی اسی طرح آئینہ ہاتھ میں لیے اپنا چہرہ سنوار رہی تھی۔ شوہر نے اُدھر سے نگاہ ہٹا لی۔ پھر جیسے اسے کچھ یاد آیا ہو، اس طرح وہ باہر کی طرف بھاگا۔ تھوڑی دیر میں وہ لوٹا۔

''میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ جب ادھر سے کوئی مقابلہ نہیں کیا جا رہا ہے تو پھر وہ لوگ اس طرح گولہ باری کیوں کر رہے ہیں؟''

وہ جیسے اپنے آپ سے مخاطب تھا۔

''ان کی مرضی!'' بیوی نے لاپروائی سے کہا۔ ''یہ بھی ممکن ہے کہ وہ لوگ صرف یہ بتانے کے لیے ہی گولے چلا رہے ہوں کہ وہ آ رہے ہیں۔ آخر وہ یہاں باجے بجاتے ہوئے تو نہیں آ سکتے!''

''لیکن پھر وہ آتے کیوں نہیں؟'' شوہر نے چڑ کر کہا۔

''شاید وہ بہت چپ چاپ، دھیرے دھیرے آ رہے ہوں، یا پھر ڈر کر آگے بڑھ رہے ہوں۔''

کئی گھنٹے انتظار کے بعد باہر کی طرف کچھ آہٹیں ہوئیں۔ ''وہ آ گئے!'' شوہر نے کہا۔

اس بار اس نے دیکھا کہ بیوی کے جسم میں ایک عجیب کپکپی ہوئی جیسے کسی نے اس کی پیٹھ پر پنجے گاڑ دیے ہوں۔ میک اپ کے نیچے اس کے چہرے کی کھال جیسے سفید پڑ گئی۔ اس نے کچھ کہنا چاہا، لیکن کہہ نہ سکی۔ وہ کمزور سی لگنے لگی اور پھر دھیرے سے وہیں فرش پر بیٹھ گئی۔

''کیا تمھیں ڈر لگ رہا ہے؟'' شوہر نے پوچھا۔

''نہیں!'' بیوی نے کہا لیکن فوراً ہی اس کے پیلے چہرے پر ایک کھچاؤ کی کیفیت طاری ہوئی اور ایک ہاتھ سے پیٹ مروڑتے ہوئے اس نے فرش کی دھول پر قے کر دی۔ اس کے بعد وہ تھوڑا سنبھلی، چہرے کا پیلا پن بھی کم ہو گیا۔

شوہر نے اٹھ کر وہاں جہاں قے کی گئی تھی، دروازے کے پاس کی مٹی ڈال دی۔ مٹی ڈال کر وہ پلٹا ہی تھا کہ دروازے پر ایک ساتھ کئی سائے نمودار ہوئے۔ ان کے ہاتھوں میں اسٹین گنیں تھیں۔ شوہر لمحے بھر کے لیے ساکت ہو گیا، لیکن پھر دھیرے دھیرے پیچھے کی طرف کھسکنے لگا۔ کمرے کے منظر کی عادی ہوتی آنکھوں نے اب بیوی کو بھی دیکھ لیا۔ باوردی لوگوں میں سے ایک

بڑے جوش وخروش سے چیخا۔ سامنے والے آدمی نے سخت آنکھوں سے چیخنے والے کی طرف دیکھا۔ وہ خاموش ہو گیا۔

سامنے والا آدمی تھوڑا سا آگے آیا اور شوہر سے بولا: "ڈرنے یا بھاگنے کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ میں یقین دلانا چاہتا ہوں کہ اگر ہماری مدد تم نے اچھی طرح کی تو ہم تمہیں انعام بھی دیں گے۔"

اسی درمیان پیچھے سے کچھ فوجیوں میں ہلچل ہوئی۔ شاید اور زیادہ لوگ آگئے تھے۔

"لڑکی، عورت! عورت!" وہ چلائے۔

بیوی تھوڑی گھبرائی، لیکن پھر سنبھل گئی۔ سیدھی آواز میں سامنے والے، افسر جیسے آدمی سے بولی: "یہ لوگ تمہارے ہی سپاہی ہیں؟"

"ہاں!" افسر نے جواب دیا۔

"تم انھیں ڈسپلن میں نہیں رکھ سکتے؟" وہ بولی۔

فوجی جیسے غصے میں بھرے آگے لپکے۔ سامنے کے دو تین سپاہیوں نے موٹی سی گالی دی۔ افسر اچانک ان کی طرف گھوما اور انھیں اپنے کو قابو میں رکھنے کا حکم دیا۔

فوجیوں میں وحشیانہ فطرت جاگی۔ وہ یک ساتھ چلائے: "یہ لوٹ کا مال ہے، ہم اسے لیں گے!"

"باہر نکل جاؤ!" افسر دہاڑا۔

فوجی دھیرے دھیرے پیچھے ہٹتے ہوئے باہر نکل گئے۔ باہر پہنچ کر کسی نے افسر اور اس عورت کو بھونڈی سی گالی دی۔ کھسیانا افسر غصے میں باہر نکلا، لیکن جب تک وہ سب غائب ہو چکے تھے۔ افسر اس عورت کی طرف لوٹا، اور اب اسے اچانک یہ لگا کہ وہ ایک فاتح فوجی افسر ہے اور کمرے میں کوئی عورت ہے۔ عورت کی طرف اس نے دھیان سے دیکھا۔ عورت کے چہرے پر کوئی تبدیلی نہیں تھی۔ ڈر بھی نہیں تھا وہاں، ذلت اور شرمندگی بھی نہیں تھی۔ صرف ایک جذبات سے عاری چہرہ تھا، سپاٹ۔ اس بیچ پلکیں بھی جھپکتی نہیں دکھائی دیں اسے۔ عورت کے سنورے ہوئے بالوں پر گرد کی ایک تہہ جم گئی تھی، کپڑوں پر بھی گرد تھی، پھر بھی عورت کم خوبصورت نہیں تھی۔

افسر نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی طرف بڑھا اور اس نے ہاتھ بڑھا کر اس کے کپڑوں کی گرد

Scanned with CamScanner

جھاڑنی شروع کردی۔ عورت کے چہرے سے لے کر اس کے جسم تک کہیں کوئی جنبش نہیں ہوئی۔ افسر ٹھہر گیا۔ پھر ایک بار اس نے بالوں کی گرد کو پھونک مار کر اڑایا۔ گرد اس کی آنکھوں میں بھر گئی۔ آنکھیں ملتا ہوا وہ الگ ہٹ گیا۔ اب اس کی نگاہ عورت کے شوہر پر پڑی۔

''گدھے، میری صورت کیا دیکھ رہا ہے؟ گھر میں کھانے کا جو سامان ہے، لے کر آ!'' وہ اس کے شوہر پر گرجا۔ شوہر تیزی سے اندر کی طرف لپکا۔ تبھی اس نے پھر کہا، ''اور دیکھو، بھاگنے کی کوشش مت کرنا۔ سارے شہر میں میری فوج ہے۔ گولی مار دی جائے گی۔ اور ہاں، کھانے کے بارے میں زیادہ چالاکی دکھانے کی کوشش مت کرنا۔''

شوہر حکم لے کر پھر اُدھر ہی لوٹ چلا۔ اس کے جاتے ہی جیسے وہ مورت کی طرح کھڑی عورت ہلی۔ افسر نے دیکھا اسے ہلتے۔ وہ اور زیادہ ہلی اور پھر اچانک باہر کی طرف بھاگی۔ پلک جھپکتے ہی وہ اس کی طرف جھپٹا اور اسے کمر سے اس طرح پکڑ لیا گویا کسی بھاگتی ہوئی ناگن کو پکڑ لیا ہو۔ عورت نے بل کھایا اور اس نے ٹھیک کسی ناگن کی طرح ہی اس کی کلائی میں اپنے دانت گڑا دیے۔ افسر کی بانہیں ڈھیلی پڑ گئیں۔ لیکن اس نے عورت کی کمر پر ایک گھونسا مارا۔ عورت چیخی نہیں، کراہی بھی نہیں، بلکہ اس نے دونوں ہاتھوں کے ناخنوں سے اس کے چہرے کو کھروچ دیا۔ لیکن اس سے زیادہ کچھ نہیں ہوا۔ جلد ہی بے جوڑ افسر نے اسے قابو میں کر لیا۔ عورت ہانپتی رہی اور تیکھی نگاہوں سے افسر کو گھورتی رہی۔ افسر طنزیہ مسکرایا۔ اس کی مسکراہٹ ابھی سمٹی بھی نہیں تھی کہ عورت نے اس پر تھوک دیا۔ ٹھیک چہرے پر، ناک کے بیچوں بیچ۔ بہت سا تھوک افسر کے چہرے پر چپک گیا اور عورت ہنسنے لگی۔

افسر نے تھوک کو پونچھا نہیں، جوں کا توں رہنے دیا۔ عورت کے ہانپنے سے اور ہاتھ پیچھے کی طرف جکڑے ہونے کی وجہ سے اس کی چھاتیوں کا ابھار افسر کو اور وحشی بنا گیا۔ تبھی اس نے اپنا ہاتھ آزاد کرتے ہوئے ایک جھٹکے سے عورت کے بدن کے کپڑے نوچ دیے۔ سامنے کی طرف کے پھٹے کپڑوں سے اس کی بھری ہوئی سفید چھاتیاں دکھائی دینے لگیں کانپتی ہوئی۔ وہ ایک ایک کر اس کے کپڑے اس طرح چیرتا گیا جیسے اس کی کھال اتار رہا ہو۔ ایک ایک دھجی اس نے چیر کر الگ پھینک دی اور پھر جذبات سے مغلوب ہاتھوں سے بھینچ کر اس کے ہونٹوں پر بے تحاشا پیار کرنے لگا جس میں غصے کا عنصر بھی شامل تھا۔ اس کے بعد عورت نے دوبارہ اس کے چہرے پر تھوک دیا۔ افسر آپے سے

باہر تھا۔ اس نے عورت کو گھورا اور قریب ہی کرسی کی طرف بڑھا۔

کرسی پر بیٹھتے افسر کے سینے سے چپکی عورت کی آہ نکلی۔ کمرے میں پیچھے کے دروازے سے ایک سایہ ابھرا۔ وہ اس کا شوہر تھا۔ عورت نے آنکھیں بند کر لیں۔ شوہر نے دونوں ہاتھوں میں پلیٹیں تھیں۔ تھوڑی دیر تک وہ وہیں دروازے پر کھڑا رہا۔

افسر نے عورت کے ننگے بدن کو دونوں بازوؤں سے جکڑ کے ایک جھٹکے سے الگ کیا اور نیچے دھکا دیا۔ گری ہوئی عورت دھیرے دھیرے اٹھ کر بیٹھ گئی — وہیں فرش پر، جوں کی توں۔

شوہر پلیٹوں کے ساتھ اندر آ گیا۔ افسر نے اپنی اسٹین گن اٹھائی اور اپنی گود میں رکھ لی۔ اس کے بعد وہ پلیٹوں پر ٹوٹ پڑا۔ وہ کھاتا رہا، کسی بھوکے وحشی جانور کی طرح۔ اور شوہر پانی کا گلاس لیے اس کے کھا چکنے کا انتظار کرتا رہا اور بیوی جوں کی توں، جب تک ان میں سے کسی کو بھی دیکھے بغیر دیکھتی رہی۔ افسر کھا چکنے کے بعد بھی پانی پی رہا تھا کہ دروازے پر پھر شور ابھرا۔ وہی دو فوجی پھر آ دھمکے تھے۔

"یا مرحبا" السرجنٹ۔

"سر..."

"سر..."

"ہمیں پورے شہر میں صرف چار عورتیں ملیں، جو اس قدر بوڑھی ہو چکی ہیں کہ کتا بھی نہیں نہ کھائے!" ایک فوجی نے ہمت کر کے کہا۔

"آپ کا حکم ہو جناب، اس عورت کو ہم چاہتے ہیں" دوسرا سپاہی پیچھے سے چلا رہا۔

عورت کی طرف عجیب سی تجسس سے، جو بکھری ہوئی تھی۔

اس کی بات پر کر افسر نے جھنجھلاتے ہوئے کہا، "میں کہہ رہا ہوں، یہاں سے چلے جاؤ ورنہ گولی مار دوں گا!"

"سر!"

"سر، ہمیں یہ عورت دے دیجیے، ہم چلے جائیں گے۔"

افسر غصے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ لیکن وہ بول کچھ بھی نہیں سکا۔ مچھلی کی طرح خوبصورت وہ عورت

دھیرے دھیرے اس بھیڑ کی طرف بڑھی۔ اس کے قریب جا کر وہ رکی۔ فوجی دو پل کے لیے خاموش، اس کے ننگے جسم کو دیکھتے رہے۔ پھر جیسے ان میں طوفان مچ گیا۔ وہ سارے کے سارے ایک ساتھ اس پر ٹوٹ پڑے۔ کتنی ہی بانہوں میں ہوتا ہوا عورت کا سنہرا، گلابی جسم ان کے بیچ کبھی اس طرح چمک جاتا تھا جیسے باڑھ کے گندے پانی میں کسی بچے کا کھلونا ڈوبتا، ترتا سا بہہ رہا ہو۔

افسر تھوڑی دیر بھیڑ کی بے باک آنکھیں دیکھتا رہا اور پھر اپنی اسٹین گن ہاتھ میں لے کر فوجیوں سے کتراتا ہوا باہر نکل گیا۔ بھیڑ میں دیر تک معلوم نہ ہو سکا کہ عورت کہاں ہے۔ شوہر چپ چاپ ایک طرف، دیوار سے کسی کاکروچ کی طرح چپکا کھڑا رہا۔ دھیرے دھیرے شور شرابا ختم ہونے لگا اور ایک ایک کر فوجی ایک کنارے آ کر اپنی پتلونیں باندھنے لگے۔ کسی کی نگاہ اس کے خوفزدہ شوہر کی طرف گئی۔ دیکھے جانے کے بعد کسی شک کی بنا پر وہ تیز قدم بڑھاتا اندر کے کمرے کی طرف بھاگ گیا۔

ایک اندھیرے کونے میں سمٹا ہوا وہ باہر کے کمرے کا شور شرابا سنتا رہا۔ تھوڑی دیر کے بعد شور کم ہونے لگا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اب دو چار لوگ ہی وہاں ہوں۔ ان کی فحش گالیاں بھی اسے اب سنائی دے رہی تھیں۔ اور کچھ دیر بعد جیسے سبھی کچھ خاموش ہو گیا۔

تھوڑا سا ٹھہر کر وہ دھیرے دھیرے باہر کی طرف چلا بہت چپ چاپ۔ باہر کوئی نہیں تھا۔ بس فرش پر بیوی کا اجلا جسم بکھرا ہوا تھا۔ وہ شاید بیہوش تھی۔ اس نے اس کے جسم کو ہلایا۔ بیوی نے آنکھیں کھول دیں۔ ایک بار اس نے آس پاس دیکھا اور پھر اٹھنے لگی۔ شوہر نے سہارا دینا چاہا، لیکن اس نے سہارا نہیں لیا۔ کسی لکڑی کے جسم کی طرح وہ اٹھی اور کرسی پر آ بیٹھی۔ ساکت۔ گُن۔ شوہر نے اس کے جسم کو قریب سے ایک بار دیکھا اور پھر پلٹتا ہوا اندر چلا گیا۔ اندر سے وہ ایک چادر اور ایک تولیہ لے آیا۔ دونوں چیزیں اس نے بیوی کی بانہوں میں ڈال دیں اور کھڑکی پر جا کھڑا ہوا۔

باہر بے حد ویرانی تھی۔ کہیں کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ کھڑکی کے باہر دیکھتے دیکھتے ہی جیسے وہ اپنے آپ سے، لیکن اونچی آواز میں بولا: ''کیا یہ اچھا نہیں ہوگا کہ ابھی ہم لوگ چپ چاپ باہر نکل جائیں؟''

''کس لیے؟'' بیوی نے کہا۔

اس کے بعد وہ خاموش ہو گئے۔

Scanned with CamScanner

شہر میں روشنی نہیں تھی۔ بیوی نے کپڑے پہن لیے تھے۔ شوہر تب سے اب تک اس کھڑکی سے ہٹا نہیں تھا۔ وہ ہٹا تب، جب سے کمرے کے اندر بھاری بھاری بوٹوں کی دھمک سنائی دی۔

وہی افسر تھا۔ اس مرتبہ اس کے ساتھ چند ایسے آدمی تھے جو بالکل روبوٹ کی طرح کام کر رہے تھے۔ اور ان کے پیچھے ایک آدمی تھا جس نے عام شہریوں جیسے کپڑے پہن رکھے تھے۔ اسی نے بڑھ کر تپاک سے عورت کا استقبال کیا۔ افسر انتہائی مہذب طریقے سے آگے آیا اور بولا،

"ہم آپ کو تھوڑی سی زحمت دینا چاہتے ہیں، اور ہمیں امید ہے کہ آپ ہمیں معاف کریں گی۔"

افسر نے اپنے ساتھ والے اس شہری لباس والے شخص سے پوچھا، "کیا ٹھیک رہے گا یہاں یا باہر؟ باہر ابھی تھوڑی سی چاندنی ہے۔"

"باہر ہی بلا لیجیے،" اس آدمی نے کہا۔

"آپ کو تکلیف تو ہوگی لیکن آپ ذرا ہمارے لیے باہر آ جائیے،" افسر نے انکسار سے کہا۔

عورت کچھ ٹھٹکی ہوئی۔ اس کی طرف ایک سپاہی نے ہاتھ بڑھایا اور اسے باہر لے آیا۔ دو کرسیاں لائی گئیں۔ ایک پر عورت بیٹھ گئی اور باقی دونوں پر افسر اور وہ شہری لباس والا آدمی۔

افسر نے کہا، "دیکھیے، یہ جو میرے ساتھ آئے ہیں، ہمارے یہاں کے ایک مشہور صحافی ہیں۔ یہ آپ کا انٹرویو لینا چاہتے ہیں۔ آپ جو کچھ کہیں گی، ہم یہ سب تمام اخباروں میں چھپوائیں گے۔ ریڈیو سے بھی براڈکاسٹ کرائیں گے۔ آپ صرف یہ بتا دیجیے کہ ہمارے آنے سے پہلے یہاں جو حکومت تھی، وہ کتنی خراب تھی اور اس نے آپ کے ساتھ کیا ظلم کیا۔ اس میں آپ یہ بھی کہہ سکتی ہیں کہ یہاں کے لوگوں نے آپ کے ساتھ زیادتی بھی کی۔"

"مجھے کوئی بیان نہیں دینا ہے۔ آپ جو چاہیں اپنی طرف سے لکھ کر چھاپ دیجیے،" عورت نے سیدھی آواز میں کہا۔

شہری لباس والا آدمی پھر اٹھ کھڑا ہوا، "دیکھو بی بی، میں یہاں تمھارا مشورہ لینے نہیں آیا ہوں۔ فوج کا معاملہ ہے۔ زیادہ باتوں کی ضرورت نہیں ہے۔ سیدھی سی بات اگر تمھارے دماغ میں آ جاتی ہے تو ٹھیک ہے، ورنہ ہم دوسرا راستہ اپنائیں گے۔"

تھوڑی دیر خاموشی چھائی رہی۔ اس کے بعد دھیمی آواز میں عورت نے پوچھا، "میں یہ بھی کہہ

سکتی ہوں کہ تم لوگوں نے کیا کیا ہے؟''
''نہیں، قطعی نہیں!''

ٹیپ ریکارڈر چلنے لگا۔ دھیرے دھیرے گھومتی چرخیوں کے پار دیکھتی ہوئی عورت بڑی احتیاط سے ایک ایک بات، جیسی کہی گئی تھی اسی طرح بولتی چلی گئی۔ طوطے کی طرح سبھی باتیں، ساری ہی باتیں اس نے کہیں۔ جو بھی ضروری تھا۔ آخر میں اس نے یہ اور جوڑ دیا کہ اس کے ساتھ دشمن کے ان سپاہیوں نے جتنا اچھا سلوک کیا اس کے لیے وہ ان کی شکرگذار ہے۔

ٹیپ ریکارڈر چلا گیا۔ اور لوگ بھی چلے گئے۔ صرف ایک پہریدار اسٹین گن لیے ان لوگوں سے تھوڑی دور کھڑا رہا۔ افسر عورت کے قریب آیا۔ عورت اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ افسر نے مسکراہٹ کو ہونٹوں پر پھیلاتے ہوئے کہا: ''شکریہ!''

عورت بھی خفیف سا مسکرائی۔ پھر اس نے کہا: ''اب آپ جانا چاہیں گے، یا پھر میں یہاں سے جاؤں؟''

''میرا خیال ہے کہ ہم دونوں یہاں سے چلیں،'' افسر نے کہا اور عورت کی بانہہ پکڑ کر بڑے احترام سے مکان کی طرف چل پڑا۔

''وہ سو رہا ہے؟'' شوہر نے دھیمی آواز میں پوچھا۔

''نہیں، جاگ تو چکا ہے، لیکن تھکن اتار رہا ہے،'' بیوی نے کہا اور میز پر پیالے سجانے لگی۔

''تم کافی دیکھ لو، میں میز ٹھیک کرتا ہوں،'' شوہر نے کہا۔ لیکن بیوی اپنا کام کرتی رہی۔ شوہر وہیں ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ دیر تک کوئی نہیں بولا۔ پھر نہ جانے کیسے شوہر اپنے آپ سے بول پڑا۔

''میں سمجھتا ہوں کہ ہماری فوجیں ضرور واپس لوٹیں گی اور ہمیں آزاد کریں گی۔''

''کس سے آزاد کریں گی؟'' بیوی نے پوچھا

''اس بدقسمتی سے۔''

''کون سی بدقسمتی؟''

''یہی، ان دشمن فوجیوں کے ظلم کی بدقسمتی سے۔''

"اس میں ایسی کیا بات ہے جو پہلے نہیں ہوتی ہے؟ کون سا ایسا نیا جرم کیا ہے ان لوگوں نے؟" عورت نے ایک طنزیہ انداز میں کہا۔

"یہ تم کہہ رہی ہو؟ تم جس کے ساتھ دشمنوں کی ایک پوری فوج نے زیادتی کی!" شوہر دکھ اور غصے کے ملے جلے احساس سے بولا۔

"زیادتی! لیکن انھوں نے ہمیں کوئی تو نہیں ماری زیادتی... زیادتی تم نہیں کرتے؟ بولو تم نے نہیں کی زیادتی...؟ اور اس سارے شہر میں کون نہیں کرتا ہے؟"

"تو تم سمجھتی ہو کہ یہ اچھا ہوا؟" شوہر نے آنکھیں جھکا کر کہا۔

"برا کیا ہوا؟ اس سے اچھا ہوتا کیا؟"

"چلو ٹھیک ہے۔ دیکھو شاید کافی بن گئی ہو۔" شوہر نے کہا، اور پھر جیسے خیر کی منتظر نے بولا: "آج بھی شاید وہ رہے گا۔ آج رات بھی وہ یہیں سوئے گا نا؟"

بیوی نے جواب نہیں دیا۔ وہ اٹھ کر کافی لانے چلی گئی۔

شوہر جوں کا توں بیٹھا رہا۔ بیوی کافی کی کیتلی لے کر لوٹی۔ جانے کیوں، اس کے واپس آنے پر شوہر اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔ بیوی نہیں مسکرائی۔ وہ مایوس ہوا۔ سر جھکا کر بولا: "میں نہیں سمجھتا کہ ہمیں مسکرانا بھی نہیں چاہیے۔"

"کسی نے منع تو نہیں کیا ہے۔ ہاں سنو، کل یہ فوجی یہاں سے اگلے شہر کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ یہ افسر بھی چلا جائے گا۔ پھر تو ہم شاید..."

دروازے پر افسر انگڑائی لیتا ہوا نظر آیا۔ دونوں خاموش ہو گئے۔ افسر مسکرا کر بولا:

"گڈ مارننگ!"

بیوی مسکرائی۔ شوہر نے جواب میں سر ہلا دیا۔

افسر میز پر عورت کے قریب والی کرسی پر آ کر بیٹھ گیا۔ کافی اور ناشتے کے سامان کو پیار سے دیکھتے ہوئے بولا: "دوست، میں آپ کا بہت شکر گزار ہوں۔ یہ اچھا کھانا... اچھا... میرا مطلب ہے... آپ کی یہ خوبصورت بیوی... ہاں..."

اچانک ایک بھیانک دھماکا ہوا کہ مکان ایک بار ہل گیا اور سامنے کے گرتے ہوئے حصے کی بچی

Scanned with CamScanner

پکی دیوار بھی ڈھے گئی۔ افسر نے جھٹکے سے عورت کو کھینچ کر میز کے نیچے کر دیا۔ دھماکے رُکے نہیں۔ ایک پر ایک گولے آتے رہے اور ایسا لگنے لگا جیسے سمو چے شہر کو روئی کی طرح دُھنا جا رہا ہو۔ افسر تیزی سے نکل کر بھاگا۔ شوہر ایک کونے میں قفس بھرے جانور کی طرح نکار رہا اور بیوی میز کے نیچے چھپی رہی۔ ان کے مکان پر گولے نہیں آئے۔ لیکن نیچے کی پوری زمین اس طرح ہل رہی تھی گویا بار بار بھونچال آ رہا ہو۔ دھواں، بارود، دھول، اور دیواروں کے بیچ گھرے دو ساکت لوگ۔ دونوں میں سے کوئی کچھ نہیں بولا۔ کسی کو یہ نہیں پتا تھا کہ دھول کے اس اندھیرے میں دوسرا کیسا ہے۔ شاید سارے دن اسی طرح گولہ باری ہوتی رہی ہو، یا بیچ میں رک بھی گئی ہو۔ لیکن یہ ضرور معلوم ہے کہ دونوں ہی تقریباً اس انتظار میں رہے کہ کوئی گولہ سیدھے انھی پر آئے گا اور ان کی دھجیاں اڑا دے گا۔ پر ایسا ہوا نہیں۔ ہاں، دھماکوں سے پیدا ہوا جمود۔۔۔ اور انتظار۔۔۔ کسی بھی وقفے کے انتظار سے ان کی پلکوں میں بھاری پن آیا، اور پھر وہ دونوں سو گئے۔

اندھیرا بہت زیادہ تھا۔ ممکن ہے کہ دھوئیں اور دھول کی وجہ سے اتنا اندھیرا ہو، یا پھر رات ہی اتنی گھر آئی ہو۔ گولہ باری بالکل ختم ہو چکی تھی۔ شوہر جاگ کر بالکل جوں کا توں بیٹھا رہا۔ پھر جیسے اسے یقین ہو گیا ہو کہ رات ہو چکی ہے لیکن وہ؟

کیا وہ افسر لوٹ آیا ہوگا؟ یا اس نیند کے بیچ کسی گولے نے اس کی جان لے لی ہوگی؟ وہ دھیرے دھیرے رینگا۔ اسے تھوڑی ہی دور رینگنا پڑا۔ اس کی ہتھیلیوں کے نیچے ایک گرم، ملائم جسم محسوس ہوا۔ وہی تھی۔ اسی کا جسم تھا۔ لیکن اس کے کپڑے؟ اس حالت میں تو نہیں تھی وہ، جب صبح گولہ باری شروع ہوئی تھی۔ کیا وہ افسر بھی یہیں تھا؟

وہ بیوی کے جسم کو چھوڑ کر اندھیرے میں ہی اور آگے تک کسی اور کا جسم ٹٹولنے لگا۔ پیچھے سے اسے ایک ہنسی سنائی دی۔ اس کی بیوی ہی ہنسی تھی۔

''کسے کھوج رہے ہو؟'' اس نے ہنستے ہوئے کہا، ''اس افسر کو؟''

''آں۔۔۔؟ نہیں، نہیں تو۔۔۔''

''کوئی نہیں ہے یہاں۔ کوئی آیا بھی نہیں،'' بیوی نے اندھیرے میں اٹھتے ہوئے کہا۔ ''بات

یہ ہے کہ مجھے ڈر لگ رہا تھا اس گولہ باری سے۔ بہت ڈری ہوئی تھی۔ لیکن سنو، عجیب سی بات ہے کہ جیسے ہی میں نے اپنے کپڑے اتارنے شروع کیے، میرا ڈر بھی کم ہو گیا۔"

شوہر کو اب ڈر لگنے لگا تھا۔ وہ سرک کر بیوی کے قریب آ گیا۔ اس نے دبی آواز میں کہا، "میرا خیال ہے کہ آج اب کوئی نہیں آئے گا۔ آج تو صرف..."

یکایک باہر مشین گنوں سے گولیاں چلنے لگیں بہت تیزی سے اور چاروں طرف سے۔ ساتھ ہی چھوٹے چھوٹے گولے بھی پھٹ رہے تھے۔

"یہ صورت حال بہت ہی خطرناک ہے۔" شوہر نے کہا، "جلدی کرو، ہم لوگ پیچھے کے کمرے کے تہ خانے میں اتر چلتے ہیں۔ جلدی آؤ..."

بیوی ہنسی۔ "میں جانتی ہوں، مجھے معلوم ہے۔ تم ڈر رہے ہو کہ شاید پھر موقع نہ ملے۔ خیر، تم بھی اپنے کپڑے اتار دو۔ ڈر نہیں لگے گا۔ اور پھر تہ خانے میں چل کر بیٹھتے ہیں۔"

شوہر نے ابھی کپڑے اتارنے کی کوشش ہی کی تھی کہ باہر آسمان پر اس طرح کی روشنی پھیلنے لگی جیسے ایک ساتھ بجلی چمک رہی ہو۔ اور پھر اسے لوگوں کا شور بھی سنائی دینے لگا۔

شوہر کے ہاتھ جہاں کے تہاں رک گئے۔ پھر وہ مایوس ہو کر وہیں بیٹھ گیا۔

اس بار زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا انھیں۔ دشمن کو پیچھے ڈھکیلتے ہوئے ان کے اپنی طرف کے فوجی شہر میں آ پہنچے تھے۔ ایک ایک مکان کی کھڑکی اور دروازے پر مشین گنوں سے گولیاں برساتے ہوئے وہ آگے بڑھ رہے تھے۔ ایک ایک مکان کے اندر سے دشمنوں کا صفایا کرنا تھا انھیں۔ مکانوں کے اندر فوجیوں کو جو بھی مل جاتی تھی، اور جو کچھ بھی ہاتھ آتا تھا اسے اپنے لیے چھین لیتے تھے، کیونکہ انھیں معلوم تھا کہ انھیں کئی روز یہاں ٹھہرنے ہوں گے۔

اور تبھی انھیں ملے یہ بدقسمت لوگ۔ افسر کوئی بھی ساتھ نہیں تھا۔ تعداد ان کی بہت تھوڑی تھی۔ دشمنوں کا ڈر بھی تھا۔ اس لیے ان میں سے ایک آدمی دروازے کی طرف کھڑا ہو گیا اپنی اسٹین گن لے کر اور باقی جلدی جلدی چاروں طرف خلاف امید ملی اس عورت پر ٹوٹ پڑے۔ کسی نے دھکا دے کر شوہر کو ایک طرف ڈھکیل دیا۔ جگہ کی وجہ سے لیٹنے یا بیٹھنے کی گنجائش نہیں تھی۔ شاید فرصت بھی نہیں تھی۔

Scanned with CamScanner

دیر تک یہ گرم ناچ ہوتا رہا اور پھر جیسے سبھی سہم کر تھم گئے، کیونکہ ان کا کوئی افسر آ چکا تھا۔ ٹارچ کی تیز روشنی میں وہ آگے بڑھا۔ عورت کو گھیرے کھڑے ادھ ننگے لوگوں کو اس نے دونوں کہنیوں سے ایک طرف ڈھکیلا، اور ہانپتی ہوئی ننگی عورت کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ دھیرے دھیرے لوگ باہر نکل گئے۔

صبح پھر وہیں اسی جگہ، ٹھیک اسی طرح، اس افسر کے ساتھ کچھ لوگ آئے۔ سادی پوشاک میں، کیمروں اور ٹیپ ریکارڈروں سے لدے پھندے۔ عورت نے ابھی کپڑے نہیں پہنے تھے۔ افسر کے اشارہ کرنے پر دو سپاہی اندر سے ایک چادر جیسی چیز لے آئے، جو اسے اڑھا دی گئی۔ وہ سر جھکا کر بیٹھے فرش پر بیٹھ گئی۔ ایک ساتھ کیمرے کوندنے لگے۔ ایک پر ایک، جلدی جلدی، فوٹو لیے جانے لگے۔ ایک آدمی نے ریکارڈر کو چالو کر دیا۔ افسر بتا رہا تھا کہ جب وہ یہاں پہنچے تو اس نے دیکھا کہ یہ بیہوش عورت باہر سڑک پر پڑی ہوئی تھی۔ دشمن نے اس کا مکان لوٹ لیا اور اس کے ساتھ زیادتی بھی کی ہے۔ ہم اسے اسپتال بھیج رہے ہیں۔

"اندازاً کتنے لوگوں نے زیادتی کی ہوگی؟" کسی نے پوچھا

"کہا نہیں جا سکتا۔ میرا خیال ہے کم سے کم۔۔۔ یعنی بہت سے لوگ رہے ہوں گے۔ مینٹروں بھی رہے ہو سکتے ہیں۔ آپ حالت دیکھیے ان کی۔۔۔"

افسر نے کہا اور آگے بڑھ کر اس نے عورت کی جانگھوں پر سے چادر ہٹا دی۔ لالچی، وحشی نظروں سے سمیت آگے بڑھی اور پھر جیسے خوفزدہ ہو کر پیچھے ہٹ گئی۔ چادر دوبارہ وہیں لوٹا دی گئی۔

اس کے بعد عورت کا بیان ریکارڈ کیا جانے لگا۔ صحافیوں میں سے کسی نے پوچھا، "آپ کا نام؟"

عورت نے آہستہ سے نام بتایا۔ سن کوئی بھی نہیں سکا، لیکن دوبارہ نہیں ہی پوچھا گیا کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ جو بولا گیا ہے وہ ریکارڈ ہو چکا ہوگا۔

بیان ریکارڈ کر لیا گیا اور لوگ بھی رخصت ہو گئے۔ پھر اس بھیانک ویرانی میں وہی دو ننگ رہے۔

بہت سی خاموشی کے بعد کونے میں سمٹے شوہر نے آہستہ سے پوچھا: ''کیا تمھیں بہت تکلیف ہو رہی ہے؟ بہت درد ہے؟''

عورت بغیر منہ بولے رہی۔ چند لمحوں بعد بولی: ''اس میں میرا کیا بگڑتا تھا کہ میں ایسا ظاہر کرتی گویا مجھے سخت چوٹیں آئی ہوں!''

دونوں پھر چپ ہو گئے۔ ایک وقفے کے بعد بیوی نے کہا: ''تمھاری خواہش تھی کہ ہم لوگ بیچ تہ خانے میں لیٹیں، اچھا ہوتا نا؟''

''نہیں!''

''کیوں؟''

شوہر نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بیوی اٹھ کر اس کے قریب آئی۔ پاس کھڑے ہو کر اس نے اپنی چادر اتار دی۔ شوہر نے اس کی طرف دیکھ کر آنکھیں جھکا لیں۔

''چلو... اٹھو...''

شوہر نیچے جھکائے خاموش بیٹھا رہا۔ بیوی گھٹنوں کے بل اس کے سامنے بیٹھ گئی۔ شوہر کے چہرے کو اس نے اپنی ہتھیلیوں میں بڑی آہستگی کے ساتھ تھام کر اوپر اٹھایا۔ کافی دیر کے بعد ہی شوہر کی آنکھیں اٹھیں۔ ٹھیک اسی وقت پوری قوت کے ساتھ بیوی نے اس کے چہرے پر تھوک دیا۔ ڈھیر سا تھوک ٹھیک ناک کے بیچوں بیچ چپک گیا۔

لیکن بس اس سے زیادہ کچھ بھی نہیں ہوا۔ شوہر نے اپنا سر اور نیچے جھکا لیا۔ بیوی اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ عجیب نگاہوں سے اس نے باہر کی طرف دیکھا، گویا تیسری مرتبہ دھماکے شروع ہونے کا انتظار ہو!

مدرا راکھشس

ہندی سے ترجمہ: شہاب الدین گیلانی

ماتم پرسی

ٹیکسی ڈرائیور ٹیکسیاں اس قدر احتیاط سے کیوں چلاتے ہیں؟ ٹیکسی... لڑکیوں کی اتاؤں کی طرح انھیں بھی یہ خطرہ رہتا ہے کہ کوئی ٹرک انھیں روند نہ دے یا چوراہے پر الٹ نہ جائیں۔ اتنی دیر سے دوڑ رہی ٹیکسی نے یک بھی جھٹکا ایسا نہیں کھایا کہ یہ لڑکی میرے اوپر آ گرے۔

ایک غیر ضروری اکتاہٹ دبانے کے لیے میں ایک بار اپنے گھٹنوں پر نظر ڈالتا ہوں۔ سیٹ سے چپکے ہوئے گھٹنے، پتلون کے کالے تھیلوں میں مری کتیوں کی طرح پڑے، بہت ہی بیہودہ لگتے ہیں۔

ویسے یہ اتفاق ہے کہ میری پتلون کالی ہے اور میں ایک ماتم میں شریک ہونے جا رہا ہوں۔ کالی پتلونوں کی ایک اور خاصیت میرے ذہن میں آ رہی ہے۔ لگاتار تھرتھراتے انجن کے ہلکے جھٹکوں سے وہ، وہ کر مشتعل ہو جاتا ہے۔ ایسی حالت میں کالی سوٹوں کے ساتھ آگے کی طرف ابھرا پتلون کا حصہ دکھتا نہیں۔ لیکن ٹیکسی دس منٹ میں پہنچ جائے گی، اور اگر یہ جوں کا توں رہا تو؟ کسی کی ماتم پرسی کے وقت ابھری ہوئی پتلون کی فلائی سچ مچ بے ہودی لگے گی۔ یکایک مجھے ایک ترکیب سوجھی۔ ٹیکسی رکوائی۔ بائیں طرف فٹ پاتھ پر کچھ کتابیں بچھی ہوئی تھیں — جاسوسی، کوک شاستر اور دوسری جنسی کتابیں، اور مذہبی۔ سب سے موٹی جلد بدقسمتی سے ایک مذہبی کتاب کی تھی۔

اب ٹھیک ہے۔ سامنے جانگھوں کے بیچ کتاب کی جلد رکھ لینے سے بالکل کچھ پتا نہیں چلے گا۔ ٹیکسی پھر چل پڑی۔

ماتم جیسا کچھ لگا نہیں۔ ہاسٹل کے سب سے کنارے والے برآمدے میں کرسیوں کی ریلنگ کی آڑ سے وہ تینوں ہاتھ ابھرے۔ تینوں پہلے ہی آ چکے تھے۔ کونے میں چار پانچ کرسیوں پر تینوں بے حال بیٹھے تھے۔ ساتھ کی لڑکی پر ایک اسٹنٹ بھری نگاہ ڈال کر چودھری نے دوسری کرسی سے اپنی ٹانگیں کھینچ لیں۔ جسے نے ایک اور کرسی سے اخبار اور سگریٹ کی ڈبی ہٹا کر اپنی ٹانگ پر رکھ لی۔

کیا لاش کو دیکھنا ضروری ہے؟ لیکن لاش کا اس سے کیا بنتا بگڑتا ہے۔ میں قسم کھا کر کہہ سکتا ہوں کہ وہ شخص زندہ تھا اور اس وقت بھی اپنے یہاں کسی رسمی کارروائی کی پروا نہیں کرتا تھا۔ شاید پانچ منٹ کے بعد ہی مجھے لگتا ہے کہ ایک کلبلاہٹ آس پاس رینگ رہی ہے، ایک گندی نم چپکتی ہوئی پھسپھسی . . . . . . کی آواز۔ لیکن کوئی چارہ نہیں ہے۔ ہم میں سے شاید ہی کوئی یہ جانتا ہو کہ ماتم پرسی میں آنے کے بعد ہمیں کیا کرنا چاہیے۔ یہاں تک کہ مجھے لگتا ہے کہ میں اپنے ہاتھوں کو بھی اس ڈھنگ سے رکھے ہوئے ہوں جیسے کم سے کم اس وقت نہیں رکھنا چاہیے۔ پر پھر کہاں رکھی جائیں یہ ہتھیلیاں؟ سر پر، کولھوں پر یا پاکٹ میں؟ لگتا ہے، ہتھیلیاں فالتو ہیں — اگر لڑکی ساتھ ہے تب تو یہ ایک دم بیکار ہیں۔

چودھری لڑکی کی طرف ایسے دیکھتا ہے جیسے اسکاٹ لینڈ یارڈ کا کوئی سپاہی گھور رہا ہو۔

لیکن اس گھورنے کا لڑکی پر اثر نہیں ہوا ہوگا، پھر بھی بہت آہستہ سے کان میں جھک کر اس نے باتھ روم پوچھا۔

تھوڑی سی کھوج کے بعد باتھ روم مل گیا۔ جب دروازہ اندر سے بند ہو گیا تو اچانک مجھے وہی دم ساز سے چھٹنے کی محسوس ہوئی۔ سوچ نہیں پایا کہ کھڑا رہوں یا لوٹ جاؤں۔ دروازوں کی جھری سے چٹخنی کی آواز آئی جیسے بہت زیادہ پریشان ہونے پر تھوڑا کھل سے آتی ہے۔ اب شاید کوئی کھاری سی بو بھی جھری سے رِستی نکلے گی۔ یہ اندازہ لگاتے ہی میں کرسیوں کی طرف لوٹ آیا۔

چودھری نے پھر اسی نگاہ سے دیکھا۔ آہستہ سے پوچھا: "کہاں؟"

جواب دینا چاہا۔ لگا نسیم ہم سب میں شاید سب سے زیادہ ماتمی موڈ میں تھا۔ ایسے لوگ جیسے ہوتے ہیں جنہیں موڈ کے لیے کوئی کوشش نہیں کرنی پڑتی۔ اس نے کرسی کے تکیے سے گردن اٹھا کر پوچھا: "یہ لڑکی کون ہے؟"

''عورت!'' چترویدی نے بے دلی کی ترمیم کے بعد چشمہ صاف کرنا شروع کر دیا۔ جواب اور سوال دونوں کی طرف کسی نے دھیان نہیں دیا۔

ہاں، چہرے پر ایک ہنسی ابھرنا چاہتی ہے لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کسی لاش کا کفن ہنسی پر لپٹ گیا ہے۔ برآمدے میں کتنے ہی جوتوں کی آواز سنائی دیتی ہے۔ کئی جوتے، فرش سے رگڑتے ہوئے۔ مرے ہوئے آدمی کے دروازے تک پہنچتے پہنچتے جوتے کچھ خاموش سے ہو جاتے ہیں۔ شاید لوگ ماتم کا خیال کر، چوروں کی طرح چلنا شروع کر دیتے ہیں۔

مجھے معلوم ہے میں اس وقت بے حد کاشس ہو رہا ہوں۔ لیکن کوئی چارہ نہیں ہے۔

''میں سیلف کانشس ہو رہا ہوں نا؟'' کسی سے بھی میں نے اچانک پوچھا۔

''ہاں، بیوقوف لگ رہے ہو۔'' چودھری کی آواز سنائی دیتی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ چودھری مجھ سے زیادہ بیوقوف ہے۔ لیکن وہ عقلمند ہونے میں یقین ہی کب کرتا ہے؟

''مگر اب ہم یہاں سے اٹھ لیں؟'' کوئی بھی یہی بات کہنا چاہتا تھا اس لیے یہ کسی کو معلوم نہ ہوا کہ کس نے کہا، لیکن ہر کسی نے اٹھنے کی بات کی حمایت کی۔ ٹھیک بھی ہے، ماتم میں کتنی دیر بیٹھا جا سکتا ہے؟ اگر ایک گھنٹہ بیٹھنے پر بھی، ماتم پرسی پوری نہیں ہو سکی تو ایک مہینہ بیٹھے رہنے پر بھی کیسے ہوگی؟

جے ناحق بڑبڑانے لگا۔ ''یہ ماتم کی ٹریڈیشن کس احمق نے شروع کر دی۔۔۔''

وہ لوٹ آئی۔ کہنیوں تک بہتے پانی کی دھار ہتھیلیوں سے رگڑ رہی ہے۔ چودھری اٹھ کر چپ چاپ اسے اپنا رومال دے دیتا ہے اور سگریٹ سلگاتے ہوئے کہتا ہے: ''چلیں؟''

سوال کے جواب میں لوگ چلنا شروع کر دیتے ہیں۔ جے کا فلیٹ خاصا خوبصورت ہے۔ بیویوں کے نہ رہنے پر بڑے فلیٹ میں یہ آسانی پیدا ہو جاتی ہے کہ۔۔۔

چودھری نے بوسیدہ سے سوٹ کیس سے برانڈی کی بوتل نکال لی ہے اور اس طرح گھور رہا ہے گویا اس میں سے الہ دین کا جن نکلنے والا ہو۔

نسیم اور جے کی بے چینی سے لگتا ہے کہ وہ جلدی سے جلدی چاہتے ہیں کہ میں اس لڑکی سے نمٹ لوں۔ ''نمٹوا لو۔'' جے بڑبڑاتا ہے۔

''آئی ہیٹ!'' چودھری بوتل کو جھنڈے کی طرح اونچا اٹھا کر چلاتا ہے۔ ''مجھے لڑکی کے

معاملے میں وقت کی پابندی سے نفرت ہے۔"

اتنی دور سے بولے گئے الفاظ نسیم کے شیشے جیسے کانوں سے ٹکراتے ہیں ورنہ وہ پہلو بدلتا ہے۔ ہم سب اتنے احمق کیوں ہیں؟ لیکن یہ سوال بھی غلط ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس سے زیادہ احمق کیوں نہیں ہو سکتے؟

"ہنہہ" چودھری دوسرے کمرے میں نظر ڈالتا ہے اور ڈک ڈک کرتے شربت پیتا ہے۔ لڑکی اپنے اتارے ہوئے کپڑے بڑی احتیاط سے تہہ کرتے اسٹول پر رکھ رہی ہے۔ جلتی ہوئی نرس کے چتے پٹھوں پر سفید روشنی چمک رہی ہے۔ کولہے پر چمکتی روشنی لگتی ہے جیسے کسی اجگر کی سوجی ہوئی آنکھیں چمک رہی ہوں۔

چودھری اتنا شور کیوں کرتا ہے؟

"ماچس، میری ماچس..." وہ ہر ایک کی جیبیں ٹٹول رہا ہے، گو کہ یہ صحیح ہے کہ نہ صرف ہنی ملک جی کی ماچس بھی اس نے اپنی ہی پاکٹ میں رکھی ہوئی ہے۔

لیکن اسے چپ کرنے کا کوئی طریقہ نہیں۔ بہتر ہے کہ دروازے بند کر لیے جائیں۔ بہتر ہے۔ دروازہ بند کرنے کے بعد غور سے پھر دیکھتا ہوں جیسے کسی نے اجگر کی ان آنکھوں کو چاٹ لیا ہو۔ یا گدھ کھا گیا ہو ورنہ اجگر الٹا پڑا ہو۔

لڑکیاں سامنے سے اتنی بدصورت کیوں ہوتی ہیں؟ پسلیوں پر گوشت کے اگ آئے لوتھڑے اور کالی گھنڈیاں، جیسے کسی پنساری کی دکان میں سپاری، تمباکو کی تھیلیاں پڑی ہوں۔ پیٹ کے بیچ چھید تو کس قدر بے ہودہ ہے گویا کسی نے عورت کو پہلے بجرا بنایا ہو اور پھر کچھ سوچ کر تھوڑا نیچے ایک اور سوراخ کر دیا ہو۔ مجھے آفرینش سے بے حد ناپسند ہیں۔ ناف کا بے معنی سوراخ بننے کے بعد ردوبدل اور ترمیم کیوں؟ ترمیم ہمیشہ بزدلی کی نشانی ہوتی ہے۔ لیکن اس سب سے زیادہ بڑی بے ہودگی ہے ترمیم کی شکل۔ جانگھوں کے بیچ کی جگہ کا اس قدر گندا ہونا کیوں ضروری تھا؟ صرف سوراخ سے کام کیوں نہیں چل سکتا تھا؟ سوراخ پر ہونٹ، ہونٹوں پر بال لگتا ہے جیسے جانگھ کے اوپر کسی نے بھیڑ کا پچھلا حصہ چپکا دیا ہو۔ میلا، بھونڈا اور...

اجگر کی وہ آنکھیں کہاں گئیں؟ عورت ان آنکھوں کو پیچھے کیوں رکھتی ہے؟ پیچھے...

Scanned with CamScanner

مجھے ریڑھ میں ایک جھرجھری ہوتی ہے۔ اماری کے پاس۔۔۔ جھٹکے سے دروازہ کھول کر میں نے پوچھا: "فلٹ ہے؟"

"فلٹ!" چودھری نے بے تحاشا ٹھٹھے لگانے شروع کر دیے۔

ہنستے ہوئے جج نے بتایا کہ لاکر کے اوپر پچکاری رکھی ہے۔ دروازہ جھٹکے سے بند کر کے میں لاکر کی طرف تیزی سے بڑھا۔ لاکر پر فلٹ کی بھری ہوئی پچکاری رکھی مل گئی۔

لڑکی نے عجیب نگاہوں سے مجھے دیکھا اور تولیہ جانگھ پر ڈھک لیا۔ لیکن اس کی گھبراہٹ پر مجھے ہنسی نہیں آئی۔ زیادہ موقع نہیں تھا۔ پچکاری لے کر پلنگ پر چڑھتے نہ چڑھتے پچھلی دیوار پر چپکی دونوں چھپکلیاں دوڑ پڑیں۔ پچکاری نئی اور بڑی تھی۔ فلٹ کے زہریلے جھپکے خاصی دور تک جاتے تھے۔ چھپکلیاں دو پل گیس میں ٹھٹکی رہیں اور پھر بے تحاشا بھاگیں، چھت کی طرف۔ چھت تک بھی پچکاری کا فوارہ آسانی سے پہنچ رہا تھا۔ چھت سے دوبارہ مڑ کر وہ دوسری دیوار کی طرف بھاگیں۔ میرا ہاتھ رکا نہیں۔ لگاتار دھوئیں کے غباروں کی طرح نکلتی زہریلی گیس کمرے میں بھرنے لگی۔ پلنگ سے نیچے اتر کر میں چھپکلیوں کے پیچھے دوڑا۔

لڑکی گیس سے بری طرح کھانسنے لگی۔ فلٹ کا دھواں پہلے پہل تو اچھا لگتا ہے لیکن اس کے بعد پھیپھڑوں کے اندر کھرچن سی ہونے لگتی ہے۔ گلے میں کانٹوں کی پرتیں بچھتی جاتی ہیں۔ لڑکی کھانستی رہی اور میں لگاتار پچکاری چلاتا ہوا چھپکلیوں کا پیچھا کرتا رہا۔

ان میں سے ایک تلملا کر نیچے گری تو میں بے تحاشا ڈر گیا۔ مجھے لگا کہ اس نے جان بوجھ کر میرے اوپر چھلانگ لگائی ہے۔ اگر ایک لمحے کی چوک ہو جاتی تو وہ میری گردن پر آ چپکتی اور اس کی تھرتھراتی دم میری ریڑھ کے اندر گھس جاتی۔

یہ بے حد خطرناک ہوتی ہے۔ مجھے معلوم ہے۔ کنکھجورے جیسے دہشت ناک کیڑے کو زندہ نگل جاتی ہے۔ میں نے بچپن میں سنا تھا کہ اسی ایک چھپکلی کی وجہ سے چھ بھائیوں کی جانیں گئی تھیں۔ کہتے ہیں کہ دودھ پکانے کو رکھ کر وہ کہیں چلے گئے۔ لوٹ کر باری باری سے انھوں نے گرم دودھ پیا۔ ساتویں نے پینا چاہا تو دیکھا کہ دودھ کے گلاس میں ابلی ہوئی سوجی چھپکلی پڑی ہے۔ اسے فوراً الٹی ہو گئی۔ وہ بچ گیا تھا پر باقی چھ اسی رات مر گئے تھے۔

Scanned with CamScanner

موت کے ڈر سے کانپ کر میں پلنگ پر چڑھ گیا۔ لڑکی نے دونوں گھٹنے اوپر کر لیے۔

میں نے دیکھا، چاروں طرف ہر کھڑکی دروازہ بند ہے۔ گری چھپکلی چپ چاپ فرش پر چپکی سے پڑی ہوئی سی لگی جا رہی ہے۔ جانے کی کہاں؟ باہر جا نہیں سکتی۔ ڈر میں کوئی سوراخ نہیں۔ اچانک میں نے لڑکی سے تو پوچھیں کر اس کی انگلی جا آنکھوں میں خوف دیا۔

فرش پر پڑی چھپکلی میں حرکت ہوئی۔ میں نے ماتھے کا پسینہ پونچھ کر ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ ڈریسنگ ٹیبل پر فلیم پوڈر کا ڈبا رکھا تھا۔ احتیاط سے اٹھایا اور دھیرے دھیرے اسے حرکت دیتی چھپکلی کے پاس فرش پر چھڑکنے لگا۔ مجھے معلوم تھا، اس پوڈر کی وجہ سے چھپکلی تیزی سے نہیں بھاگ پائے گی۔

پوڈر چھڑک کر میں نے پچکاری نکالی۔ بھاگ دوڑ کرتے ہوئے ڈبے میں رکھ دیا تھا۔ کبھی ایک جگہ سے چھل بھی گئی تھی۔ چھپکلی ضرور بیہوش ہو گئی نہیں۔ میں لگاتار پچکاری چلاتا رہا۔ وہ زہریلی چھوٹی چھوٹی بوندوں سے نہا کر بھیگ گئی لیکن ہلی نہیں۔ پر مری بھی تو نہیں۔ اس نے دھیرے دھیرے اپنا جبڑا کھولا۔ سرخ ہوتی ہوئی زبان کے کنارے چھپکلی سوئی کی نوک جیسے دانتوں کی قطار رکھی۔

خوف کی ایک سہرن اور مجھے چاٹ گئی۔ لڑکی نے نہ جانے کیوں اچانک خود کو پڑھنا شروع کر دیا۔ میں نے جھپٹ کر اس سے ہڑبڑ چھینے اور ٹیبل کی طرف پھینک دیے۔

عاجزی کے ساتھ اس نے ظاہر کیا کہ وہ اس حالت میں کب تک چھپکلی کو مرتے دیکھتی رہے گی؟ پون گھنٹہ ہو گیا۔

میں حیرت سے اسے گھورتا رہ گیا۔ لیکن چارہ بھی کیا تھا۔ آخر کار میں نے اسے کندھوں سے پکڑ کر بیٹھا دیا۔ بغل میں بیٹھ کر اس کی آنکھوں پر ہاتھ پھیرنے کی کوشش کرنے لگا۔ لیکن جب کمرے میں ایسی چھپکلی پڑی ہو جو مری نہ جا سکی ہو اور کسی بھی پل وہاں سے بھاگ سکتی ہو، تب بھلا لڑکی کے ساتھ کیسے لیٹا جا سکتا ہے؟

میں نے دیکھا، دوبارہ چھپکلی کی کمر میں حرکت ہوئی۔ پیٹ کا حصہ پھولا اور پچکا۔ شاید اس نے سانس لی، گویا وہ زندہ تھی۔ بلکہ ضرور رفتہ رفتہ زہر کا اس پر اثر ہو رہا ہوگا۔ اس کے پھیپھڑوں کے اندر گھٹن ہو رہی ہوگی۔ گلے میں کانٹے بن رہے ہوں گے۔ پر وہ بھاگ سکتی ہے۔ پلنگ کے پاس

رکھے لکڑی کے وزنی لیمپ کو سرکا کر میں اس کے قریب لے گیا۔ اس نے شاید دیر سے آنکھیں گھما کر آلۂ موت کو نزدیک آتے دیکھا لیکن ہلی نہیں۔ لیمپ اٹھا کے اس کے نچلے حصے کی دھار میں نے ٹھیک چھپکلی کی کمر پر رکھ دی۔

چنک... ایک بہت ہلکی، لیکن ڈراؤنی آواز آئی۔ وہ بے تحاشا پھڑپھڑانے لگی۔ میں نے دیکھا کہ اس کے اگلے پنجوں کے پیچھے کے تمام حصے کی کھال لیمپ کے نیچے رہ گئی ہے اور چھلا ہوا گوشت چمک رہا ہے۔ ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔ اب آسانی سے فلٹ ڈالا جا سکتا ہے۔

فلٹ سے دوبارہ نہلا چکنے پر مجھے لگا کہ میں نے کوئی غلطی کی۔ اس پچھلے حصے پر ممکن ہے فلٹ کسی دوا کا کام کرے۔

میں نے دیکھا تھا کہ ایک بار ایک گھوڑے کا سُم ٹوٹ گیا تھا اور ساری سڑک پر گندا خون پھیل گیا تھا۔ لوگ اس کے کٹے پیر پر مٹی کے تیل کی بوتل انڈیل رہے تھے۔ ضرور فلٹ سے اسے فائدہ ہوا ہوگا۔ پر اب ہو بھی کیا سکتا ہے!

کسی لکڑی کی مدد سے چھپکلی مارنا مجھے سخت ناپسند ہے۔ چھڑی ہاتھ میں لیتے ہی مجھے ایسا لگتا ہے جیسے میں مشت زنی کرنے جا رہا ہوں۔ بڑا غیر فطری لگتا ہے۔ پھر بھی لگتا ہے کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے۔

کمرے میں کھوجنے پر کوئی چھڑی جیسی چیز ہاتھ نہ آ سکی۔ ہاں، ایک چیز پر دھیان گیا۔ سوئچ بورڈ سے پلنگ کے ساتھ ایک تار لٹکا ہوا تھا، بجلی کا۔ شاید آئرن کرنے کے لیے۔ پیچھے سے اس کے دونوں تار کھینچ کر میں نے الگ کر لیے۔ پلگ لگا دیا۔ چھپکلی سے تھوڑی دور کھڑے ہو کر میں نے دھیرے دھیرے تار اس کے نزدیک کیا۔ چھپکلی کی چمکتی ہوئی آنکھوں نے سانپ کی زبان جیسے تانبے کے تار دیکھے۔ تار آہستہ سے اس کے ماتھے پر ٹک گیا۔

پھٹ، پھٹ، پھٹ۔ اچانک چھپکلی بری طرح پھڑپھڑائی۔ پھر تار کا لمس۔ پھر وہی تڑپ۔ مجھے پسینہ چھوٹنے لگا۔ کیا وہ مر نہیں سکتی؟ کیا موت کے یہ وسیلے اتنے بے اثر ہیں؟

پھر... پھر کوشل کیوں مر گیا؟ فلٹ نہیں، بجلی کا تار بھی نہیں، کمر پر گرتے لیمپ کے نچلے حصے کا وزن بھی نہیں — کیسے مر سکا ہوگا کوشل، اتنی آسانی سے؟ موت کے وسیلے اتنے بے اثر کیوں ہیں؟

لاچاری میں میں نے تار پھینک دیے۔ ایک عجیب دھماکا ہوا۔ شاید فیوز اڑ گیا۔ ٹھیک بھی ہے۔

Scanned with CamScanner

یہی صحیح ردعمل ہے۔ بے بسی میں اور ہو بھی کیا سکتا ہے؟

ہار مان لینے کے آخری لمحے شاید بالکل گر پڑنے پر میں نے دیکھا، تو وہی انگلی چھپکلی ساکت ہے۔ کیا وہ مر چکی ہے؟ سچ؟

لیمپ ہٹایا جا سکتا ہے کیونکہ اس کی موت ہو چکی ہوگی۔ وہ بھاگ نہیں سکتی۔

دھیرے سے میں نے لیمپ ہٹایا۔ چھپکلی میں کوئی حرکت نہیں ہوئی۔ ایک گہری سانس، نہ جانے کتنی دیر سے پھیپھڑوں میں بندھی ہوئی، باہر آئی۔ کھونٹی سے ایک خالی ڈبہ اتار کر میں نے چھپکلی کی لاش احتیاط سے اس کے سرے پر اٹھائی۔ ڈرتے ہوئے میں اس لڑکی کی طرف بڑھا۔

لیکن تھوڑا نزدیک پہنچ کر میں نے دیکھا کہ اس کی آنکھوں میں ڈر ہے، دہشت... بہت زیادہ دہشت۔

کیا کسی کی آنکھوں میں اپنی تصویر دیکھی جا سکتی ہے؟ شاید، دیکھی جا سکتی ہے۔ میرے اپنے چہرے کی پرچھائیں اس کے چہرے پر اس طرح تیر رہی تھی جیسے تالاب کے پانی پر تیل کی فش تیر رہی ہو۔ پنے جسم کے سارے حصوں کو تشنج پہ چھپکلی ہوئے۔ خوف زدگی پر چھائیں میرے اپنے چہرے کی۔ چپلی سی۔ سیال۔ لجلجی اور کریہہ۔

لڑکی بے تحاشا چیخی اور دروازے کی طرف بھاگی۔ ٹھہرو — انجکری آنکھیں ٹھہرو... ٹھہرو...

لڑکی نے جھڑ جھڑا کر دروازہ کھولا۔ نسیم، وچھ، ویدی اور چودھری اختر رکھڑے ہوئے تھے۔ وہ ٹھیک اسی وقت چھپکلی کی طرح ہی دروازے سے باہر نکلی اور تیزی سے ولی سامنے کھڑے بچے کی بانہوں میں گر گئی۔ چپ چاپ میں اسی طرح ششدر سرے پر چھپکلی کی لاش لیے باہر آیا۔

ہر ایک کے چہرے پر مجھے اپنی وہی چھپکلی نما جیسی چپکی چھپی پر چھائیں تیرتی دکھی۔ دیر تک بھیانک سناٹا چھایا رہا۔

نسیم آگے آکر غور سے چھپکلی دیکھنے لگا۔

"سچ، اس آدمی کو باہر نکال دو ورنہ میں اس کے جبڑے توڑ دوں گا،" چودھری نے کہا، اور غٹ غٹ کر کے باقی شراب پی کر بوتل فرش پر توڑ دی۔

میری پرچھائیں اس طرح سوکھ گئی جیسے بانو پر جیلی فش کے سوکھ جانے پر ایک جھلی بچ جاتی ہے۔ ایک نشان بھی بچ جاتا ہے بانو پر۔

میں دھیرے دھیرے فلیٹ سے باہر آ گیا۔ اندھیرے راستے میں سینکڑوں جیلی فشوں کی طرح بجھے روشنی کے دھبوں کو کچلتا، اپنے چہروں پر ہی چلتا، میں آگے اور آگے بڑھتا گیا۔

⊕ ⊕

مدرا راکھشس

ہندی سے ترجمہ: شہاب الدین گیلانی

نی

صرف ایک سستے سے جاذ پر بھی روبی ضرورت سے زیادہ عشقی ہے جیسے گھوڑی اپنے اوپر بیٹھنے والی مکھیوں کو اڑانے کے لیے اپنے پٹھوں کو حرکت دے رہی ہو۔ بہت بری تنّی ہے۔ گاتی اچھا ہے، خاص طور پر ایک گیت — سورج کے دیس میں ایک ناپو ہے جہاں میں تمہارا انتظار کروں گی...

روبی انتظار نہیں کرتی، یہ سچ ہے، کیونکہ رات کو وہ بے حد تھک جاتی ہے اور گھر لوٹتے ہی سو جاتی ہے۔ بجے ماحول میں رنگ بھرنے کے لیے بیچ بیچ میں اس کا بھائی اٹھ کر اس کے ساتھ ناچتا ہے تاکہ پیچھے اور موڑ سے اٹھنے کا بہانہ پائیں لیکن لوٹ پڑتے ہیں اور دیکھتے ہیں۔ مگر روبی کسی بات کا انتظار اب نہیں کرتی۔ اسی بار میں پہلے وہ اپنے باپ کے ساتھ ناچا کرتی تھی جو گوریا میں چل بسا۔ دو سال سے وہ اپنے بھائی کے ساتھ ناچتی ہے جو آج کل ایک ہندوستانی اسٹول ماڈل کے ساتھ بھاگ نکلنے کے چکر میں رہتا ہے۔ شاید دو مہینے بعد روبی اپنے بیٹے کے ساتھ ناچ کر کام چلانا شروع کر دے گی۔ وہ کسی واقعے کا انتظار نہیں کرتی، یہ سوچ لیتی ہے اور واقعہ اس کی بغل سے گزر جاتا ہے اسی لیے روبی کسی بات کے معنی کبھی نہیں سمجھتی۔ اپنے گانے گیت کی کڑی کے معنی بھی اسے معلوم نہیں رہتے۔ جیسے کوئی نیند میں بڑبڑائے اور تکیہ کھینچ کر چپ ہو جائے، اسی طرح روبی گیت گاتی ہے۔ ہم سب سنتے ہیں — سورج کے دیس میں ایک ناپو ہے...

ڈیزی جاپانی پنکھے کی طرح کا اسکرٹ اور جمپر ڈھیلے والی چھتری کی طرح کا مدن سے گزرتی

ہے اور بدبدا کر میری ٹیبل پر روبی کے گیت کی پیروڈی سنا جاتی ہے — روبی کے کولھے پر ایک بناوٹی گدی ہے...

روبی کی گدی ایک دن ناچتے ناچتے اسکرٹ سے سرک گری تھی۔ روبی جھینپی نہیں۔ اس نے ہال کے کنارے آ کر گدی ٹھیک کرتے ہوئے کہا: "ڈیڈی، اگر تم اپنے بستر پر نقلی لنگ رکھ کر خوش نہیں ہو تو جنت کے نام پر میرے نقلی کولھوں پر ہنسنے سے باز آؤ۔"

روبی کی مدد کار بن کر ہر مسکرانے والے کی مسکراہٹ سمٹ گئی جیسے لیکو پلاسٹ سے چپکائے زخم کے لب پھیل کر کھنچ گئے ہوں۔ یہ سچ ہے کہ لوگ نہیں، لوگوں کے زخم مسکرائے تھے۔

اعجاز نے ادب سے جھک کر سوڈے کی بوتل اٹھائی اور بولا: "آج سب کے گلاس میں اپنے ہاتھ سے سوڈا ملانے کی خواہش ہو رہی ہے۔" میں خوش ہو گیا، ناخوش ہی کیوں ہوتا؟ میں نے اعجاز کو اشارہ کیا۔ وہ میری بیگم کو میری یاد دلائے۔ اعجاز نے بڑی عاجزی سے کہا کہ وہ بک ہو چکی ہے۔ کل اسے ایک پارسی بک کرا گیا تھا دو دنوں کے لیے۔ ابھی آتا ہو گا۔ میری بیگم... کہتے ہیں میری بیگم اس بار کی سب سے اچھی آمدنی رہی ہے۔ وار پیریڈ میں جب سارا کلکتہ خالی ہو گیا تھا، میری بیگم کی وجہ سے ہی یہ بار چلتا رہا۔ میری بیگم اس وقت تیرہ سال کی تھی جب اس نے فوجی میجروں تک سے ناک رگڑوالی۔

اس پارسی کو میں جانتا ہوں۔ الیٹ روڈ پر اس نے ایک ہوٹل کھولا ہوا ہے۔ کل وہ اسی بار کے مالک سے لوک کی باتیں کر رہا تھا، ایسا اعجاز نے مجھے بتایا۔ بار کے مالک ایڈگر نے اسے بتایا کہ ہوٹل بہت خطرناک ہے۔ سنگل فلور چلایا جا سکتا ہے کیونکہ اس میں لڑکیاں گاہک لاتی ہیں اور محض پسنجری حیثیت سے ٹھہرتی ہیں۔ اس میں آسانی یہ ہے۔ ایسے ٹھہرنے والوں سے بل لے لیجیے اور اس پر پینسلڈ لکھ کر رکھتے جائیے۔ انکم ٹیکس سے بچت ہوتی۔ پارسی شروعات کے لیے میری بیگم کو کاٹنا چاہتا ہے۔ وہ دس بجے آئے گا۔ ابھی ساڑھے نو بجے ہیں۔ روبی ناچ رہی ہے۔ کیا ناچتی ہے یہ نہیں کہا جا سکتا کیونکہ بینڈ صرف وسٹرز کا ہے لیکن روبی اور اس کے بھائی کے قدم فوکس ٹروٹ تک پہنچے ہیں اور ان کی رفتار شاید ٹینگو سے بھی زیادہ ٹھہراؤ دار ہے۔ روبی کا ہر ناچ ایک ہلکے پھلکے ایکسوزی ناچ کے ساتھ ہوتا ہے لیکن وہ اتنا ہی بے اثر ہوتا ہے جتنا کسی تھکاوٹ کے لیے گولڈن ایگل کا جھاگ۔

صرف جھاگ...

زندگی بھی جھاگ ہے، صرف جھاگ، جس کے بلبلے دوسرے لمحے میں پھوٹتے ہیں اور چھینٹیں ہم پر پڑتی ہیں۔ جھاگ کے چھینٹے جو تڑاہٹ پیدا کرتے ہیں [illegible] — بھی جھاگ کے اڑتے پھوٹتے بلبلے ہیں جن کی چھینٹوں کا [illegible] بنا دیتا ہے۔

پچھلے کئی دنوں سے جھاگ اڑ رہی ہے ایک بڑی لڑکی۔ [illegible] نے [illegible] کو [illegible] اپنی زندگی کی ایک نئی کہانی سنائی ہے۔ خوبصورتی میں اس کا جواب نہیں۔ نازک [illegible] اور [illegible] بلند۔

مجھے دیکھا، مسکرائی اور اٹھ کر میری ٹیبل پر آ بیٹھی۔ [illegible] آئی ہے۔ وہی [illegible] لڑکی کسی بھی ٹیبل پر [illegible] سکتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ زندگی [illegible] لیکن یہ جھوٹ ہے۔ زندگی [illegible] نہیں ہوتی۔ ایسی جس میں پٹرول کی طرح تیزی ہو اور [illegible] کی طرح [illegible] پیدا کر دینے کا مادہ ہو۔ ایسی کہ [illegible] کر بھی خارش کو ناخن سے کھرچ دینے کا جی چاہتا ہے۔ ایسی جیسے کوئی دیوار پر [illegible] اگ آئے اور [illegible] لگے۔ جیسے ناخن [illegible] اور [illegible] چمکیلی، شوخ اور گرم خون کی بوند چمکنے لگے، ایسی...

وہ [illegible] نرم اور رنگین زندگی، ایک [illegible] جسم میں [illegible] حرارت کی طرح۔ جیسے [illegible] خوب چمکدار، [illegible] وارنش کے رنگوں سے [illegible]۔

اسے دیکھو اور لگتا کہ اب مجھے [illegible] لینا چاہیے، [illegible] عبادت کرنی چاہیے، خدا سے دعا مانگنی چاہیے کہ وہ میری آنکھوں کو اندھا کر دے کہ میں [illegible] میری زبان کاٹ دے کہ میں گناہوں کے درخت کے پھل کا ذائقہ [illegible] میری بانہوں کو [illegible] کی شہتیر سے جکڑ دے کہ میں... لیکن میں صرف [illegible] زندگی، جو جھاگ ہو گئی ہے، اس کے چھینٹے مجھ پر پڑتے ہیں...

اتنی لڑکیوں میں صرف [illegible] ایک ہے جو سب سے زیادہ خوبصورت ہے اور سب سے زیادہ نامقبول۔ پارسی [illegible] بھائی کی گنجی چندیا پر اس نے [illegible] ہال کے بیچ اپنی سگریٹ چھوا دی تھی اور وہ تلملا گیا تھا۔ نوجوان مارواڑی چھوکرے شیام لال ڈابڑی وال نے بھی کچھ دن پہلے اس سے ساتھ

ناچنے کی خوش قسمتی کی درخواست کی تو نی نے تہذیب کے برخلاف اس سے کہا کہ وہ ہم جنس جوڑا بنا کر ناچنا گوارا نہیں کرتی۔

نی نے میز پر آتے ہی کہا: ''میرا نام تمھیں یاد ہے؟''

''نہیں، میں بھول گیا۔'' میں نے ان چاہی شرارت سے کہا۔

''نے ساتی! یاد رہے گا؟''

''خاص اچھا نہیں ہے، پھر بھول جائے گا۔''

''پھر یاد دلا دوں گی۔''

''روزی اور آمدنی پیسوں کے لیے تمھاری یادداشت اتنی تیز ہے؟''

نی نے مسکرا کر جواب دیا: ''کیونکہ زیادہ تر انھی سے واسطہ پڑا کرتا ہے۔''

''کتنے روپے لو گی؟'' میں نے سیدھی چوٹ کرنی چاہی۔

نی نے میری آنکھوں میں جھانکا، مسکرائی، جیسے نہانے سے پہلے جاکھ پر سے پانی کی چھینٹیں مار کر ہمت تول رہی ہو، پھر بولی: ''بہتر ہوگا ایک دور پی لیں۔''

''گھبراؤ نہیں تمھارے پیسے سے شراب خرچ نہیں ہوگی۔''

''بیکار اپنی ایمانداری کا پرانا لوٹ مت دکھاؤ۔ یہ ایمان کی کھی بازی کی دکان پر ملتا ہے۔ چالیس روپے۔'' نی نے چٹکی سے پول کی ننھی سگریٹ ہونٹوں میں دبائی۔ اجازت سے آگے بڑھ کر اپنے لائٹر سے اسے سلگا دیا۔ نی نے ڈھیر سارا دھواں مجھ پر اڑا دیا۔

''چالیس روپے صرف؟ میں نے تو تمھیں اس سے کہیں زیادہ کا سمجھا تھا۔''

''ٹھیک ہے۔ باقی روپیہ میری طرف سے کسی بھکاری کو دے دینا۔''

''میں بھکاری اور تم میں فرق کرنا چاہتا ہوں۔''

''پر اتفاق سے بھکاری کو دان دے کر پن کمانے والے اور رنڈی کے پاس جا کر پاپ کرنے والے میں میں فرق نہیں کرنا چاہتی۔''

''تم مانتی ہو کہ تمھارے پاس آنا پاپ ہے؟ کافی حوصلہ مند بے شرمی ہے۔''

''کیونکہ تمھیں اسے پن کہتے ہوئے بڑی بزدلی بھری شرم محسوس ہوتی ہے!'' نی سگریٹ

Scanned with CamScanner

سکے بے انداز ایسے کش کھینچ رہی تھی۔

"[illegible] کیا تم اسے پسند کی مان لوگی؟" میں نے پوچھا۔

"آپ بھی مان [illegible] تم [illegible] تو ضرور۔"

"میں اس وقت [illegible] میں دلچسپی نہیں لے رہا" میں نے آخری بات کہی۔

[illegible] شاید [illegible] ضرور ہوں" میں عشق و محبت میں دلچسپی نہیں رکھتی۔"

سیدھی بات یہ ہے [illegible] شاید [illegible] بھی نہیں ہوئی تھی۔" مگر میں چالیس روپے [illegible] تمھاری [illegible] دلچسپی ہوتی۔"

[illegible] میرے [illegible] رکھ دی۔ [illegible] پر انگلی سے ایک [illegible]"

"[illegible] قیمت تمھاری چالیس روپے ہی ہے نا؟"

"[illegible] یاد ورزن کی قیمت ہو جاتی ہے؟"

میں نے [illegible] پوچھا [illegible]"

[illegible]

مجھے [illegible] میں نے ایک [illegible]

"تو مذہبی واعظ اچھی نہیں؟"

[illegible] بولی: "[illegible] لاکر اس کا مذاق نہیں اڑایا کرتے۔"

میں نے [illegible] ہو"

[illegible] بولی: "میں صرف سننا چاہتی ہوں کہ تم بھی مجھ سے محبت کرتے ہو۔"

[illegible] بات [illegible] تمھارا ابھی نہیں [illegible] چپ چاپ میری [illegible] ایک [illegible] بازو پر ہتھیلی رگڑی اور مجھے گھورنے لگی۔

Scanned with CamScanner

میں نے اپنی جیت دیکھ کر پھر کہا: "اچھا ہو اب کسی عام سطح پر باتیں کریں۔" سامنے کی ٹیبل پر بیٹھی لڑکیوں سے پیچھے کے پاس ایک چپٹے ہوئے انڈے کے رنگ کا آدمی آیا اور ایک لمحہ گھور کر آگے بڑھ گیا۔

ڈی نے مسکراہٹ سمیٹ کر پوچھا: "مثلاً؟"

"مثلاً روبی کے بارے میں، جارج کے بارے میں، دلچسپ واقعات کے بارے میں..."

"موسم کے بارے میں، ایک دوسرے کے لباس کے بارے میں..."

"کچھ برا نہ ہوگا۔" میں نے کہا۔

ڈی پھر مسکرائی۔ لیکن اس بار اس کی مسکراہٹ ہونٹوں کی نہیں، بدن سے کھسکتے ہوئے کپڑوں کی تھی۔ اس نے میرے کپڑوں کی طرف دیکھا۔ کالی پتلون، کالے جوتے، کالی ٹائی، سفید شرٹ۔ وہ بولی: "تم کہیں بٹلر ہو؟"

کچھ بدلتے ہوئے میں نے کہا: "اوہ، اب یاد آیا... تم اسی ہوٹل میں ویٹر تھیں نا؟"

میرے جواب نے اسے چھوا نہیں، پر وہ ڈھیلی پڑ گئی، تھک گئی، شاید اس لیے بھی کہ جارج تھک گیا تھا اور روبی اپنے جسم پر ہاتھ [illegible] کے بیچ کھڑی ہوئی تھی۔

میں [illegible] ڈی نے ایک بار اپنی گھڑی پر نظر ڈالی اور پھر اچانک اپنا پرس سنبھال کر [illegible] اسے منع کر دیا۔ میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ [illegible] لگا جیسے چونک گئے [illegible] سونگھ گیا ہو۔ اس نے میری ہتھیلی اپنے ہاتھ میں لی [illegible] چاہیے۔"

[illegible] کی ٹیبل پر بیٹھی لڑکی [illegible] اور اپنے ساتھ پی کی شراب کا [illegible] کر [illegible] ساتھ [illegible] جس کی ایک آنکھ پتھر کی اور ٹانگ لکڑی کی تھی، کھڑا ہو گیا۔

میں ڈی کے ساتھ سیڑھیاں اترنے لگا۔

ڈی مجھے گلیوں میں سے [illegible] چلی۔ [illegible] وہ ضرورت سے زیادہ تیز چلتی ہے اور اس وقت خاموش کیوں ہے۔ میں نے پوچھا تو وہ میری طرف بڑی بڑی آنکھوں سے دیکھ کر صرف مسکرا دی۔ چلتے چلتے

وہ رکی اور مجھ سے پوچھا: "جیمز تمہیں کیسی لگتی ہے؟"

میں نے کچھ جواب دینا چاہا پر اسی نے پھر کہا: "میں سچ مچ ایمانداری سے کہتی ہوں، جیمز میں [illegible] کو دیکھتی ہوں تو لگتا ہے میں بہت بے بس ہوں۔ آپ اس [illegible] سے مجھے وحشت ہوتی ہے۔" گلی کے [illegible] سے چہرے پر گیس لیمپ کی سرد روشنی میں [illegible] رنگ کا سایہ [illegible] اور وہ ایک طرف کی گلی میں مڑ گیا۔ ہماری [illegible] سے کترا کر ایک موٹا سا [illegible] ہمیں گھورتا ہوا تیزی سے آگے نکل گیا۔ [illegible] کے سینڈلوں کی کھٹ کھٹ کچھ [illegible] اور پھر نارمل ہو گئی۔ وہ کہتی رہی: "جانتے ہو، کیا پن مجھے [illegible] نہیں، اسی لیے تو میں [illegible] بہت ہوں۔"

میں [illegible] خاموشی تو [illegible]: "وہ بھی اتنی بدتہذیب اور ترش باتیں۔"

[illegible] ہنس پڑی۔ گلی کے دونوں طرف کی اونچی اندھیری دیواروں کی [illegible] اُبھر سے [illegible] ایک [illegible] اس نے ایک [illegible] طرح میرے کندھے پر ہاتھ رکھ [illegible] بولی: "تب مہذب اور میٹھی باتیں کروں، یعنی کہوں، میں تمہیں پیار کرتی ہوں اور تم میری زندگی کا سپنا ہو اور تم... تمہیں نہیں پتہ۔ مجھے یہ سب سن کر لگتا ہے جیسے یہ لفظ نہیں ہیں بلکہ [illegible] اٹھیاں پڑی ہیں۔" [illegible] نے بڑے [illegible] ڈھنگ سے تھوکا، پھر کہنے لگی: "یہ ترش اور بدتہذیبی صاف اور تازی تو ہیں کم سے کم..."

گیس کی سرد روشنی اس کے گالوں پر چمکی، پھر ماتھے پر ہو کر پیچھے سنہرے بالوں کی جھالر تک گئی۔ [illegible] سائے [illegible] لگے۔ بغل کی سی گلی میں ٹیکسی یا [illegible] کار کا دروازہ بند کیا گیا اور انجن اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی۔

اگلے گیس لیمپ کے پاس شاید کسی پان والے کی دکان تھی۔ دکان کی روشنی گلی پر پڑ رہی تھی۔ لیمپ پوسٹ کے سہارے [illegible] شاید کوئی آدمی منہ میں سگریٹ یا بیڑی دبائے ماچس پر ماچس جلاتا جا رہا تھا۔

دکان کے [illegible] پہنچنے پر اس نے منہ کی بیڑی جلانا چھوڑ کر ہمیں گھورا اور پھر [illegible] بیڑی [illegible] لگا [illegible] ہٹ کر [illegible] کی طرف چل دیا۔ دکان کے قریب ایک چبوترے [illegible] تک [illegible] ایک [illegible] شاید دربان [illegible] کے اوپر بیٹھا تھا۔ اس نے مونچھ

سمیت چہرہ اونچا کر کے مجھے گھورا۔ نی نے مڑ کر کہا: "اسے دو روپے دے دو۔"

میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا، روپے گن کر دبائے اور پھر باہر نکال لیے۔ ایک، دو، تین، چار، پانچ۔۔ پھر دوبارہ دو گنے۔۔ نکال کر دربان کو دے دیے۔ اندر بائیں طرف ٹین کے سائبان کا ایک برآمدہ تھا، جس میں چار پانچ بچے مسلمان سوٹ کیس بنانے میں مصروف تھے۔ پچھلی دیوار کی کھونٹی پر صندلی اشیں ٹنگی تھی۔ ایک معمولی سے پارٹیشن کا پچھلا دروازہ کھول کر نی اندر گئی اور پھر باہر جھانک کر مجھے بھی بلایا۔ اندر آ کر مجھے کچن کی جیسی کوئی جگہ لگی۔ نی نے اشارے سے دوسرے دروازے کے اندر بلایا۔ دوسرے کمرے کو پار کرنے ایک آنگن سا آیا اور پھر ایک کمرہ۔ یہ کمرہ صاف ستھرا تھا، اس میں تخت نہیں۔ سنہری کا پلنگ موٹے جوٹ کے گدے پر ہلکا روئی کا گدا اور اوپر ایک سفید چادر، تکیے، تولیہ۔۔۔

نی نے تولیہ کھونٹی پر لٹکایا۔ ایک لمحے کے لیے مجھ سے معافی مانگ کر باہر چلی گئی۔

کیا ہوا تو مجھے لگا جیسے میں قسم سے پڑھ لکھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ بے تکا پن، ایک بے ڈھنگی سی بات سی جیسے مجھے سوجھ گئی۔ تھوڑی دیر بعد ہی نی لوٹی۔ اس کے ہاتھ میں پانی سے بھرا ایک تام چینی کا بڑا سا تسلا تھا۔ تسلے کو پلنگ کے پاس زمین پر رکھ کر وہ میرے نزدیک آئی۔ اب نی مچھلی کی طرح چپٹا خوبصورت فراک نہیں، صرف ایک اسکرٹ اور بریزیئر پہنے تھی۔ کیا اس فراک کے ساتھ نی نے اپنے آپ کو بھی تہہ کر کے کسی ہینگر پر لٹکا دیا تھا؟ سفید دھاری دار داغوں سے بدنما بنے اس کے پیٹ کا وہ بے پردہ حصہ۔۔۔ نہیں نی فراک کی طرح ہینگر پر تہہ کر کے لٹکا دی گئی ہے اور یہ سامنے جو نی نہیں، صرف ایک دو پڑی کھونٹی ہے جسے مکھیوں نے چیٹ کر گندا کر دیا ہے۔

نی مسکرا رہی تھی۔ پر مجھے لگا جیسے کھونٹی ہی اپنی گھنڈی ہلا کر مکھیاں اڑانے کی کوشش کر رہی ہو۔

نی نے کہا، "آپ کپڑے کیوں نہیں اتارتے؟ کیا شرم آتی ہے؟"

بغل کے ہی کسی کمرے سے کوئی ننھا بچہ چیخ چیخ کر رو اٹھا۔ نی چونکی اور پھر بے سکون ہو اٹھی۔ ایک پل [illegible] ٹھہری، اور پھر تیز ہو کر مجھ سے کپڑے اتارنے کو کہا۔ بچہ دوبارہ چیخا، تیسری بار، اور پھر [illegible] سانس گھٹنے [illegible] لمبی لمبی ہچکیوں میں رونے لگا۔ کسی مرد کی مدھم بڑبڑاہٹ سنائی دی اور ایک تیز جھناٹے سے [illegible] کر بچہ خاموش ہو گیا۔ پر وہ خاموش نہیں ہوا تھا۔ پھر بھی خاموشی کے بعد جیسے بڑی دیر

سے کھنچی ہوئی چیخ تھرتھرا کر پھوٹی۔ نی نے مجھ سے معافی مانگی، صرف ایک پل کی۔ اندر چلی گئی۔ میں دوبارہ باقی بچ رہی سب کی اکتاہٹ لپیٹتا اور ادھیڑتا رہا۔

"بچہ چپ ہو... ور تھوڑی دیر کے بعد مرد کی آواز آئی: "بچہ پھر روئے گا، اور میں چاہتا بھی نہیں کہ وہ چپ رہے۔"

"تب کیا چاہتے ہو؟" اس بار نی کی آواز صاف سنائی دی۔

"تم بچے کو رکھو!"

"لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"لیکن میں ہر رات بچے کی تیمارداری نہیں کر سکتا!"

"اور کوئی راستہ بھی تو نہیں۔"

"بالکل غلط بات ہے۔ میں گھر کی ملازمہ نہیں ہوں۔ رات کو کھٹولے پر بچے کی دیکھ بھال کی بجائے کسی پلنگ پر عورت کے ساتھ بتانے کی ضرورت مجھے بھی ہوتی ہے۔"

رات کے سناٹے میں اسٹیج کے پیچھے کے کردار کی آواز مجھے ایسی لگی جیسے کسی بہت بڑی مشین کا کوئی پرزہ باغی ہو کر غلط چلنے لگا ہو۔ شاید نی نے کچھ کہا اور مرد کا جواب سنائی دیا: "نی! تمھارے پیسے سے کر مجھے دوسری عورت کی رات نہیں چاہیے۔ مجھے چاہیے نی، تم میری بیوی ہو نی اور تمھاری رات... نہیں، آج اس آدمی کو لوٹا دو نی، آج کی رات مجھے دے دو، میری نی... بے بی کو اٹھا لو، دیکھو، میں سوپ تیار کروں گا نی..."

"بیوقوف مت بنو، بچے کو اٹھا لو!" نی ذرا تیز ہو کر بولی۔ بچہ اب تک پھر چیخنے لگا۔ نی شاید دروازے تک آئی لیکن شاید دروازہ کھولنے سے پہلے ہی مرد نے اسے کھینچ لیا۔

نی نے دبے لیکن بہت تیز گلے سے کہا، "چھوڑ دو مجھے۔ پاگل مت بنو..."

"نی، میں تمھاری گھر والی نہیں ہوں نی، جاؤ اس آدمی سے کہہ دو، وہ چلا جائے۔ میں تمھارا شوہر ہوں۔ آج رات..."

"ناٹک بند کرو!" نی اس بار بھرپور چیخی۔

"ناٹک!" مجھے لگا، شاید مرد غصے سے کانپ رہا ہے۔ اس نے کہا: "ناٹک بھی ہوگا، میں اس

آدمی کا خون کر دوں گا اور..."

ٹی نے شاید خود کو چھڑانے کی کوشش کی۔ [illegible]

آ [illegible] سے

ساتھ..."

میں اور [illegible]

[illegible] حادثہ ہوتے [illegible] کل شام [illegible]

[illegible] نے ایک [illegible] کی تھی۔

Husbands shall rob their wives and wives shall...

میں [illegible] ایک [illegible]

Husbands shall rape their wives and wives shall...

مدرا راکھشس

ہندی سے ترجمہ: ثریا علوی

خرگوش

گولی چلنے کی آواز اتنی تیز نہیں رہی ہوگی جتنی دھمک دکھ کی انجو نے محسوس کی۔ میجر کھیرا ابھی بندوق کو جوں کا توں ہی لیے کھڑے تھے۔ اس کی پتلی نلی سے دھوئیں کی لکیر پھوٹ رہی تھی۔ دو پل تن سی کھڑی رہنے کے بعد انجو نے اپنی بانہوں میں اچانک تھرتھرا کر زم ہو گئے سفید جسم کو دیکھا۔ جسم سے نیچے بھی اس کی سرمئی ساڑی کی سلوٹوں کے اوپر کمر سے نیچے تک گہرے سرخ خون کی دھار کھنچ گئی تھی۔

انجو کے حرکت کرنے کے بعد میجر کھیرا نے بھی ہاتھوں کو جھٹکے کے ساتھ بندوق سمیت نیچے کیا اور پھونک مار کر اس کی نلی کو صاف کیا۔ پھر بڑی بے باکی کے ساتھ بھاری بھاری قدم رکھتے ہوئے اس کی طرف بڑھ آئے۔ نزدیک آکر انھوں نے رومال سے ایک خالی کرسی کو صاف کیا اور دوسری کرسی پر بندوق ٹکاتے ہوئے آرام سے بیٹھ گئے۔ بڑے ہی اطمینان کی سانس لیتے ہوئے بولے،

"تم شاید ڈر گئی ہوگی۔ گولی تمھیں ہی نہ لگی ہو۔ بٹ آئی ٹیل یو، درخت پر بیٹھی ہوئی چڑیا کی آنکھ کا بھی نشانہ لگا سکتا ہوں۔ بائی دی وے، آج کھانے میں کیا بنا ہے؟"

انجو نے اچانک ایک گہری سانس لی اور ہاتھ میں گولی سے مرے خرگوش کو کسی تھیلے کی طرح یوں لٹکایا جیسے اس چیز سے کبھی اس کا کوئی لگاؤ رہا ہی نہ ہو۔ پھر تیزی سے کچن کی طرف بڑھ گئی۔

عجیب بے رحم خاموشی اور شکست خوردگی کے ساتھ انجو میجر کھیرا کے ساتھ دوپہر کے کھانے کی میز پر بیٹھی۔ کھیرا نے نیپکن اپنے گھٹنوں پر ڈالتے ہوئے کسی ندیدے کی طرح طشت کے سامان کو

سونگھنا شروع کیا۔ "بائی گاڈ، کھانے کی خوشبو کا کمال ہے۔"

"یو ول لائیک ڈ کری۔ اِٹس فار یو۔ تمھارے مارے ہوئے خرگوش کے گوشت سے بنی ہے۔" انجو نے اتنی سردآواز میں کہا کہ کھیر کے ٹخنوں کے رو ئیں کھڑے ہو گئے۔ غیر ارادی طور پر انھوں نے نیچے میز کے پایوں کے آس پاس نگاہ دوڑائی۔ انھیں لگا جیسے انجو کی بات کے ساتھ ہی ساتھ کوئی ویسا ہی سفید خرگوش اچھلتا ہوا ان کے نزدیک سے گزر گیا ہو۔ لیکن اتنی بات سننے کے بعد کیا وہ گوشت یوں ہی چھوڑا جا سکتا تھا؟ میجر کھیر نے اسے اس طرح کھایا جیسے اس سے بدلہ لے رہے ہوں۔ انجو نے اسے چھوا بھی نہیں۔ کھیر نے اس سے کھانے کو پوچھا بھی نہیں۔

کھانا ختم ہونے پر انجو نے بیسن میں ہاتھ دھوتے ہوئے پوچھا۔ "ہاؤ ڈڈ یو لائیک اِٹ؟"

"آں... ؟ کیا؟"

"میرا مطلب ہے، گوشت کیسا لگا؟"

میجر کھیر نے نل میں دھلتے اپنے ہاتھوں سے نگاہ ہٹا کر سیدھے اس کی طرف دیکھا۔ بیسن سے الگ ہوئے اور اس کے سامنے آ کھڑے ہوئے۔ اپنے قد سے بہت اونچے میجر کھیر کی طرف انجو نے بھی دیکھا۔ اچانک کھیر نے اپنے چوڑے پنجوں میں اسے دبوچ لیا، جیسے ان کے مضبوط بازو اس کی دھجیاں اڑا دینا چاہتے ہوں۔ اچانک انھوں نے اس کے ہونٹوں پر اپنے ہونٹ گاڑ دیے۔ انجو نے چہرہ گھمانا چاہا، جسم الگ کرنا چاہا، لیکن پھر وہ بھی اپنی گود میں مارے جانے والے خرگوش کی طرح پرسکون ہو گئی۔ الگ ہو کر میجر کھیر نے اس کی طرف دیکھا نہیں۔ مڑ کر اسٹڈی کی طرف چلے گئے۔

تین دن اور... یا تین بھی کیوں، صرف ڈھائی دن، تیسرا سفر کی تیاری میں بیتے گا۔ پچھلے دن، یا یوں کہا جائے کہ آنے کے بعد پہلی رات اچانک ایسے بیت گئی جیسے ان کے دیکھتے دیکھتے ان کی جیب کٹ گئی ہو۔ اور کیا! نان فیملی ایریا کی اس لمبی پوسٹنگ سے مشکل سے گنے چنے دنوں کے لیے لوٹے میجر کھیر ڈنر کے بعد ذرا دیوان پر ڈھلکے تو بس صبح ہی نیند ٹوٹی، جب انجو نہا رہی تھی۔ ڈب ڈب... جھاگ والے ٹب میں مچھلی کی طرح کروٹیں لیتی انجو۔

"انجو پلیز... ایک منٹ، پلیز... ذرا سا کھولو نا دروازہ۔"

۔۔۔ میجر کھیر دیر تک باتھ روم کے دروازے کے چابی والے سوراخ پر بار بار بیتابی سے آنکھیں گڑاتے ہوئے دبی لیکن بے چین آواز میں پکارتے رہے۔ لیکن دروازہ کھلا تو انجو لمبے چوڑے تاول میں باقاعدہ لپٹی ہوئی باہر آئی۔ میجر کھیر ایک سیکنڈ کے لیے اس کے جسم پر جھپٹتے جھپٹتے رکے، پھر دھیرے سے واش روم کے اندر چلے گئے۔ بہت دیر تک وہ برش کرتے رہے، پھر انھوں نے شیو بنایا اور پھر اس کے بعد سارے کاموں میں ایک لمبا وقت گزرا۔ اخبار پڑھتے وقت پہاڑی ناشتے کے لیے کہنے آیا تو بہت دیر تک انھوں نے دھیان نہیں دیا، حالانکہ یہ سچ ہے کہ اخبار نگاہوں کے سامنے ہوتے ہوئے بھی وہ کچھ بھی پڑھ نہیں رہے تھے۔ پھر اچانک ان کا دماغ ایک جھٹکے کے ساتھ بدلا۔ شاید تبھی یاد آیا کہ صرف ڈھائی دن اور باقی بچے ہیں اور اس بیچ انجو کے ساتھ لیٹنا تو دور، اسے چھوا بھی کم ہی ہے انھوں نے۔ پیروں میں سلیپر پھنساتے ہوئے وہ میز پر آئے۔

ان کے پہنچتے ہی پہاڑی تازہ چائے کی کیتلی رکھ گیا۔ بیٹھنے کے بعد انھوں نے غور کیا کہ ان کے سامنے صاف کپ کی بجائے ایک جھوٹی بڑی پلیٹ اور پی کر خالی کیا گیا کپ بھی ہے۔ یعنی جو ناشتہ کرکے جا چکی ہے۔ ہاتھ کی چھری وہ پکڑتے پکڑتے رک گئے۔ پہاڑی کو آواز دے کر پوچھا تو معلوم ہوا، میم صاحب کورٹ یارڈ میں خرگوشوں کے پاس گئی ہیں۔

جیسے غصہ پیا ہو، چائے نہیں، اس طرح میز ناشتہ تمام کر اٹھے۔ پہلے ادھر جانے لگے، لیکن پھر مڑ گئے۔ آرام کرسی پر بیٹھ گئے۔ صرف ڈھائی دن ہیں۔ خرگوشوں کے پاس انجو شاید ایک آدھ گھنٹہ بتائے؟ ہو سکتا ہے دوپہر میں انجو آئے؟

لیکن ایک آدھ گھنٹہ نہیں پورے دو گھنٹے بیت گئے۔ آہستہ سے اٹھ کر وہ بنگلے کے پیچھے کی طرف گئے۔ چہار دیواری کے قریب لگے اونچے کامنی کے درخت کے نیچے انجو ایک خرگوش کو لیے کھڑی اسے کچھ کھلا رہی تھی۔ ان کی موجودگی انجو نے جانی یا نہیں جانی، پر اس نے ادھر دیکھا نہیں۔ لیکن اسے واقف کرنے کے لیے وہ تھوڑی اونچی آواز میں، کھوکھلے پن سے ہنسے۔

انجو نے پھر بھی ادھر نہیں دیکھا۔ تب انھوں نے کچھ اور اونچی آواز میں وہیں سے کہا ”اے سینٹی مینٹل لیڈی ودآ ٹینڈر بریسٹ!“

انجو نے پھر بھی نہیں سنا۔ لیکن کیا یہ سچ ہو سکتا ہے کہ اس نے نہ سنا ہو؟ اتنے تیز بولے گئے

اتفاقاً ذرا بھی اس کے کان کو نہ چھو سکے ہوں؟

تھوڑا سا انتظار کرنے کے بعد وہ اندر لوٹ آئے۔ لمبے ہولسٹر میں بند ایئر گن نکالی، اسے توڑ کر سوراخ اور ٹریگر کی جانچ کی اور پھر لوڈ کر لیا۔

اے سینٹی مینٹل لیڈی ود ٹینڈر ہیسٹ! انجو نے میجر کھیر کو وہی خرگوش کھلا دیا، وہ پھر چڑھتی جاتی ہے اور ٹینڈر ہیسٹ ان کے اندر اپنے پنجے کھرونچتا ہے۔ لگتا ہے جیسے اسے وہیں پیٹ کی تھیلی کے اندر کوئی ذبح کرنے کے لیے دوڑا رہا ہو۔ میجر کھیر اب اندر ہی اندر گھٹنے لگے۔ آخر کیوں؟ بات ایسی بھی کیا ہوئی ہے؟ کل آنے کے بعد میجر نے صرف کل، وہ بھی بالواسطہ، ماسٹر سے فرصت پا لینے کی درخواست کی تھی۔ یہ ضرور سچ ہے کہ ناچ سکھانے آنے والے ماسٹر کی وجہ سے وہ تھوڑا توازن برقرار نہ رکھ سکے تھے لیکن ظاہر تو کچھ بھی نہ ہونے دیا تھا۔ صرف اتنا چاہا تھا کہ ان تین دنوں میں وہ نہ ہی آتا تو اچھا تھا۔ ویسے وہ تو خود جانتے ہیں کہ ان کے مہینوں باہر رہنے کے دوران انجو کو کچھ نہ کچھ وقت بتانے کے لیے چاہیے ہی۔ یہ بھی انھیں لگا تھا کہ جانے کیسے میرا، انجو کی بڑی بہن، نے بھی ناچ سیکھنا ہی ضروری سمجھا تھا اور اب انجو بھی...

لیکن پھر بھی، آخر ہوا کیا؟ انجو کے اس عجیب رویے کی وجہ؟ ٹہلتے ٹہلتے وہ پھر تھک کر بیٹھے تو اچانک انھیں لگا، شاید وہ جلد بازی سے کام لے رہے ہیں۔ بلا وجہ ہی کچھ نتیجے نکال رہے ہیں۔ نہیں، اتنا بے چین ہونے سے کام نہیں چلے گا۔

"ارے بھئی انجو!" انھوں نے انتہائی نرم لہجے میں آواز دی اور خاموش ہو کر انتظار کرنے لگے۔ لڑکیوں کے بارے میں شاید وہ جلد باز ہوتے ہیں انھوں نے سوچا۔ دشمن اور رائفل کے ٹریگر کے درمیان جتنی فارمیلٹی ہوتی ہے شاید اس سے کچھ کم ہی وہ بیوی کے تئیں نبھا رہے ہیں۔ اور پھر انجو...

میرا کے لیے جو رحم ان کے دل میں امڈتا ہے، اسے وہ انجو کے لیے پیار میں بدل کر کام چلا لینا چاہتے ہیں۔ سچ مچ انجو کی اس بہن کے لیے تب تھوڑا سا رحم آتا ہے ان کے دل میں۔ ممکن ہے اس کے بارے میں بھی جلدی کی ہو میجر نے۔ حالانکہ ممکن نہیں لگتا۔ انجو کو گھر پر ناچ سکھانے آتا ہے ماسٹر، اور میرا خود جاتی تھی سیکھنے۔

حیرت ہے کہ مہینوں کے بعد جب میجر کھیر گھر لوٹتے تھے تب بھی میرا سیکھنے جانا ضروری سمجھتی

تھی۔ لیکن کیوں؟ مہینوں سے بعد لوٹے میجر کھیر کے ساتھ کیا پہلی شام بھی پوری بتائی نہیں جا سکتی؟ یہ سچ ہے کہ شادی کے تھوڑے دن بعد میجر کو لگا جیسے ہر رات کچھ ادھورا رہ جاتا ہے، اور میرا کو بھی لگا کہ کہیں یہ ادھورا پن قسمت ہی نہ بن جائے۔ اور پھر جب جب کھیر چھٹی پر گھر لوٹے، انھیں محسوس ہوا کہ اس ادھورے پن کی کھائی بڑھتی جا رہی ہے۔ ہو سکتا ہے بار بار ایک ہی طرح سے ایک ساتھ، ایک ہی حد تک سوتے رہنے کی وجہ سے جسموں میں نیا پن نہ رہ گیا ہو، اس لیے کچھ چھٹیاں انھوں نے دو، ہوٹلوں، ڈاک بنگلوں میں بھی بتائیں۔ لیکن وہاں وہ ادھورا پن اور بڑھ گیا۔ فوج میں ان کے ایک افسر ساتھی نے ایک بار ان کی فکر کو بانٹتے ہوئے ایک اسپیشلسٹ کی طرح مشورہ دیا کہ ہر عورت تھوڑی سی طاقت کا استعمال چاہتی ہے، تھوڑا سا بیسٹ۔

تھوڑا سا بیسٹ... میجر کھیر کئی روز تک سوچتے رہے کہ وہ کیسے بیسٹ ہو سکتے ہیں۔ چھٹی پر آئے اس بار تو پہلی ہی رات میرا اس طرح چڑ چڑائی جیسے بلی کو کسی کتے نے گھیر لیا ہو۔ اس نے قریب قریب میجر کھیر کا چہرہ نوچ لیا تھا، ہونٹ!

کچھ زیادہ بیسٹ ہو گئے تھے وہ کیا؟ دوسرے، تیسرے اور چوتھے روز کے بعد میجر کھیر بہت اداس ہو گئے، یا پھر پست ہو گئے۔ میرا اب انھیں بغیر بتائے ہی ناچ سیکھنے جانے لگی۔ لوٹتی بھی دیر سے تھی۔ لوٹتی تو تھکاوٹ بھی زیادہ ظاہر کرتی تھی۔ کیا کرتے کھیر؟ جھلاہٹ تو اب انھیں بھی ہو رہی تھی۔ اندر اندر ایک تشدد کا عنصر بھی امنڈ رہا تھا۔ اکتائے اور چڑے میجر کھیر نے ٹھیک آخری شام اس کا پیچھا کیا۔ وہ اب میرا کو ستانا چاہتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ جب میرا کو معلوم ہوگا کہ میجر کھیر ان کی جاسوسی کر رہے ہیں تو وہ شرمندہ ہوگی۔ ہوگی صرف اس لیے کہ اس پر شک کیا گیا۔ آخری شام اس کے باہر جانے کے بعد وہ خود بھی نکلے۔ تھوڑے سے وقفے کے بعد وہ اس ڈانس ماسٹر کے گھر پہنچے۔ معلوم ہوا وہ وہاں نہیں ہیں۔ میرا سچ مچ وہاں نہیں تھی۔ ماسٹر بھی نہیں تھا۔

میجر کھیر لوٹ آئے۔ حد ہے کہ انھوں نے پوچھا تو میرا نے صاف بتا دیا کہ وہ کہاں تھی اور کیوں تھی۔ اس کے بعد...

"تھوڑا سا بیسٹ!" دوست نے کہا تھا۔ نہیں جانتے کہ وہ کچھ زیادہ بیسٹ ہوئے تھے یا نہیں۔ سات روز تک انھوں نے غم منایا تھا، اور آٹھویں روز میرا کی چھوٹی بہن کو ڈھیر سا پیار کرنے

Scanned with CamScanner

کے بعد فوج کی طرف لوٹ گئے تھے۔

میرا کے خط، لگاتار خط۔ نہیں، اس بار بیسٹ کی ضرورت نہیں۔ اگر ہوئی بھی تو وہ ٹینڈر بیسٹ ہو کر ہی کام چلا لیں گے۔ اور پھر بیسٹ ضروری ہی کیوں ہو؟ میرا نے کئی قدآور کتے پالے تھے۔ میرا کی موت کے بعد میجر کھیر نے انھیں ہٹا دیا۔ انجو کے لیے وہ ایک بار ایک جوڑا خرگوش لائے، سفید، ملائم...

اے سینٹ سینڈل لیڈی، وہ ٹینڈر بیسٹ الکھیر نے مرے خرگوش کے گوشت سے حلق تک آئی ابکائی کو دباتے ہوئے دوبارہ اسی نرم لہجے سے آواز دی، "انجو!"

جواب پھر نہیں آیا۔ سپاٹ وردی لاتے ہوئے بے صدا آہستگی سے خود ہی اٹھے۔ چہرے پر ضرورت سے زیادہ چوڑی مسکراہٹ لپیٹے ہوئے انجو کے کمرے میں گئے۔ وہاں وہ نہیں تھی۔ پھر اگلے کمرے میں دیکھا۔ اس کے بعد انھوں نے باری باری سے سارے کمرے دیکھے اور آخر میں نظر دوڑاتے ماتھے پر پسینہ محسوس ہوا۔

ہاؤس کیپر لڑکی سے پوچھا تو معلوم ہوا، میم صاحب تھوڑی دیر پہلے تیار ہو کر کہیں گئیں۔ کہاں؟ اس کا جواب اس کے پاس نہیں تھا۔ لیکن جواب انھیں تو چاہیے ہی۔ جھٹکے کے ساتھ کپڑے پہن کر وہ باہر نکل گئے۔ اس بار ماسٹر کے گھر وہ سیدھے نہیں گئے۔ وہی ایک جگہ پہلے دیکھی ہوئی، انجو کی بتائی ہوئی۔ تھوڑی دیر اس اجاڑ اور جھاڑیوں، چٹانوں سے بھری جگہ بھٹکنے کے بعد ہی میجر کھیر کو پرچھائیاں ملیں۔ انجو کی ایک سینڈل ٹوٹی ہوئی۔ اس کے بعد بہت آہستہ سے آگے بڑھنے پر انھوں نے دو جوڑی ٹخنے زمین پر رگڑتے ہوئے دیکھے۔ اتنے سرخ تلوے انجو کے ہی ہو سکتے ہیں۔ لیکن پہلی مرتبہ میجر کھیر بیسٹ نہیں، صرف ٹینڈر رہ گئے۔ مردانہ پیروں کے انگوٹھے اور انجو کی ایڑیوں سے رگڑتی نرم گھاس کو دیر تک دیکھتے رہے، اور پھر اچانک جب ان میں تھراہٹ کے ساتھ ٹھہراؤ آ گیا تو وہ تیزی سے مڑے اور لوٹ آئے۔ بیچ میں کہیں رکے نہیں۔

لوٹنے کے بعد انھیں لگا، وہ تھکے ہوئے ہیں۔ تھوڑا سا لیٹنے کے بعد وہ سوئے تو شام کا اندھیرا گھر چکا تھا۔ لیکن اندھیرے کے ساتھ ایک عجیب قسم کا آدمی جاگ چکا تھا۔

اگلے روز دوپہر کے کھانے کے بعد میجر کھیر نے انتہائی ہمت کے ساتھ بتایا کہ وہ جانتے ہیں،

Scanned with CamScanner

وہ کل کہاں گئی تھی۔

''پھر کہنے کی کوئی خاص ضرورت؟'' انجو کے اس سرد جواب سے ایک بار ان کی ہمت پھر ٹوٹ گئی لیکن اچانک قہقہہ لگا کر انھوں نے اپنے آپ کو سنبھال لیا۔ ہنستے ہوئے بولے، ''شاید تم مجھے غلط سمجھ رہی ہو۔ میرا مطلب یہ نہیں کہ میں اس سے ناراض ہوں۔''

''پھر؟''

''ارے! یو آر اگین ٹرائنگ ٹو گیٹ اسکوپ' فور گاڈز سیک، میں تو بالکل کچھ اور ہی کہہ رہا تھا۔'' کھیر کے چہرے پر بولتے بولتے ایک سرخی آئی اور وہ خاموش ہو گئے۔ بہت لمبی خاموشی کے بعد وہ آہستہ سے بولے، ''آئی سے، آئی مین، کیوں نہیں تم اسے یہیں بلا لیتی ہو؟ یو، یو کین لو اِن ہیر، جسٹ ہیر!''

''اینڈ یو ول وٹنس دَ پرفارمنس، ہوں؟ یو!'' الفاظ غصے سے پھٹ کر انجو کے ہونٹوں پر ہی رہ گئے۔

لیکن کھیر کا کام جیسے آسان ہو گیا۔ اسی طرح بے اثر انداز میں انھوں نے جواب دیا، ''مان لو کہوں ہاں۔ آئی ڈزائر اٹ، ییٹ پلیز...''

''واٹ پلیز' یہ میں کی مینٹ لو وِدھ ہم وِل یو ڈو واچ، اِس ڈو واٹ'' وہ ہانپنے لگی۔ پھر جیسے اتنا بھی کافی نہیں ہوا۔ اس نے جھٹکے سے ہاتھ سے سامنے رکھی پلیٹ فرش پر پٹک دی اور لپک کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔

میجر کھیر کچھ دیر چپ چاپ بیٹھے رہے۔ پھر آہستہ سے اٹھے۔ کسی مریض کی طرح دھیرے دھیرے چل کر وہ سٹڈی تک پہنچے۔ مکان میں بھیانک سناٹا چھایا رہا۔ تھوڑے وقفے سے یک زوردار دھماکا ہوا۔ درختوں سے پرندے بری طرح پھڑپھڑا کر اڑے لیکن باقی کہیں کوئی ردعمل نہیں ہوا۔ سناٹا جوں کا توں چھایا رہا۔ سٹڈی کے ادھ کھلے دروازے کے اندر تک شام کی پیلی دھوپ سرک آئی۔ پیلی دھوپ میں ایک کالا لال دھبہ چمک اٹھا۔ اس سے تھوڑا سا اور آگے یک ننھی کالی سی چیز پڑی ہوئی تھی۔ شاید وہ پستول تھی۔

مدرارا کھشس

ہندی سے ترجمہ: زیبا علوی

کشتی

ہر شام، بالکل اسی وقت، پچھلی کھڑکی پر تھوڑا لٹک کر کھڑا ہونا جیسے یک میکانکی عمل ہو گیا ہے۔

پیچھے چھوٹے اسٹول پر رکھی چائے ٹھنڈی ہونے میں وقت لگتا ہے۔ کبھی کبھی انھیں وقت کا صحیح اندازہ نہیں ہو پاتا۔ تب وہ ضرورت سے زیادہ ٹھنڈی ہو گئی چائے بھی پی ڈالتے ہیں، بس تھوڑی گنگنی سی۔ ایک برداشت کی تکلیف ہو گئی تھی اور ٹھنڈی یا گرم کوئی بھی چیز ناقابل برداشت ٹیس پیدا کر دیتی تھی، تبھی سے گرم چائے کی عادت چھوٹ گئی۔

کھڑکی سے اس وقت نیچے بہتا ہوا پانی بے آب کولتار کی سڑک سے گزرے پرانے مینگرے جیسے بنتے چلے گئے موبل آئل سا دکھائی دیتا ہے۔ کہیں چوڑا، کہیں پتلا، کہیں بل کھایا، پھٹا ہوا سا۔

پانی کے اس بہاؤ کو انھوں نے پسند کبھی نہیں کیا لیکن اس سے پہچان بنا لی ہے۔ ٹھیک اپنی بیوی کی طرح۔ انھیں نہیں معلوم کہ وہ اسے پیار کرتے ہیں یا نہیں، پر وہ ان کی اپنی ہے۔

کچھ لوگوں کے لیے سمجھوتہ کتنی سطحوں پر ہوتا ہے۔ وہ کبھی ایسے مکان میں نہ رہے جو کسی ندی یا جھیل کے کنارے ہو۔ ان کے افسر اعلیٰ ریور بینک کالونی میں رہتے ہیں۔ جس ندی کے کنارے ان کی کالونی ہے، اسی میں جا کر مل گیا ہے یہ نالہ۔ اسے نالا ہی کہا جاتا ہے کیونکہ یہ اتنا چوڑا اور گہرا ہے کہ بارش میں یک اچھی خاصی ندی میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ لیکن پھر بھی اسے نالا ہی کہا جاتا ہے۔ کیونکہ باقی موسموں میں بہت تیکھی تیزابی بدبو والے پانی کی یک موٹی اور بے ڈھنگی لکیر بنی رہتی ہے، بہت

Scanned with CamScanner

چوڑائی میں بچھی، اوپر ڈوب رہی کالی الدن سے اوپر ستاروں کی پانت (ٹولی) کی طرح ڈوبتی۔

اس بہت چوڑے اور گہرائی سے بہتے نالے کے دونوں کنارے پکی اینٹوں سے بنے ہیں اور کہیں کہیں پر سیڑھیاں اور کہیں تھوڑا بہت... دونوں طرف مکان ہیں۔ دور تک ٹین، کھپریل، پکی چھتیں، اور یہاں تک کہ پلاسٹک کی چادریں بھی ہیں۔

مکان کے پیچھے ایک سپاٹ ٹنکی یا جھروکا ہے اور نیچے کی طرف گندگی نالے میں گرانے والا سوراخ۔ کائی اور مٹی کی ایک لکیر ہو۔ ہر گھر جیسے وہاں بیٹھا ہوا اپنے ہی نا پیٹ صاف کر رہا ہوتا۔ دور تک جہاں تک چلا گیا ہے اور آگے آسمان کو چھوڑ کر اس میں سما گیا ہے۔ بارش کے بادل کہیں رکتے ہیں اور وہیں ٹھہرے ہوئے لگتے ہیں۔ جب ادھر کا دن پر چھا جاتے ہیں تو سیرن (چیخ) سی ہوتی ہے کہ اندھیرے کی اور ستائی کی۔ بادل شام کو جب بھی رنگین ہوتے ہیں تو نالے کے اس پانی کے چھپے ہوئے چہرے پر بھی جھلکتے ہیں۔ تب وہ تیزابی بدبو بھول جاتی ہے۔

یہ سب اتنا بُرا تو نہیں ہے اور اس کا اندازہ ہے کہ ریور بینک کالونی کے ان صاحب کے گھر سے دکھائی دینے والی ندی اس سے زیادہ بہت زیادہ اچھی نہیں دکھتی ہوگی۔ تھوڑا پانی زیادہ، اور بہت چوڑائی میں بہاؤ۔ لیکن بادلوں والی شام کا رنگ وہاں اس سے بہت زیادہ پھیلا ہوا ہوگا۔

ہاں، چھت پر چڑھ جانے کے بعد یہ منظر تھوڑا بدل جاتا ہے۔ آسمان تو ویسا ہی رہتا ہے۔ آس پاس، دور تک چلی گئی بے ترتیب چھتیں بھی ویسی ہی رہتی ہیں۔ پر نیچے کا نالا ایک عجب وحشت سی پیدا کرتا ہے۔ کبھی انھوں نے سندباد کے سفرنامے پڑھتے تھے۔ اس کتاب میں سندباد ایک بار موت کی کھائی کے کنارے جا پہنچتا ہے۔ وہ کھائی کیسی تھی، یہ یاد نہیں۔ لیکن چھت سے نالا کالی ٹھنڈی لگتی ہے، موت کی طرح چپ، اور کسی کی طرح رینگتا ہوا۔

لیکن ریور بینک کالونی کی ندی کون سی کم ڈراونی لگتی ہے۔ پل پر کھڑے ہو تو آنتوں کو کھینچنا شروع کر دیتی ہے۔

پیچھے والی جس کھڑکی سے وہ جھانک رہے تھے، اس پر لٹکا بھورا سا کپڑا انھوں نے باقاعدہ کھینچ دیا۔ وہ کھینچ دینے پر گھر بدل جاتا ہے۔ پورا مکان نالے کے کنارے سے کھسک کر شہر کے بیچ آ بیٹھتا ہے۔

انھوں نے کمرے میں نگاہ دوڑائی۔ کرسیاں وغیرہ تھوڑا پیچھے ہٹانی ہوں گی۔ پیچھے تو خیر نہیں ہٹ پائیں گی۔ جگہ نہیں ہے۔ پر بیچ سے کڑھے ہوئے کیسمنٹ سے ڈھکی میز وغیرہ یک کنارے کرنی ہوگی۔ اتنے بھر سے جگہ نکل آئے گی۔ تھوڑی سی ورزش کے لیے وہ کافی ہوگی۔ زیادہ کسرت کی ضرورت تو نہیں ہوگی۔ بدن میں ابھی مضبوطی بنی ہوئی ہے۔ پٹھوں میں کساؤ ہے۔ پھرتی بھی ہے۔ کشتی کے داؤ پیچ وہ بھولے نہیں ہیں۔ لیکن داؤ پیچ سے زیادہ ضروری ہے سَن شکتی (قوت برداشت) اور حوصلہ۔ وہ دونوں ہیں۔ پھیپھڑوں میں سانس بھرنے کی صلاحیت بڑھانی ہوگی۔ اتنا کافی ہے۔

دیال کو کشتی میں ہرانا مشکل کام نہیں ہے۔ اُن کے بال سفید ہی زیادہ ہیں۔ غور کرنے پر یقین ہوسکتا ہے کہ پہلی منزل کی سیڑھیاں چڑھنے کے بعد وہ ہانپتے ہیں۔ سانس پھولنے لگتی ہے، بھلے ہی اتنی زیادہ نہیں۔ ان کا کمرہ، گر دوسری یا تیسری منزل پر ہوتا تو سانس خاصی ہی پھولتی۔ کشتی میں اگر انھیں صرف تھوڑی دیر روکا بھر جاسکے تو وہ بے دم ہو جائیں گے۔ اتنی سانس پھول جائے گی کہ انھیں گرایا جاسکے۔

لیکن کیا یہ سب سچ ہے؟ کشتی ہوگی؟ ٹائپسٹ کلرک ستیش بہادر اور آفس انچارج دیال کے بیچ کیا اس طرح کی کشتی دفتر میں سارے کارندوں کے سامنے سچ مچ ممکن ہے؟

اُس دن ڈائرکٹر صاحب دفتر کا معاینہ کر رہے تھے۔ ہر کمرے کا، ہر کارندے کا۔ وہ تیسری منزل پر بھی آئے۔ ان کے ساتھ ڈپٹی ڈائرکٹر اور آفس انچارج بھی تھے۔

ستیش بہادر نے کھڑے ہو کر انھیں دھیان سے دیکھا تھا۔ ڈائرکٹر کے ساتھ آئے دیال کچھ عجیب ہی لگ رہے تھے۔ ان کی طاقت بڑھ گئی تھی اور بدن چھوٹا ہو گیا تھا۔ ڈائرکٹر کے ساتھ وہ ایسے تنے رہتے تھے جیسے وہ بڑے افسر کے ساتھ نہیں، کسی ہنٹر کے ساتھ آئے ہوں، لیکن وہ ہنٹر کچھ اتنا وزنی اور بڑا ہے کہ اسے لٹکانا نہیں، ڈھونا پڑ رہا ہو۔

اسی جگہ ستیش بہادر بول پڑے، "سر، یہ ٹائپ رائٹر..."

"ٹائپ رائٹر؟ کیا ٹائپ رائٹر؟" دیال نے تھوڑے تیکھے پن میں ہنٹر ادھر گھمایا۔ ڈائرکٹر صرف مسکرائے ہلکی سی سوالیہ نگاہ کے ساتھ۔

"اس میں سر، دو حروف خراب ہو گئے ہیں۔ اسپیس..."

"میں اس میں کیا کرسکتا ہوں؟ میں پیچ کش سے کرنٹھوں کا کیا؟" اسے ٹھیک تو ہونا چاہیے۔

یوں نہیں ہوا؟" ڈائرکٹر نے بہت ملائمت سے، کسی کو چوٹ نہ لگے پر دھکا محسوس ہو، ویسے کہا۔

"... رہنا چاہیے تھا۔ میں جانتا ہوں، کام نہ کرتا، تو تو ... آپ رپورٹ لیے بیٹھے رہو۔"

"نہیں سر، میں نے تو لکھ کر دیا تھا۔"

"انھوں نے تو لکھ کر دیا تھا۔" ڈائرکٹر تھوڑا مزہ لیتے ہوئے بولے۔ "اب بتائیے؟"

"بالکل جھوٹ ہے۔ میری میز پر کوئی کاغذ نہیں آیا۔" دیال نے کہا اور ستیش بہادر کو گھورنے لگے۔

"دیال صاحب کی میز پر کوئی کاغذ نہیں آیا..." ڈائرکٹر مسکرائے۔ "ذرا اور میں..."

وہ بہت مہذب طریقے سے مسکرائے۔ ستیش بہادر نے پھر ہمت ... میں نے اس کے بعد دو بار ... یہ رپورٹ تو کل ہی دی ہے سر۔"

"وہ بھی ان کی میز پر نہیں ہوگی۔ پھر کہاں گئی دیال صاحب؟"

ڈائرکٹر ... سوچ میں تھیں کا سر ... گئے۔

دیال کے چہرے پر پریشانی رینگنے لگی۔ "جھوٹ مت بولو۔ مجھے جھوٹ سے سخت نفرت ہے۔"

"ظاہر ہے۔ جھوٹ سے نفرت ہونا اخلاقی پاکیزگی کی نشانی ہے..." ڈائرکٹر اس بار بھی انگریزی میں پرانی ہی سنجیدگی سے بولے۔

ستیش بہادر ... زیادہ ہی ... گئے۔ نہیں تو، اگر وہ اپنی بات ثابت نہ کر پائے تو نہیں، ان ... مصیبت کھڑی ہو جائے گی۔ وہ اور زیادہ مضبوط لہجے میں بولے: "میں نے کل آپ ... میں رپورٹ ... آپ نے پڑھا بھی تھا۔ آپ کو یاد ہوگا صاحب ... آپ نے صاحب ... پر ... مچھلی کھائی تھی۔ وہ مونگ پھلیاں ... ٹھک..."

"یہ یاد ہونا ہے؟" دیال نے جلے سے ڈانٹا۔ ڈائرکٹر اسی طرح مسکراتے ہوئے بولے، "یقین ... مچھلی ... حالی آپ نے؟ بادام کا جو بھی کھا سکتے تھے۔ یا پھلوں کی چاٹ بھی تو ... ہے۔ اس سے دماغ کو طاقت ملتی ہے۔ پھلوں میں وٹامن زیادہ ہوتے ہیں۔ آپ پھل نہیں کھاتے ہیں؟ یا ہری سبزی؟"

Scanned with CamScanner

''جی کھاتا ہوں سر۔ مگر میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں۔ یہ کام ہی نہیں کرنا چاہتا۔۔۔''

''ہوں، یہ تو مشکل مسئلہ ہے۔ ستیش بہادر صاحب کام نہیں کرنا چاہتے ورد یال صاحب کی میز پر کوئی کاغذ نہیں رہتا۔''

ڈائرکٹر سوچنے کا ڈرامائی انداز بناتے ہوئے بولے، ''یہ تو مشکل ہے۔ فیصلہ ہو کیسے؟ کیوں صاحب؟''

ڈائرکٹر نے اپنی تعریف کی مٹھی کمرے میں ادب اور مسکراہٹ کے اسٹولوں پر کھڑے باقی لوگوں کی طرف کر دی۔ وہ صرف مسکراتے رہے، بولے کچھ نہیں۔

''ایک راستہ ہے مسٹر دیال۔ آپ بھی کشتی لڑتے تھے نا؟''

''جی ہاں صاحب۔''

دیال کے لیے یہ سب سے دلچسپ بات تھی۔ کشتی میں کب کیا داؤ لگانا چاہیے، اس کی تفصیل دیتے ہوئے وہ اکثر اپنی جانگھ پر ہاتھ مار کر اپنے عالیشان ماضی کی تصویر کھینچتے تھے۔ کبھی کبھی کسی کو آج بھی للکار دیتے تھے۔ ''بڑا گمان ہے جوانی کا؟ آؤ، دو دو ہاتھ ہو جائیں۔۔۔''

ڈائرکٹر اور زیادہ مسکرائے۔ ''آپ مسٹر ستیش بہادر کو اکھاڑے کی سمت باہر پھینک دیجیے۔''

''جی تو کرتا ہے صاحب۔۔۔''

''مگر ستیش صاحب بھی کسرتی لگتے ہیں۔ اٹھا پائیں گے؟''

''ہر جو استاد سے کشتی سیکھی تھی میں نے۔ مجھ سے پہلوانی میں بڑے بڑوں کے چھکے چھوٹ جاتے تھے سر۔''

''تو ہو جائے۔''

''جی؟''

''ہو جائے کشتی!''

''سر، یہ بڑا دلچسپ ہوگا۔۔۔'' کمرے کے باقی لوگوں نے خوشی اور جوش سے کہا۔ دیال صاحب ٹپٹا گئے اور انھوں نے تلخی بھری نگاہیں کمرے کے لوگوں پر ڈالیں، لیکن لوگوں کی دلچسپی پہلے کی طرح بنی رہی۔

Scanned with CamScanner

"تو ہو جائے پھر؟ ابھی ہو؟"

غصے کو دباتے ہوئے دیال ہاں کہتے کہتے رک گئے، پھر بولے، "کیوں صاحب، انھیں چھٹی دلوانا چاہتے ہیں۔ چھوڑیے..."

"یہ تو پیچھے ہٹنا ہوا دیال صاحب۔" ڈائرکٹر خاص مزہ لینے لگے۔ معاملہ اتنا دلچسپ تھا کہ ایک بار شروع ہوا تو آگے بڑھتا ہی گیا۔ دیال کی آنکھوں میں غصے کی بجائے بے بسی جھانکنے لگی۔ ہلکی سی ہی سہی، انھیں امید تھی کہ یہ بات مذاق میں ہی ختم ہو جائے گی یا کمرے میں موجود کوئی ان کے بچاؤ کے لیے اس کھیل کو ملتوی کرانے کی کوشش کرے گا۔

لیکن کمرے کے سبھی لوگ اچانک ہی اس معاملے میں افسر انچارج کے خلاف ہو گئے تھے۔ وہ اس کا مزہ لینے پر آمادہ ہو گئے تھے۔ ممکن ہے کہ اس کشتی میں دیال جیتیں لیکن ان سے لڑنے کا موقع ٹائپسٹ ستیش بہادر کو ملنے والا تھا، اتنے سے لگ بھگ سب کا بدلہ چکنے جا رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہاں موجود سبھی لوگوں کو دیال سے ملنے والی تکلیفیں یاد آ گئی تھیں۔

دیال بولے، "دیکھیے سر، میں ان سے لڑ تو سکتا ہوں، میں ان کو اچھی طرح پٹکوں گا، لیکن ذرا مہینے بھر کا ریاض تو کر لینے دیجیے۔ برسوں سے تو یہاں فائلیں نمٹا رہا ہوں۔"

"مہینے بھر کا ریاض واجب ہے۔ تو رہی دیال صاحب! آج تاریخ ہے سات۔ اگلے مہینے کی چھ تاریخ پکی رہی۔ طے؟" ڈائرکٹر نے باقی لوگوں کی طرف دیکھا۔ لوگ بہت خوش تھے۔

دیال نے انھیں پھر گھورا۔ اس بار ان کی آنکھوں میں دہشت بھرا اچرج پن ابھر آیا تھا۔ اگر اردو شاعروں کے مطابق آنکھیں سچ مچ چھری یا تیر کا کام کر سکتی ہوتیں تو دیال دفتر کے بہت سے لوگوں کو اب تک بری طرح زخمی کر چکے ہوتے۔

اس حادثے کے بعد شروع کے دو تین روز لوگوں نے صرف اس دن ہوئے مکالموں کے مزے لیے۔ دیال کی گھبراہٹ کسی سے چھپی نہیں رہی تھی۔ اسے یاد کر کے بھی کئی روز لوگ خوش ہوتے رہے اور پھر سب بھول گئے۔ دفتر میں دیال کا رعب داب پھر پہلے جیسا ہی دکھائی دینے لگا۔ ٹھیک پہلے جیسی ہی خامیاں انھیں ماتحتوں کے کام میں ملنے لگیں۔ کبھی کبھی تو کوئی ماتحت صرف اس لیے بھی ڈانٹ کھانے لگا کہ وہ جملے میں کوما لگانا بھول گیا تھا۔ دیال کو ماتحت کے کام میں جب کوئی

بڑی غلطی نہیں ہوتی تھی اور ڈانٹنے کے لیے انھیں کوما جیسی معمولی چیز کا سہارا لینا پڑتا تھا تو ان کا غصہ خاصا بڑھ جاتا تھا۔ تب وہ سب سے پہلے آج کی تعلیم پر تنقید کرتے تھے۔ اس کے بعد پوری نئی نسل کتنی کندذہن اور کام چور ہے، اس پر بنا رکے بولتے تھے۔ اس کے بعد دیر تک وہ صرف ڈانٹتے رہتے تھے۔ تب دیر تک کارندے کو کھڑا رہنا ہوتا تھا۔ ایسی حالت میں یہ بھی ممکن ہوتا تھا کہ وہ چیخ کر کہیں، ''اب میری کھوپڑی پر کیوں کھڑے ہیں؟''

ظاہر ہے، کارندہ یہ سن کر وہاں سے کھسکنے کی کوشش کرتا تھا۔ تب وہ پہلے سے بھی زیادہ زور سے چیختے تھے: ''اب جا کہاں رہے ہیں، ہیں؟''

لوگ چونکہ اس سب کے عادی ہو چکے تھے اس لیے دھیرے دھیرے انھیں یہ دفتر نارمل لگنے لگا۔

اسی بیچ کشتی والی بات پھر تازی ہو گئی۔ ہوا یہ کہ ڈائرکٹر، جو بہت کم ہی لوگوں کو دکھائی دیتے تھے، یک بارہ پھر دکھ گئے۔ دراصل ادھر دفتر میں دو ایسے واقعات ہو گئے کہ جن کی وجہ سے وہ دکھے۔ ایک تو نیا سال آ گیا تھا اور دوسرے دفتر کا ایک پرجیکٹ بہت زیادہ کامیاب ہو گیا تھا۔ ان دونوں باتوں کے لیے ڈائرکٹر نے دفتر کے سارے کارندوں کو اپنے بڑے سے کمرے میں بلایا تھا۔ مبارکباد دینے اور نیک خواہشات کا تبادلہ کرنے کے بعد انھوں نے دفتر کی چھوٹی موٹی باتیں بھی کیں۔ پھر نظر ستیش بہادر پر ٹک گئی۔ شرارت بھری مسکراہٹ ہونٹوں کے اندر دبا کر گمبھیر آواز میں انھوں نے پوچھا: ''ستیش بہادر جی، آپ کے ٹائپ رائٹر میں آ کی ماترا اب بھی غلط جگہ لگتی ہے؟''

''جی سر، وہ بات یہ ہے کہ ملکیک ٹھیک تو کر گیا تھا مگر اب اس کا ربن ہی نہیں سرکتا،'' ستیش بہادر نے بڑی معصومیت سے کہا۔

''ہوں۔ دیال صاحب۔۔۔'' انھوں نے دیال صاحب کی طرف دیکھا۔ دیال اس پل ہونٹ چبانے لگے تھے۔ ڈائرکٹر نے کہا، ''کتنی غلط بات ہے۔ میں بھی بھلکڑ ہو گیا ہوں۔ ارے بھئی، اس کشتی کی تیاری تو آپ لوگ کر رہے ہیں نا؟ کب ہونی ہے کشتی؟''

''سر، چھ تاریخ کو۔۔۔'' کارندوں کے چہروں پر اچانک ہی رونق آ گئی۔

دیال نے ناراض ہو کر کہا، ''سر، اس آدمی کو میں ابھی بتا دیتا اگر آپ کے سامنے یہ بدتمیزی نہ

Scanned with CamScanner

کی جاتی۔"

"نہیں بھائی،" ڈائریکٹر بولے، "کشتی تو ڈھنگ سے ہی ہوگی۔ اور جو تاریخ کو ہی۔"
انھوں نے کیمرے مین کو تفریح والے کمرے میں گدوں کا انتظام کرنے کا حکم دیا اور دو ریفری بھی مقرر کر دیے۔ کشتی لانے کا کام بھی سونپ دیا گیا۔ یہاں تک کہ دو کارندے آنکھوں دیکھا حال بتانے کے لیے بھی مقرر کر دیے گئے۔ ٹیپ ریکارڈر اور کیمرا لانے کا کام اسٹور کیپر کے ذمے کر دیا گیا۔

اس کے بعد دیر کو لگا، معاملہ سچ مچ گمبھیر ہے۔ وہ خود ستیش بہادر کا ٹائپ رائٹر دیکھنے اس کے کمرے میں آئے۔ اسے غراتی ہوئی آواز میں گھور کر بولے، "اب تو مجھے تم لوگوں کے دماغ کا ٹھیک کرنا پڑے گا۔ اور تم کسی بھرم میں مت رہنا کہ کشتی کا تماشا کر کے معاملہ ختم ہو جائے گا۔ بہت برداشت کر لیا ہے میں نے۔ کام چوری نس نس میں بھری ہے۔ کشتی لڑیں گے! ایسا پٹخوں گا کہ ہڈیاں بٹورے نہیں ملیں گی۔ یہ مت سمجھ لینا کہ میری عمر زیادہ ہے اس لیے جیت جاؤ گے۔"

وہ دیر تک اسی طرح بولتے رہے۔ دراصل اس طرح وہاں آ کر ڈانٹ ڈپٹ کرنے کا ایک خاص مقصد تھا، وہ اس کے جسم کا جائزہ لینا چاہتے تھے۔ ستیش بہادر کی عمر تو ابھی کم تھی ہی، صحت بھی ٹھیک ہی تھی۔ بلکہ بدن میں ایک طرح کی کساوٹ اور مضبوطی تھی کیونکہ وہ کالج میں کھیل کود میں بہت دلچسپی لیتے تھے۔ یہاں تک کہ ان کا خیال تھا کہ اگر ان کے ساتھ نا انصافی نہ کی جاتی اور پڑھائی کے دوران شادی نہ ہو جاتی تو وہ ایک اچھے پیشہ ور کھلاڑی ثابت ہوتے۔

میاں انھیں ڈانٹ کر یا ان کی جسمانی طاقت کا جائزہ لے کر چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد ستیش بہادر مایوس ہو کر بیٹھ گئے۔ انھیں اس بات کا گہرا دکھ ہو رہا تھا کہ بہت مشکل سے ملی اس نوکری کی ساری خوشی اس ٹائپ رائٹر کھا گیا تھا جو ان کے سامنے آنے کے بعد سے آج تک کبھی ٹھیک نہیں ہوا تھا۔ وہ ٹائپ رائٹر نہ صرف بگڑا رہتا تھا بلکہ بدصورت بھی کافی تھا۔ دور سے دیکھنے پر وہ ٹائپ رائٹر کم، ایک بے ڈھب ہتھ کرگھا زیادہ لگتا تھا۔ اس مشین پر کام کرنے میں ان کی عدم دلچسپی کی اور دوسری وجوہات بھی تھیں

پڑھائی کے دوران جیسا کہ ہر نوجوان کے ساتھ ہوتا ہے، وہ خاصے سہانے سپنے دیکھنے کے عادی ہو گئے تھے۔ پڑھائی ختم کرنے کے بعد بھی اپنے کو ایک افسر پاتے تھے، کبھی بہت بڑا پروفیسر،

لیکن پڑھائی ختم کرنے کے بعد اس ٹائپ رائٹر کے پاس بیٹھنے کی سہولت انھیں بہت زیادہ پریشانیاں اٹھانے کے بعد ملی تھی۔ تب تک ان کے بچے بھی ہو گئے تھے۔ سب سے بڑی پریشانی تو انھیں اس دن ہوئی تھی جس دن تبادلے پر وہ اس شہر بھیجے گئے تھے۔ دو مہینے تک تو رہنے لائق انھیں کوئی جگہ ہی نہیں ملی تھی اور تب جا کر کہیں انھیں نالے کے کنارے بنے اس مکان کی اوپری منزل پر دو چھوٹے چھوٹے کمرے ملے تھے۔ شروع کے کچھ دن اس شہر کے گھر میں بہت ہی بھیانک تھے۔ اس نالے سے رات دن ایک تیکھی تیزابی بدبو اٹھتی تھی۔ صبح کے بعد اس میں ایک اور بدبو بھی مل جاتی تھی۔ پر دھیرے دھیرے وہ اس کے عادی ہو گئے۔ خاص طور سے اس لیے کہ جب کبھی اس تیزابی بدبو کو ہٹا کر تازہ ہوا کا جھونکا ادھر سے گزرتا تھا تو بہت زیادہ ہی سہانا لگتا تھا، جیسے کوئی آدمی بہت کڑوی چیز کھاتا رہے، اور پھر اسے کچا آٹا بھی کھلا دیا جائے تو بہت میٹھا لگے۔ انھوں نے اپنی طبیعت کے اس طرح تبدیل ہو جانے کی ایک اچھی سی دلیل بھی کھوج لی تھی۔ وہ اکثر چائے پیتے وقت بیوی سے کہا کرتے تھے کہ اگر بدبو کا وجود نہ ہو تو خوشبو کا مطلب ہی کیا رہ جائے۔ اس نالے میں بجبجاتی ہوئی کیچڑ ہمیشہ بھری ہوتی تھی۔ ستیش بہادر ہمیشہ یاد دلاتے رہتے تھے کہ کنول بھی تو کیچڑ میں رہتا ہے، جو کہ محض ایک کہاوت تھی اور جھوٹ بھی۔ کنول بہت اچھے پانی میں کھلتا ہے اور کیچڑ میں صرف اس کی جڑ رہتی ہے۔ اور وہ کیچڑ بھی اس نالے جیسی گندی نہیں ہوتی۔ سچ تو یہ ہے کہ ستیش بہادر نے کنول دیکھا ہی نہیں تھا۔

تو جناب ودیال کے چلے جانے کے بعد چاہتے ہوئے بھی وہ ہمیشہ کی طرح غمگین ہو گئے۔ تب ان کے سامنے بیٹھنے والے فائلنگ کلرک نے اپنا منھ کھولا، ٹھیک ایسے جیسے وہاں کے کمرے میں آنے اور وہاں سے جانے اور منھ کے بند ہونے اور کھلنے کا کوئی خود کار تعلق ہو۔ اس نے کہا: "کتے سالا، اگر ستیش، تمھیں اس سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ سالے کے بدن میں دم نہیں ہے۔ بوڑھا تو ہو رہا ہے۔ اٹھا کر پٹکنا ذرا دور سے۔"

اس بات پر ڈسپیچ کلرک کا منھ بھی کھل گیا۔ "یہ تو صحیح بات۔ بہت ڈینگ مارتا رہتا تھا۔ اب پتا چلے گا۔ مگر ستیش، تم ذرا ہوشیار رہنا۔ آدمی بہت کمینہ ہے۔ تمھاری رپورٹ بھی خراب کر سکتا ہے۔ سال ختم ہو گیا ہے نا..."

''رپورٹ؟'' فائلنگ کلرک نے فوراً اپنا منھ بند کرلیا، کیونکہ سالانہ رپورٹ تو اس کی بھی لکھی جاتی تھی۔

''کردے رپورٹ خراب، پروا نہیں ہے۔'' ستیش ناراض ہو کر بولے۔ ''اٹھا کر پٹکا نہیں تو میرا نام نہیں۔''

''مگر ابھی تو تمھارا پروبیشن ہے۔ دھیان رکھنا،'' ڈسپیچ کلرک ہمدردی دکھاتے ہوئے بولا۔ ''نہ ہو تو تم ڈائرکٹر صاحب سے بات کرلو۔ وہ چاہیں گے تو دیال کیا، دیال کا باپ بھی کچھ نہیں کر پائے گا۔''

ستیش بہادر امکانات پر غور کرتے ہوئے بیٹھے رہے، دیر تک۔ دھیرے دھیرے انھوں نے پایا کہ ہر قیمت پر اس کشتی کے لیے تیار ہیں۔ جو بھی ہو، کشتی وہ لڑیں گے اور دیال کو پچھاڑیں گے۔

انھوں نے کمرے کے بیچ سے میز ہٹا دی اور باقاعدہ ورزش شروع کردی۔ پچھلی کھڑکی سے آتی بدبو وہ بھول گئے اور تب تک کسرت کرتے رہے جب تک پسینے سے نہا نہیں گئے۔

آخر چہ تاریخ آ گئی۔ اس دن وہ تھوڑا جلدی ہی دفتر پہنچ گئے۔ انھیں یہ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی کہ وہاں قریب قریب ہر کوئی اس واقعے کا جو پہلے کبھی نہیں ہوا تھا، انتظار کر رہا تھا۔ آس پاس کی میزوں کے لوگ ان کے قریب آ کھڑے ہوئے۔ وہ آج ان کی خاصی خاطر داری بھی کر رہے تھے۔ تبھی دیال وہاں آ گئے۔ تعجب ہے کہ اس بار ان میں سے کوئی بھی سٹپٹایا نہیں۔

''کیا ہو رہا ہے یہاں؟'' دیال ہمیشہ جیسے رعب سے بولے۔

''کچھ نہیں سر، آج کشتی ہے نا...''

''بہت نوٹنکی مت کرو۔ کشتی ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کام ہی نہیں ہوگا۔ تم لوگوں کو تو حرام خوری کے لیے کوئی نہ کوئی بہانہ چاہیے۔ یاد رکھو، میں ایک ایک کو ٹھیک کر دوں گا،'' وہ ناراضگی سے لوگوں کو گھورتے ہوئے بولے۔ ''اور یہ بھی یاد رکھنا، سالانہ رپورٹ لکھنے کا بھی وقت آ گیا ہے۔ میں ایک ایک کو ہوشیار کر دینا چاہتا ہوں۔ سمجھے؟''

وہ چلے گئے۔ ستیش بہادر کو لگا، وہ رپورٹ والی بات انھی سے کہی گئی ہے۔

دوپہر کو ٹھیک کشتی شروع ہوگئی۔ ڈائرکٹر ایک کرسی رکھ کر بیٹھ گئے تھے۔ ستیش بہادر نے فیصلہ کرلیا تھا کہ جو بھی ہو، دیال کو پٹخنی اچھی طرح دیں گے۔

دیال بہت گمبھیر تھے۔

آخر سیٹی بجی۔ ہاتھ بڑھانے کی بجائے دیال نے ستیش بہادر کو گھورا۔ ڈائرکٹر نے ہی یاد دلایا کہ انھیں ہاتھ ملانا ہے۔ ہاتھ ملانے کے بعد دیال نے موقع نہیں دیا۔ کسی پیشہ ور پہلوان کی طرح لپٹ پڑے۔ لوگ شور مچا کر ستیش بہادر کو بڑھاوا دینے لگے۔ اس سے دیال کا غصہ اور بڑھ گیا۔ ستیش بہادر تھوڑا چوک جاتے تو نیچے آ چکے ہوتے، پر وہ جلد ہی سنبھل گئے۔ لوگوں کا شور انھوں نے سنا اور جھک کر دیال کو کمر سے اٹھا لیا۔ دیال اچکا گئے۔ انھوں نے چھٹپٹا کر ان کی پیٹھ پر ایک گھونسا مارا۔ ڈائرکٹر نے سیٹی بجائی۔ ''گھونسا نہیں چلے گا۔''

دیال کو اٹھا لینے پر شور اور بڑھا اور لوگ ان کے نیچے گرائے جانے کا انتظار کرنے لگے۔ تبھی لوگوں نے دیکھا، ستیش بہادر کے گھٹنے مڑے، وہ دیال کو اسی طرح اٹھائے ہوئے بیٹھ بھی گئے اور دیکھتے ہی دیکھتے لوٹ گئے۔ دیال نے اُتساہ میں آ کر انھیں رگڑ بھی دیا۔ لوگ غصے میں ستیش بہادر کو گالیاں دینے لگے۔

دیال بے حد خوش ہو گئے تھے۔

ستیش بہادر تیزی سے اٹھ کر بھیڑ میں گم ہو گئے۔ آج جب وہ لوٹے تو ایک تسلی انھیں ضرور تھی، انھوں نے اپنی سالانہ رپورٹ خراب ہونے سے بچا لی تھی۔ بیوی کی چائے کا انتظار کرتے انھوں نے آج پھر پچھلی کھڑکی کھول لی۔ تھوڑی دیر وہ نیچے جھانکتے رہے، پھر پردہ کھینچ دیا۔ نالا کتنا زیادہ گندا ہے، انھوں نے سوچا، اور بدبو بھی کس قدر ناقابلِ برداشت۔

اصغر وجاہت

ہندی سے ترجمہ: رحمٰن مصور

سرگم کولا

جیسے کتوں کے لیے کاتک کا موسم ہوتا ہے، ویسے ہی آرٹ اور کلچر کے لیے جاڑے کا موسم ہوتا ہے دلی میں۔ گوری چمڑی والے سیاح بھرے رہتے ہیں — کھلکھلاتے، اچھلتے، چہکتے، رجھاتے، لبالب — ہمارے کلچر کے سب سے بڑے خریدار اور سچے پارکھی۔ بڑے گھروں کی عورتیں، لپی پتی، کیلنڈر آرٹ — جن سے حقارت کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے — جاڑے کی شامیں کسی آرٹ گیلری اور ناٹک دیکھنے میں گزارنا پسند کرتی ہیں۔ جاڑا آرٹ اور کلچر کا موسم ہے۔

سورج جلدی ہی ڈوب جاتا ہے اور نرم ملائم گرم کپڑوں سے ٹکراتی تازگی دینے والی ہوا آرٹ گیلریوں اور آڈیٹوریموں کے آس پاس مہک جاتی ہے؛ ایسی خوشبو جو نامرد کو مرد بنا دے اور مرد کو نامرد۔ لوگ آرٹ اور کلچر میں ڈوب جاتے ہیں۔ آرٹ اور کلچر ہوٹلوں میں ڈوب جاتے ہیں۔

میورک کانفرنس سنٹر کے گیٹ پر چار سپاہی کھڑے تھے۔ اوبے، اکتائے — ڈنڈے لیے۔ ان کے پیچھے دو انسپکٹر کھڑے تھے، گردن اکڑائے، کیونکہ ان کے سامنے چار سپاہی کھڑے تھے۔ پھر دو سوٹ دھاری تھے۔ سوٹ دھاریوں کے سوٹ ایک سے تھے۔ بنوائے گئے ہوں گے۔ سوٹ دھاری کافی ملتی جلتی شکل کے تھے۔ کافی مشکل سے کھوجے گئے ہوں گے۔

گیٹ کے سامنے بجری پڑا راستہ تھا۔ بجری بھی ڈالی گئی ہوگی۔ پھولوں کے گملے زمین کے اندر گاڑ دیے گئے تھے۔ نہ جاننے والوں کو تعجب ہوتا تھا۔ اُدھر میں پھول اُگ آئے ہیں۔ اوپر کاغذ

کے سفید پھولوں کی چادر سی تانی گئی تھی جو کچھ سال پہلے تک ـــ کاغذ کے پھولوں کی نہیں، اصلی پھولوں کی ـــ پیروں فقیروں کی مزاروں پر تانی جاتی تھی۔ پھر شادی بیاہ میں لگائی جانے لگی۔ دونوں طرف غلاف چڑھے بانس کے کھمبے تھے۔ ان غلاف چڑھے بانسوں پر ٹیوب لائٹیں تنی تھیں۔ اسی راستے سے اندر جانے والے جا رہے تھے۔ داس گپتا کو گیٹ کے بالکل سامنے کھڑے ہوئے پر صرف اتنا ہی دکھائی دے رہا تھا۔ جانے والے دکھائی دے رہے تھے، جو اونچے اونچے جوتوں پر اپنے قد کو اور اونچا دکھانے کی ناکام کوشش میں اس طرح لاپروائی سے ٹہلتے ہوئے اندر جا رہے تھے جیسے پورا اہتمام انھی کے لیے کیا گیا ہو۔ ادھیڑ عمر کی عورتیں تھیں جن کی شکلیں ولایتی کاسمیٹکس نے ڈراؤنی سی بنا دی تھیں۔ لال ساڑی، لال آئی شیڈو؛ نیلی ساڑی، نیلی آئی شیڈو؛ کان کے ساتھ کالا، چولی کے ساتھ پیلا۔ جاپانی ساریوں کے پلو کو لپیٹنے کی کوشش میں اپنے ادھ کھلے سینے دکھاتی؛ کشمیری شالوں کو لٹکنے سے بچاتی یا صرف سامنے دیکھتی... یا جینز اور جیکٹ میں کھٹ کھٹ کھٹ۔ رئیسی کی یہی نشانیاں ہیں، داس گپتا نے من ہی من سوچا۔ گمبھیر، بھیانک روپ سے گمبھیر چہرے، خود اطمینانی سے تمتماتے، فخر سے اٹھتے ہوئے؛ دولت، شہرت، عزت سے مطمئن، ناامیدی سے عاری۔ "سالا کون آدمی اس کنٹری میں اتنا کانفیڈنس ڈیزرو کرتا ہے؟" داس گپتا اپنی ہیرو کرنے والی فلاسفی بڑبڑانے لگے۔ سامنے سے بھیڑ گزرتی رہی۔ ہپ لڑکیاں... عجیب عجیب طرح کے بال... گھسی ہوئی جینز... مرد مار لڑکیاں۔ ان کو سونگھتے ہوئے کتے... کتے ہی کتے... ڈاگی... ڈاگیز... سویٹ ڈاگیز۔

پروگرام شروع ہو گیا۔ بھیم سین جوشی کا گائن شروع ہو چکا تھا، لیکن داس گپتا کا کوئی جگاڑ نہیں لگ پایا تھا ـــ بنا ٹکٹ اندر جانے کا جگاڑ۔

گیٹ، بجری پڑے راستے، سوٹ سے آراستہ استقبال کرنے والوں، پولیس انسپکٹروں اور سپاہیوں سے دور، باہر سڑک پر داہنی طرف ایک گھنے پیڑ کے نیچے عجب سنگھ اپنا پان سگریٹ کا کھوکھا رکھے بیٹھا تھا۔ تعجب کی بات ہے، مگر سچ ہے، کہ اتنے بڑے شہر میں داس گپتا اور عجب سنگھ ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔ داس گپتا گیٹ کے سامنے سے ہٹ کر عجب سنگھ کے کھوکھے کے پاس آ کر کھڑے ہو گئے۔ سردی بڑھ گئی تھی اور عجب سنگھ نے تسلے میں آگ سلگا رکھی تھی۔

"دس بیڑی۔"

"تیس ہو گئیں دادا۔"

"ہاں، تیس ہو گیا۔ ہم کب بولا، تیس نہیں ہوا.. ہم تم کو پیسہ دے گا۔" داس گپتا نے بیڑی لے لی۔ ایک بیڑی تسلے میں جلتی آگ پر سلگائی اور خوب لمبا کش کھینچا۔

"جگاڑ نہیں لگا دادا؟"

"لگے گا، لگے گا۔"

"اب گھر جاؤ۔ گیارہ بجنے کو ہیں۔"

"کیوں شالا گھر جائے؟ ہم کو بھیم سین جوشی کو سننے کا ہے..."

"دو سالے بہاری۔"

استاد بھیم سین جوشی کی آواز کا ایک ٹکڑا ابھر آ گیا۔

"واہ — کنگ سالا، یہ نہیں۔"

داس گپتا کھوکے کے پاس سے ہٹ آئے۔ اب آواز صاف سنائی دے گی... لیکن آواز بند ہو گئی... ایک آئیڈیا آیا پنڈال کے اندر پیچھے سے گھسا جائے۔ بیڑی کے لمبے لمبے کش لگاتے وہ گھوم کر پنڈال کے پیچھے پہنچ گئے۔ اندھیرا تھا۔ وہ ٹٹولتے ہوئے آگے بڑھے۔ ٹارچ کی روشنی۔

"کون ہے بے؟" پولیس کے سپاہی کے علاوہ ایسے کون بولے گا۔

داس گپتا جلدی جلدی پتلون کے بٹن کھولنے لگے۔ "پیشاب کرنا ہے جی پیشاب۔" ٹارچ کی روشنی بجھ گئی۔ داس گپتا کا جی چاہا ان سپاہیوں پر موت دیں۔ سالے یہاں بھی ڈیوٹی بجا رہے ہیں... پیشاب کی دھار سپاہیوں پر پڑی۔ پنڈال پر گری۔ چوہے نکل نکل کر بھاگنے لگے... داس گپتا ہنسنے لگے۔

وہ لوٹ کر پھر کھوکے کے پاس آ گئے۔ پاس ہی میں ایک چھوٹے سے پنڈال کے نیچے کینٹین بنائی گئی تھی۔ دو میزوں کا کاؤنٹر۔ کافی پلانٹ۔ اوپر دو سو واٹ کا بلب۔ ہاٹ ڈاگ، ہیمبرگر، پاپ کارن، کافی کی پیالیاں۔ داس گپتا نے کان پھر اندر سے آنے والی آواز کی طرف لگا دیے۔ سب اندر والوں کے لیے ہے۔ جو سالا میوزک سننے کو باہر کھڑا ہے، چوتیا ہے۔ لاؤڈ اسپیکر بھی سالا نے ایسا لگایا

Scanned with CamScanner

ہے کہ باہر تک آواز نہیں آتا۔ اور اندر جوتے بھرے پڑے ہیں۔ بھیم سین جوشی کو سمجھتے ہیں؟ استاد کی تانیں بجوانے کر سکتے ہیں؟ ان سے اگر یہ کہہ دو کہ استاد جوشی تانوں میں مند سپتک سے مدھیہ اور مدھیہ سپتک سے تار سپتک تک سُروں کا پل سا بنا دیتے ہیں، تو یہ سالے گھبرا کر بھاگ جائیں گے... یہ بات بھیم سین جوشی کو نہیں معلوم ہوگا؟ ہوگا ضرور ہوگا۔ سالے سنگیت سننے آتے ہیں۔ ابھی دس منٹ میں اٹھ کر چلے جائیں گے... ڈکار کر کھائیں گے اور گدھے کی طرح پڑ کر سو جائیں گے۔

''دادا، سردی ہے۔'' عجب سنگھ کی انگلیاں پان لگاتے لگاتے ٹھٹھر رہی تھیں۔

''سردی کیوں نہیں ہوگا۔ دسمبر ہے، دسمبر۔''

''اینٹا لے دو دادا، اینٹا۔'' عجب سنگھ نے داس گپتا کے پیچھے ایک اینٹ رکھ دی اور وہ اس پر بیٹھ گئے۔

جیسے جیسے سناٹا بڑھ رہا تھا، اندر سے آواز کچھ صاف آرہی تھی۔ استاد بڑا خیال شروع کر رہے تھے۔ داس گپتا اینٹ پر سنبھل کر بیٹھ گئے... پگ لاگنے دے... دھی دھی... دھاگے ترکٹ تونا کا تا دھاگے... ترکٹ دھی نا... یہ طبلے پر کون سنگت کر رہا ہے؟ داس گپتا نے اپنے آپ سے پوچھا۔ واہ، کیا جوڑ ہے!

''یہ طبلے پر کون ہے؟'' انھوں نے عجب سنگھ سے پوچھا۔

''کیا معلوم کون ہے دادا۔''

کتنی متانت اور سنجیدگی ہے۔ اندر تک آواز اترتی چلی جاتی ہے... تونا کا تا...

تمھارے پاس کیمپا ہائے؟' تین لڑکیاں تھیں اور چار لڑکے۔ دو لڑکیوں نے جینز پہن رکھی تھیں اور ان کے بال اتنے لمبے تھے کہ کمر تک لٹک رہے تھے۔ تیسری کے بال اتنے چھوٹے تھے کہ کانوں تک سے دور تھے۔ ایک لڑکے نے چمڑے کا کوٹ پہن رکھا تھا اور باقی دوسری جیکٹ پہنے تھے۔ تیسرے نے ایک کالا کمبل لپیٹ رکھا تھا۔ ایک کی پینٹ اتنی تنگ تھی کہ اس کی پتلی پتلی ٹانگیں چپکی ہوئی اور کچھ عجیب سی لگ رہی تھیں۔ لمبے بالوں والی لڑکیوں میں سے ایک لگاتار اپنے بال پیچھے کیے جا رہی تھی، جبکہ اس کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ تیسری لڑکی نے اپنی ناک کی کیل پر ہاتھ پھیرا۔

''تمھارے پاس کیمپ ہائے؟'' لمبی اور پتلی ٹانگوں والے لڑکے نے کینٹین کے بیرے سے

Scanned with CamScanner

پوچھا۔ اس کا ایکسینٹ بالکل انگریزی تھا۔ وہ 'ٹ' 'گوٹ' اور 'گوئی' کے ساتھ ملا کر بول رہا تھا۔ 'اے' کو کچھ زیادہ لمبا کھینچ رہا تھا۔

"نہیں جی، ابھی ختم ہو گیا..."

"اوہ، سلی!" پچھلے بالوں والی لڑکی ہنسی۔

"ہاؤ اسٹوپڈ کیپٹن دے آر"

"وی مسٹ کمپلینٹ۔"

"لیٹس ہیو کافی سویٹیز" لمبی ٹانگوں والے نے ادا سے کہا۔

"بٹ آئی کانٹ ہیو کافی ہیئر" جو لڑکی اپنی ناک کی کیل چھیڑے جا رہی تھی اور شاید ان تینوں میں سب سے زیادہ خوبصورت تھی، بولی۔

"وائے مائی ڈیر؟" لمبی ٹانگوں والا اس کے سامنے کچھ جھک ہو بولا اور یہ بات باقی دو لڑکیوں کو کچھ بری لگی۔

"آئی آلویز ہیو کافی اِن مائی ہاؤس آر اِن اوبرائے"

"فائن، لیٹس گو ٹو اوبرائے دین" لمبی ٹانگوں والا فاتحانہ انداز میں چیخا۔

"سر... سر، کیمپا آ گیا" لیفٹیننٹ کے بیرے نے سامنے اشارہ کیا۔ ایک مزدور اپنے سر پر کیمپا کا کریٹ رکھے چلا آ رہا تھا۔

"او، کیمپا ہیز کم" دوسری دو لڑکیوں نے کورس جیسا گایا۔ مدت سے جسیم سین جوشی ان آوارہ کا نکلوا باہر آ گیا۔

"او کیمپا آآآ... ہیز کم" سب سُر میں گانے لگے، "کے اے ے ے ماپا آآآ... پا کرو ارق سنو... او... پا آآآ... کیمپا آآآ... پار کرو... پا آآآ... آجا... کیمپا آآآ..."

"بٹ ناؤ آئی وانٹ ٹو ہیو کافی اِن اوبرائے" خوبصورت کیل والی لڑکی ٹھنکی۔

"بٹ وی کیم ہیئر ٹو لسن ٹو جسیم سین جوشی۔"

"او، ڈونٹ بی سلی... ہی ول سنگ فار ہول نائٹ... ہیو کافی اِن اوبرائے، دین وی کین کم بیک... اینڈ وی کین ہیو سلیپ اینڈ کم بیک..." لمبی ٹانگوں والا چابیوں کا گچھا ہلاتا آگے بڑھا۔

بھیم سین جوشی کی دردناک آواز باہر تک آنے لگی تھی... خود سے لتجا کی آواز، دکھوں اور کششوں سے بھری پرارتھنا... ارج سنو؟ آ آ... موو ف... موو و ف... کھچاک... کھچاک... کار کے دروازے ایک ساتھ بند ہوئے اور کرررر کرررر کرر... بھرررر بھرررر بھرر...

بارہ بج چکے تھے۔ سڑک پر سناٹا تھا۔ سڑک کے کناروں پر دور دور تک موٹروں کی لائنیں تھیں لوگ باہر نکلنے لگے تھے۔ زیادہ تر ادھیڑ عمر اور گمبھیر چہرے والے — کتائے اور خود میں کھوئے ہوئے... موٹی عورتیں... کمر کا لٹکتا ہوا گوشت... جمائیاں آرہی ہیں۔ سالے، نیند آنے لگی... ٹکٹ برباد کر دیا۔ ارے استاد تو دو بجے کے بعد موڈ میں آئیں گے۔ بس ٹکٹ لیے... منگوا لیا ڈرائیور سے۔ گھنٹے دو گھنٹے بیٹھے۔ پبلک ریلیشن... یہ ٹکٹ ہی نہیں ڈیزرو کرتے... پیسہ ویسٹ کر دیا... استاد کو بھی ویسٹ کر دیا... ایسی رڈی آڈینس! جو لوگ جا رہے ہیں ان کی جگہ خالی... اس میں شاما ہم کو نہیں بیٹھا دیتا۔ بولو، پیشا تو تم کو پورا مل گیا ہے۔ اب کیوں نہیں بیٹھائے گا؟

داس گپتا کو سردی لگنے لگی اور انھوں نے ایئر فورس کے پرانے اوور سائز کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈال دیے۔ عجب تکھ کچھ سوکھی پتیاں اٹھا لایا۔ تسلے کی آگ، ہٹ انمی... یہ سالا نکل رہا ہے 'آرٹ سنٹر' کا ڈائرکٹر۔ پینٹنگ بیچ بیچ کر کوٹھیاں کھڑی کر لیں۔ اب سینیٹری فٹنگ کا کاروبار ڈال رکھا ہے۔ یہی سالے آرٹ کلچر کرتے ہیں، کیونکہ ان کو پبلک ریلیشن کا کام سب سے اچھا آتا ہے۔ پارٹیاں دیتے ہیں۔ ایک ہاتھ سے لگاتے ہیں، دوسرے سے کماتے ہیں۔ اپنی وائف کے نام پر انٹیریئر ڈیکوریشن کا ٹھیکہ لیتا ہے۔ اسٹ سے کام کراتا ہے۔ اسے پکڑا دیتا ہے ہزار دو ہزار... لڑکی سپلائی کرنے سے ووٹ خریدنے تک کے دھندے جانتا ہے... دیکھو میوزک کانفرنس کی آرگنائزر کیسے اس کی کار کا دروازہ کھول رہی ہے... روشٹر میں دیا ہوگا ایک ہزار کا اشتہار۔ جیسے سور گو پر چلتا ہے اور اسے کھا بھی جاتا ہے، وہی یہ آرٹ کلچر کے ساتھ کرتے ہیں۔ فیکٹری نہ ڈالی 'کلا کیندر' کھول لیا... امپورٹڈ کار کا دروازہ مہذب آواز کے ساتھ بند ہو گیا۔ کسم گپتا... سالی نہ مس ہے نہ مسز ہے... داس گپتا سوچنے لگے کیوں نہ اس سے بات کی جائے۔ وہ تیزی سے گیٹ کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اس سے انگریزی ہی میں بات کی جائے۔

"کین یو پلیز..."

اس نے بات پوری نہیں سنی۔ مطلب سمجھ گئی۔ کندھے اچکائے۔

"تو، آئی ایم ساری... وی ہیو اسپینٹ تھرٹی تھاؤزنڈ ٹو ارینج دس..." آگے بڑھتی چلی گئی۔

تھرٹی تھاؤزنڈ، ففٹی تھاؤزنڈ، ون لیک... فائدے، منافعے کے علاوہ یہ کچھ سوچ ہی نہیں سکتی۔ وہ آ کر اینٹ پر بیٹھ گئے۔

"ولز۔"

"میٹھا پان۔"

"بے نمبر ڈال، بے..."

"او، ہاؤ مین یو آر!" عورت نما لڑکی کو کمسن لڑکا اپنا ہیمبرگر نہیں دے رہا تھا۔ عورت نما لڑکی نے اپنا ہاتھ پھر بڑھایا اور کمسن لڑکے نے اپنا ہاتھ پیچھے کر لیا۔ ان کے ساتھ کی دوسری دو لڑکیاں ہنسے جا رہی تھیں۔

"مین!" لڑکی ادا سے بولی۔

مین؟ مین کا مطلب تو نیچ ہوتا ہے، لیکن یہ سالے ایسے بولتے ہیں جیسے سویٹ.. اور سویٹ کا مطلب مین ہو گا۔

کمسن لڑکا اور عورت نما لڑکی ایک ہی ہیمبرگر کھانے لگے۔ ان کے ساتھ والی لڑکیاں ایسے ہنسنے لگیں جیسے وہ دونوں ان کے سامنے مباشرت کر رہے ہوں۔

"ڈو یو انڈرسٹینڈ وٹ چاؤلاز پارٹی؟"

"اوہ نو، آئی وانٹ ٹو گو، بٹ..."

"میرا از گونا کس پارٹنرز۔"

"ہائے بابی!"

"ہائے لٹی!"

"ہائے جان!"

"ہائے کٹی!"

"یہ میرا از گونا کس پارٹنرز... بکاز دے ہیو نا کس لان... لاسٹ ٹائم دیئر پارٹی واز

Scanned with CamScanner

ٹیریفک... ویئر واز نو پچ ٹو بیٹ اینڈ ڈرنک... دی کیم بیک ٹو تھرٹی ان دمورننگ... یو نو واٹ دی ہیڈ ٹو کم بیک سو سون؟ مائی مدر ان لا واز دیئر ان اور ہاؤس... ڈ ڈیو بیٹ ہر؟ سو چارمنگ لیڈی ایٹ دی ایج آف سیونٹی تھری... سو آئی ریکنو، آئی کانٹ ٹیل یو...''

''ڈ ڈیو لائیک دپروگرام؟''

''او ہی از سو ہینڈسم۔''

''ڈ ڈیو نوٹس ڈ رنگ ہی واز ویئرنگ؟''

''او یس، یس... بیوٹی فل۔''

''مسٹ بی ویری ایکس پنسو۔''

''او شیور۔''

''مائی مدرز انکل گاٹ ڈیسم رنگ۔''

''دیٹ از پلیٹنم۔''

''ہے ویٹر ٹو کافی۔''

سننے نہیں دیتے سالے۔ اب اندر سے تھوڑی بہت آواز آ رہی تھی۔ داس گپتا نے بنت خدا کا لی اور انگیٹھی کے پاس کھسک آئے۔

''ہی ہیز جسٹ کم بیک فرام یوروپ۔''

''ہی ہیز اے ہاؤس ان لنڈن۔''

''مسٹ بی ویری رچ۔''

''نیچرلی ہی نیکس ٹین تھاؤزنڈ درانائٹ۔''

''دیں آئی ول کال ہم ٹو سنگ ٹن ور میرج۔'' کم عمر لڑکے نے عورت نمازی کی کمر میں ہاتھ ڈال دیا۔

سالے کے ہاتھ دیکھو! کلائیاں دیکھو! داس گپتا نے سوچا۔ پتے ہوتے پر سالا ایک پیسہ نہیں کما سکتا۔ باپ کی دولت کے بل بوتے پر استاد کو شادی میں گانے کو بلائے گا!

جب سنگھ نے پھر انگیٹھی میں سوکھے پتے ڈال دیے۔ بیڑی پیتا ہوا ایک ڈرائیور آیا اور آ۔

کے پاس بیٹھ گیا۔ اس نے خاکی وردی پہن رکھی تھی۔

"سردی ہے جی، سردی۔" اس نے ہاتھ آگ پر پھیلا دیے۔ کوئی کچھ نہیں بولا۔

"دیکھو جی کب تک چلتا ہے یہ چتیاپا۔ ڈیڑھ سو کلومیٹر گاڑی چلاتے چلاتے ہوا چکی ہو گئی۔ سب سالے کو مجرا سننے کی سوجھی ہے۔ دو بجنے..."

"صبح چھ بجے تک چلے گا۔"

"تب تو پھنس گئے جی۔"

"پراجی، کوئی پاس تو نہیں ہے؟" عجب سنگھ نے ڈرائیور سے پوچھا۔

"پاس؟ اندر جانا ہے؟"

"ہاں جی، اپنے دادا کو جانا ہے،" عجب سنگھ نے داس گپتا کی طرف اشارہ کیا۔

"دیکھو جی، دیکھتے ہیں۔"

ڈرائیور اٹھا اور تیزی سے گیٹ کی طرف بڑھا۔ لمبا تڑنگا۔ ہریانہ کا جاٹ۔ گیٹ پر کھڑے سپاہیوں سے اس نے کچھ کہا اور سپاہی سواگت کرنے والے کو بلا لایا۔

ڈرائیور زور زور سے بول رہا تھا: "پولیس سے آیا ہوں جی۔ ایس پی کرائم برانچ، نارتھ ڈسٹرکٹ کا ڈرائیور ہوں جی۔ ڈی وائی ایس پی کرائم برانچ اور ڈی ایم پی ٹریفک کی فیملی نے پاس منگایا ہے جی۔" وہ روانی سے ایک سانس میں سب بول گیا۔

سوٹ دھاری سواگت کرنے والے نے سوٹ کی جیب سے پاس نکال کر ڈرائیور کی طرف بڑھا دیے۔ وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا آ گیا۔

"سردی ہے جی سردی ہے۔" ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ "یہ لو جی پاس۔"

"یہ تو چار پاس ہیں۔"

"لے لو جی اب نہیں تو کس ان کا اچار ڈالنا ہے!"

داس گپتا نے ایک پاس لے لیا۔ "ہم چار پاس کا کیا کرے گا؟"

ہریانہ کا جاٹ کافی اوب چکا تھا، اس سوال پر کوئی ردعمل ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس نے بچے ہوئے تین پاس تسلے میں جلتی آگ میں ڈال دیے۔ ڈرائیور اور عجب سنگھ نے تسلے پر ٹھنڈے ہاتھ

پھیلا دیے۔ داس گپتا گیٹ کی طرف لپکے۔ اندر سے صاف آواز آرہی تھی... جا آ آ آ گو... استاد الاپ سے لے کر بھیرویں شروع کرنے والے ہیں... جا ۔ آ آ گو... مو... پیا آ آ آ آ رے ے... دھا دھیں دھیں دھا دھا تِن تِن تا... جا آ گو ذ مو وھ... ن... پیا آ آ آ ر ے ے ے ے...

⚙ ⚙

اصغر وجاہت

ہندی سے ترجمہ: [illegible]

اُن کا ڈر

گاڑی کی رفتار ساٹھ کے قریب تھی۔ سیدھے، بالکل سیدھے ہائی وے پر وہ پانی کی طرح بہی جا رہی تھی۔ اس سے پہلے اس طرح اتنا لمبا سفر میں نے نہیں کیا تھا۔ ہاں، انٹر سٹیٹ ہائی وے کے بارے میں سنا ضرور تھا۔

وہ چاروں ہندوستانی تھے یا، جیسا کہ وہ کہتے تھے، حیدرآبادی تھے۔ میری ان سے خاص جان پہچان نہیں، پھر بھی میں ان کے ساتھ ڈیٹرائٹ سے شکاگو جا رہا تھا۔ ہوا یہ کہ علیگڑھ کے میرے دوست انجم نے مجھے فون کر کے بتایا کہ ان کے بھائی شکاگو جا رہے ہیں اور میں چاہوں تو ان کے ساتھ جا سکتا ہوں اور یہ کہ وہ مجھ سے پیسے نہیں لیں گے۔ انجم میرے ساتھ علیگڑھ میں تھے اور ہم دونوں نے ساتھ مل کر اردو کی خدمت کرنے کے کئی پلان بنائے تھے۔ ایک پلان کے تحت تو کئی سو روپے چندہ بھی جمع کیا تھا جو [illegible] ہونے کی وجہ سے انجم کے پاس جمع تھا۔ پھر امتحان ختم ہو گئے۔ انجم حیدرآباد اور وہاں سے امریکہ آ گئے۔ اور اردو بیچاری وہیں علیگڑھ میں رہ گئی۔

یہ لوگ یعنی انجم کے بھائی سرور صاحب اور ان کے دوست، مجھے دیکھنے میں کچھ عجیب لوگ لگے تھے۔ اسد صاحب نے کالی شیروانی اور علیگڑھ کٹ پاجامہ پہن رکھا تھا۔ ان کی داڑھی خاص علیگڑھ کے جماعت اسلامی والوں کی داڑھی کی نقل تھی۔ یہ سب ہندوستان میں میں نے ہمیشہ دیکھا اور بھگتا تھا لیکن یہ توقع نہیں تھی کہ کسی ایسے آدمی سے امریکہ میں بھی ملاقات ہو جائے گی۔ تیسرے

Scanned with CamScanner

صاحب ڈاکٹر طاہر تھے اور چوتھے، موٹے اور کچھ بیوقوف سے لگنے والے صاحب کا نام احمد تھا۔ بعد میں پتا چلا کہ ان میں سے تین لوگ، یعنی مسرور صاحب، اسد اور ڈاکٹر طاہر، کافی پڑھے لکھے ہیں۔ مسرور صاحب نے امریکہ ہی کی کسی یونیورسٹی سے کیمسٹری میں پی ایچ ڈی کی تھی، ڈاکٹر طاہر بھی وہیں یونیورسٹی میں انگریزی کے پروفیسر تھے، اسد صاحب کے پاس انجینیئرنگ کی کوئی بڑی ڈگری تھی۔ ہاں چوتھے صاحب کے بارے میں ٹھیک سے نہیں معلوم، لیکن یہ بھی بی اے پاس ضرور رہے ہوں گے۔ سفر شروع ہوا تو ڈاکٹر طاہر گاڑی چلا رہے تھے۔ ان کو شہر سے نکل کر ٹی نائنٹی فور تلاش کرنے میں کچھ مشکل ہو رہی تھی۔ مسرور صاحب آگے کی سیٹ پر، مشیگن اسٹیٹ کا نقشہ کھولے، شہر سے آئی نائنٹی فور تک پہنچنے کا راستہ بتا رہے تھے۔ ڈاکٹر طاہر نے کسی غلط ایگزٹ پر گاڑی موڑ لی اور کچھ دور جانے کے بعد پتا چلا کہ ہم لوگ ایک دوسرے ہائی وے سے پھر واپس شہر جا رہے ہیں۔

"لیجیے، آ گئے نا غلط ہائی وے پر۔ اب دیکھیے کب ایگزٹ ملتا ہے،" مسرور صاحب بولے۔

"سات آٹھ میل تو چلنا ہی پڑے گا۔ یہ کمبخت بڑی خرابی ہے ہائی ویز کی۔" کچھ دیر کی بھاگ دوڑ کے بعد گاڑی آئی نائنٹی فور پر آ گئی، اب بس سیدھا راستہ تھا، ناک کی سیدھ میں۔

"ہاں، تو میٹنگ کیسی رہی احمد صاحب؟" مسرور صاحب نے نقشہ بند کر دیا۔

"اور تو سب باتیں طے ہو گئیں، لیکن ٹورانٹو کی برانچ سے بات کرنے والی بات رہ گئی،" احمد صاحب نے جواب دیا۔

"خیر، وہ تو ہو ہی جائے گی۔ اب ایگزیکٹو کی میٹنگ تو شکاگو ہی میں ہے نا، اس میں بات کر لیں گے۔ اور بھائی اس سے انکار کون کرے گا۔ اصولاً تو صحیح بات ہے نا!"

"ارے ڈاکٹر صاحب، یہ بات نہ کہیے۔ پچھلی بار یاد ہے نا، دلّی کے آخری مشاعرے والی بات پر لوگ اعتراض کر رہے تھے کہ یہ غیر اسلامی کام ہے،" اسد صاحب بولے۔

میں اس بات پر چونک گیا۔ مجھے اتنا ہی معلوم تھا کہ یہ لوگ کسی میٹنگ میں شرکت کر کے واپس شکاگو جا رہے ہیں۔ اس میٹنگ سے اسلامی اور غیر اسلامی بات کا کیا تعلق؟ خیر، میں نے بولنا ٹھیک نہیں سمجھا۔

"لوگ اتنی آسانی سے اسلامی اور غیر اسلامی لفظوں کا استعمال کر دیتے ہیں جیسے وہی سب کچھ

Scanned with CamScanner

جانتے ہیں،" ڈاکٹر طاہر بولے۔

"آسمانی کتاب ہے صاحب۔ ہم ناچیز بندے اس کے بارے میں کیسے آخری بات کہہ سکتے ہیں؟" احمد نے کہا۔

"احمد صاحب، شکاگو میں پاکستانیوں نے قوالی کروائی تھی۔ پچیس ڈالر کا ٹکٹ تھا اور سب ٹکٹ بک گئے تھے۔ میرے خیال سے ہم فنڈ ریز کرنے کے لیے مشاعرہ کروا سکتے ہیں،" مسرور صاحب نے کہا۔

"مشاعرہ؟" احمد چونکے۔ "پھر وہی سوال اٹھے گا۔ اسلام میں تو مشاعرہ، نوٹنکی، ڈراما یعنی بھیس بدلنا ناجائز ہے۔"

"یہ آپ سے کس نے کہہ دیا کہ مشاعرے میں لوگ بھیس بدلتے ہیں؟" ڈاکٹر طاہر کچھ ناراض سے ہوئے۔

"صاحب، مشاعرہ کون سا اسلامی کام ہے؟" احمد بولے۔

"اس طرح دیکھیں تو اسلامی کام کوئی نہیں ہے۔ صرف گھر میں بیٹھے قرآن نماز پڑھتے رہو۔ یہی سب سے بڑا اسلام ہے۔ پھر ہم لوگ گھر سے ہزاروں میل دور یہاں کیوں نوکری کر رہے ہیں؟ احمد صاحب، اسلام دین کے ساتھ ساتھ دنیا کی بھی تعلیم دیتا ہے۔ آپ احمد صاحب، اسلام کے 'بیسکس' کو ذرا دل لگا کر تشریح سمیت پڑھ ڈالیے۔ لیکن مولانا آزاد کی تشریح نہ پڑھیے،" ڈاکٹر طاہر بولے۔

احمد چپ ہو گئے۔ پھر باتیں قرآن کی تشریحات پر چل پڑیں۔ میں عجیب چکر میں پڑ گیا تھا۔ ان لوگوں کو اس ملک میں ایسے دیکھنے کی کوئی توقع نہیں تھی۔

"مجھے نہیں معلوم آپ کے کیا خیالات ہیں،" اچانک مسرور صاحب نے مجھ سے کہا۔ میں پیچھے بیٹھا تھا۔ بات کرنے کے لیے انھیں اپنی گردن ذرا موڑنی پڑی۔

میں نے جلدی سے کہا، "جی ہاں، جی، میں اسلام میں خاصی دلچسپی لیتا ہوں۔"

انھوں نے سامنے دیکھنا شروع کر دیا۔ میں اپنے جملے پر خود شرمندہ ہوا۔ اپنے آپ کو ایک موٹی سی گالی دی کہ سالے، تم کو بولنا بھی نہ آیا۔ کون سی ترکی بول رہے ہو جو الٹی سیدھی بات منھ سے

Scanned with CamScanner

نکل رہی ہے اسلام میں دلچسپی لینے سے کیا مطلب ہے تمھارا؟ کیا اسلام کوئی تمھارے لیے گھڑ دوڑ، تیراکی یا کیٹ بازی ہے جس میں تم دلچسپی لیتے ہو؟ خیر، اب کیا ہو سکتا ہے۔

"ہم لوگوں نے صاحب، ایک آرگنائزیشن بنائی ہے جس کا نام ہے 'ایسوسی ایشن فار دی انڈین مسلمز'۔ شارٹ فارم ہے اے ایس آئی ایم۔ ہندوستان میں جب کبھی فساد ہوتا ہے تو ہم لوگ پریشان حال مسلمانوں کے لیے چندہ بھیجتے ہیں۔ اے سی آئی ایم نے چار مسلمانوں کو ہندوستان سے بلا کر جرنلسٹ کا کورس بھی کروایا تھا۔ سوچا تھا، وہ واپس جا کر بڑے اخباروں میں نوکری کریں گے، مسلمانوں کے بارے میں لکھیں گے۔ لیکن ان میں سے تین نے یہاں کا امیگریشن ویزا لے لیا اور چوتھا وہاں بیکار ہے۔ کیا کریں صاحب، ہم نے تو اپنی طرف سے پوری کوشش کی تھی۔" اسد صاحب میرے پاس بیٹھے تھے ورنہ ان کے لیے مجھ سے بات کرنا آسان تھا۔

"بس یہ سمجھیے کہ یہ آرگنائزیشن ہندوستانی مسلمانوں کی امریکہ میں نمائندگی کرتی ہے۔ اس کی برانچیں شکاگو، ڈیٹرائٹ، ٹورانٹو، سان فرانسسکو اور میامی میں ہیں۔ ہم لوگوں نے حال ہی میں شکاگو میں ایک مسجد بھی بنائی ہے۔ ہر اتوار کو گیٹ ٹو گیدر ہوتا ہے۔ ہم ہی لوگوں میں سے کوئی کسی مذہبی مسئلے پر تقریر کرتا ہے۔" مسرور صاحب نے بتایا۔

"آپ یہاں کب آئے؟" اسد صاحب نے پوچھا۔

"میں، کوئی ایک مہینہ ہوا۔"

"کیا ارادہ ہے؟ کچھ رشتے دار وغیرہ ہیں؟"

"جی نہیں، ایک دوست ہے، ان کی اپنی فرم شپ ہے۔"

"ٹورسٹ ویزا دیا ہے نا؟"

"جی ہاں۔"

"خیر، وہ تو کوئی پرابلم نہیں ہے۔ آپ کے کوئی دو ہزار ڈالر خرچ ہو جائیں گے۔" انھوں نے سنجیدگی سے کہا۔

میں سمجھ نہیں پایا۔ میں نے کہا، "جی؟"

"جی ہاں، امیگریشن ویزا کے لیے ٹرائی کریں گے نا؟"

''مگر میرا تو ایسا خیال نہیں ہے۔ میں تو جولائی میں لوٹ جاؤں گا۔''

''اچھا، لوٹ جائیں گے؟'' انھیں کافی حیرت ہوئی۔ ''ارے صاحب، آ گئے ہیں تو کیا حرج ہے، ٹرائی کریں۔ ویسے آج کل کافی سختی ہو گئی ہے۔ پھر بھی کچھ نہ کچھ ہو جائے گا۔''

''لیکن کیسے ہوگا جناب؟ میں نے تو سنا ہے کہ اب ناممکن ہے۔'' میں بھی اس معاملے میں صرف تفریح کے لیے دلچسپی لینے لگا۔

''وہ جو صاحب، اپنی طرف ہوتا ہے نا،'' انھوں نے ایک آنکھ دبائی۔ ان کے مولوی نما چہرے پر آنکھ مارنا عجیب لگا۔ یہ شاید مسرور والے کام کی طرف اشارہ کر رہے تھے۔ ''وہ یہاں بھی چلتا ہے۔''

''کیا؟ ذرا اور بتائیے۔''

''صاحب، کچھ امریکی لڑکیاں ہیں جو ہزار ڈالر لے کر شادی کر لیتی ہیں۔ پھر امیگریشن آسانی سے مل جاتا ہے۔ پھر کچھ پیسے لے کر طلاق دے دیتی ہیں۔ یہی سب سے آسان ترکیب ہے۔ خلیل اللہ صاحب کے بھانجے کا معاملہ اسی طرح بنا تھا۔ آج کل دو ہزار ڈالر چھنکار رہے ہیں، یعنی سولہ ہزار روپے مہینہ۔ میں پچھلی بار حیدرآباد گیا تھا تو میں نے تو سب غیر شادی شدہ پڑھے لکھے مسلمان لڑکوں سے کہا کہ امریکہ آ جاؤ۔ خوب پیسہ پیدا کرو اور جب مرضی چاہے واپس چلے جاؤ۔''

''کیا آپ کی اے سی آئی ایم بھی اس کام میں کچھ مدد کرتی ہے؟''

''نہیں، ذاتی طور پر آپ کی مدد ہم لوگ کر سکتے ہیں۔ کچھ وکیل امیگریشن کا ٹھیکہ لیتے ہیں۔ کوئی دو تین ہزار لیتے ہیں اور کام کروا دیتے ہیں،'' مسرور صاحب بولے۔

''آ جائیے صاحب، یہاں پیسہ ہی پیسہ ہے۔ ہندوستان میں ہے کیا؟ فرقہ پرستی الگ ہے،'' احمد بولے۔

''تھوڑا سا رسک لینا پڑے گا۔ مجھے جب یہاں آنے کا موقع ملا تو حیدرآباد میں نوکری سے چھٹی نہیں مل رہی تھی۔ میں نے دو گھنٹے کے اندر فیصلہ کیا۔ استعفیٰ ٹھونکا اور چلا آیا،'' مسرور صاحب نے بتایا۔

''تو مشاعرے کا کیا طے کیا احمد صاحب؟'' ڈاکٹر طاہر بولے۔

''بھائی، یہ معاملہ تو ایگزیکٹو ہی میں طے ہوگا،'' مسرور صاحب نے سانس کھینچی۔

Scanned with CamScanner

"ڈاکٹر صاحب، مشاعرے میں کسی ایسے شاعر کو بلایا جا سکتا ہے جس کا آئیڈیل اسلام ہو؟" اسد بولے۔

'ہاں، اگر ایسا شاعر مل جائے اور کچھ مقامی شاعر ہو جائیں تو کامیاب مشاعرہ ہو سکتا ہے۔ ٹکٹ پندرہ ڈالر سے کیا کم ہوگا؟' ڈاکٹر طاہر نے جواب دیا۔

"کیا آپ کسی ایسے شاعر کو جانتے ہیں جو اسلامی فلسفے اور اصولوں کو سامنے رکھ کر شاعری کرتا ہو؟" مسرور صاحب نے مجھ سے پوچھا۔

ذرا مشکل سوال تھا۔ میں نے کہا، "جانتا تو نہیں، لیکن ایسا شاعر مل ضرور جائے گا۔"

نو بج رہے تھے۔ اب تک باہر کافی روشنی تھی۔ شہروں اور ہائی ویز کے ناموں کے بورڈوں کے نیچے سے گاڑی تیزی سے گزر رہی تھی۔ کبھی کبھی سڑک کے کنارے پر روشنی سے چمکتے 'فوڈ' اور 'گیس' کے بورڈ دکھ جاتے تھے۔ دس بجے کے آس پاس ڈاکٹر طاہر نے کچھ کھانے کے لیے ایک ایگزٹ پر گاڑی موڑ لی۔

"یہاں پیسہ بہت ہے، لیکن روحانی سکون کہیں نہیں ہے۔" اسد صاحب نے مجھ سے کہا۔

میں نے ان کی طرف غور سے دیکھا۔ کیا ان کو یہاں آنے سے پہلے یہ نہیں معلوم ہوگا کہ روحانی سکون، اگر وہ کچھ ہوتا ہے تو، یہاں نہیں ملے گا۔ لیکن میں نے ہاں میں ہاں ملانے کے لیے کہا، "ہاں صاحب، وہ اپنے انڈیا میں ہی ہے۔"

"لیکن کیا کریں، ہم تو اب انڈیا جا نہیں سکتے۔" انھوں نے اس طرح کہا جیسے واقعی انڈیا جانا چاہتے ہوں۔

وہ ہنسنے لگے۔ "دس سال یہاں رہنے کے بعد وہاں عجیب لگتا ہے۔ ابھی پچھلے سال گیا تھا۔ گاؤں کی وہی حالت ہے، لوگ ویسے ہی ہیں۔ وہی دیچ دیچ کر کے چلنے والے اکّے گاؤں جاتے ہیں۔ دو چار دن تو اچھا لگتا ہے، پھر مزہ نہیں آتا۔"

"آج کل مہنگائی بھی بہت ہے۔" میں نے بتایا۔

'مہنگائی تو یہاں بھی بہت ہے۔' انھوں نے کہا۔

"لیکن میرے خیال سے زندگی یہاں پھر بھی بہت آسان ہے۔"

"زندگی بہت آسان تو ہے جناب، لیکن یہاں بھی پرابلمز کم نہیں ہیں، خاص طور پر ہم لوگوں کے لیے۔" مسرور صاحب بولے۔

"اور خاص طور پر ان کے لیے جو فیملی والے ہیں۔" ڈاکٹر طاہر بولے۔

"اچھا کیا میں نے جو فیملی کو نہیں بلایا۔" احمد بولے۔

"ہاں، کیا حال ہے احمد صاحب ان لوگوں کا؟ پچھلی بار آپ نے بتایا تھا کہ بلانے والے تھے۔ کب تک کچی پکی کھاتے رہیں گے؟ بلا ہی لیجیے بھابھی کو، اب تو آپ کو چھ سال ہو گئے ہیں۔" ڈاکٹر طاہر بولے۔

"ہاں، اسلامی نظریے سے بھی ٹھیک نہیں ہے۔ آپ یہاں اور آپ کی بیوی ہندوستان میں۔ اسلام کہتا ہے کہ مرد اپنی عورت سے دور صرف چھ مہینے تک رہ سکتا ہے۔" مسرور صاحب نے کہا۔

"اور آپ کو تو چھ سال ہو گئے۔" اسد صاحب نے وہ بات پتا نہیں کیوں دہرا دی جو کہی جا چکی تھی۔

"آپ اپنے ساتھ ہی نہیں، ان کے ساتھ بھی زیادتی کر رہے ہیں۔" مسرور صاحب نے پھر کہا۔

احمد صاحب نے کہا، "کچھ سمجھ میں نہیں آتا کیا کریں۔ ان گرمیوں میں سوچتا ہوں چلا جاؤں۔ حیدرآباد میں کمپنی والوں کے پاس میرا بانڈ بھی پڑا ہے، اس کا پتا نہیں کیا ہوا۔"

"کیوں؟ کیا چھٹی دینے سے پہلے بانڈ بھروایا تھا؟"

"ہاں، یہی کہ کمپنی میں کم سے کم دس سال اور کام کرنا پڑے گا یا دس ہزار روپیہ پڑے گا۔"

"تو کیا آپ یہاں کی نوکری چھوڑ دیں گے؟"

"وہاں آپ کو زیادہ سے زیادہ پانچ سو ملے گا۔ یہاں کیا ملتا ہے؟" اسد نے پوچھا۔

"یہاں تو اب ڈیڑھ ہو گیا ہے۔ ڈیڑھ کا موٹا موٹا حساب دس ہزار روپے مہینے سے زیادہ ہے۔" انھوں نے بتایا۔ "گھر پانچ سو ڈالر مہینہ بھیجتا ہوں۔ خط آتا ہے۔ سب خرچ ہو جاتا ہے۔ یعنی ساڑھے تین ہزار خرچ ہو جاتا ہے۔ اب میں وہاں پانچ سو روپے کے لیے لوگوں کا پیٹ بھروں گا اور کیا اپنا۔"

Scanned with CamScanner

''تو آپ بلا ہی لیجیے بیوی کو،'' مسرور صاحب بولے۔

''ارے صاحب، بلا لیں تو بچوں کو بھی بلائیں۔ تین لڑکیاں اور دو لڑکے ہیں خدا کے فضل سے۔ ان سب کا گزر میرے ایک کمرے والے فلیٹ میں تو ہو نہیں سکتا۔ تین سو ڈالر مہینے کا فلیٹ لینا پڑے گا۔ باقی بچوں کی تعلیم اور اِدھر اُدھر میں خرچ ہو جائے گا۔ ایک ڈالر نہیں بچے گا۔ پھر پردیس میں پڑے رہنے کا فائدہ؟''

''ارے تو فلیٹ خرید لیجیے نا۔ ابھی اچھن کے برابر والا بکا نہیں ہے۔ تیس ہزار میں سودا ہو جائے گا۔ بولیے؟'' مسرور صاحب نے کہا۔

''نہیں صاحب، کیش تو اس لیے خون پسینہ کر کے جوڑا ہے کہ ریٹائر ہونے کے بعد ہندوستان میں کام آئے گا۔''

''تب تو آپ کے مسئلے کا کوئی حل نہیں ہے،'' مسرور صاحب نے سگریٹ سلگائی۔

''بڑی لڑکی ماشاءاللہ سے بیس کی ہو گئی۔ اس کی شادی کا مسئلہ ہے۔ میں یہاں ہوں۔ اچھے لڑکوں کی تلاش اب کوئی ہنسی کھیل نہیں ہے،'' انھوں نے کہا۔

''تو آپ جناب، یہاں سے تین مہینے کی چھٹی لیجیے۔ ایئر فرانس سے واپسی والا ٹکٹ لے کر حیدرآباد جائیے۔ لڑکی کی شادی کیجیے اور باقی بچوں اور بیوی کو لے کر آ جائیے۔ کمپنی والوں کے منھ پر ڈیڑھ ہزار ڈالر مار کر اپنا بانڈ واپس لیجیے،'' ڈاکٹر طاہر احمد صاحب کی پوری زندگی کا پروگرام طے کرنے لگے۔

''بیوی پردہ کرتی ہے ڈاکٹر صاحب۔ دوسری لڑکی بھی ماشاءاللہ سترہ سال کی ہے۔ ایک دو سال بعد اس کی بھی شادی کا مسئلہ سامنے ہوگا۔ ایک لڑکا وہاں انٹر میں پڑھتا ہے، دوسرا ہائی اسکول میں۔ دونوں یہاں آ کر کہاں پڑھیں گے؟ اور کیسے؟ یہ سب آسان نہیں ڈاکٹر صاحب،'' احمد صاحب کی آواز ڈوبتی چلی گئی۔

سامنے سے آنے والی موٹروں کی ہیڈلائٹ میں سب کے چہرے کچھ لمحوں کے لیے چمک جاتے اور پھر اندھیرے میں ڈوب جاتے۔ رات کے گیارہ بجنے والے تھے اور شاید اس لیے گاڑی کی رفتار بڑھ گئی۔ سب جلدی سے جلدی گھر پہنچنا چاہتے تھے، اور احمد صاحب بھی۔ گھر، جہاں بیوی

نہیں ہے، بچے نہیں ہیں، صرف ایک کمرے کا فلیٹ ہے۔

''سوچتا ہوں، واپس ہی چلا جاؤں۔'' وہ مری ہوئی آواز میں بولے۔

ڈاکٹر طاہر کو پتا نہیں اس بات پر کیوں غصہ آ گیا۔ ''میں تو [illegible] چاولوں کا جہاز واپس لوں گا، نہیں، رہوں گا امریکہ میں۔ ہندوستان بھی کوئی ملک ہے، جہاں سائنٹسٹ خودکشی کر لیتے ہیں، انجینئر بے روزگار گھومتے ہیں۔ [illegible] پر [illegible]۔ یہاں سے کم پڑھ لیں تو [illegible] کے بعد مسلم فساد ہوگا اور [illegible] جائیں گے۔'' اس کی بات کی کسی نے مخالفت نہیں کی۔

''ہمیں تو صاحب، یہیں رہ کر حالات کو سازگار بنانا ہے۔ آپ [illegible] آئی ایم کی شروعات ہو چکی ہے، اسی سے [illegible] کرنا ہے۔'' سرور صاحب بولے۔

''یہ تو ہم سب کو پتا ہے کہ [illegible] ہوتا ہے، اس کو اور بڑے پیمانے پر کرنے کی ضرورت ہے۔ ہم لوگ انڈین مسلمز کا ایک اخبار تو نکال سکتے ہیں۔ اور اپنے بچوں کے لیے ایک ایسا ماحول اور ہاسٹل کھول سکتے ہیں جہاں ماڈرن تعلیم مسلم ماحول میں دی جایا کرے۔ یہ بہت ضروری ہے احمد صاحب۔ ہمارے بچے بھی اسکولوں میں جاتے ہیں جہاں امریکن لڑکے لڑکیاں جاتے ہیں۔ ان کے ساتھ وقت گزارتے ہیں۔ بچوں کے دماغ پر اسی ماحول کا اثر پڑے گا۔ کیا آپ پسند کریں گے کہ آپ کی جوان لڑکی کسی لڑکے کے ساتھ گھر چلی آئے اور آپ سے کہے کہ یہ میرا بوائے فرینڈ ہے، جیسا کہ امریکی گھروں میں ہوتا ہے؟ اور جناب ایسا ہوگا اور ضرور ہوگا۔ کیا گارنٹی ہے کہ آپ کی بیٹی آپ سے پوچھ کے شادی کرے گی؟ [illegible] ماحول میں پلی بڑھی تو اسی رنگ میں رنگ جائے گی۔'' وہ جوش میں بولتے گئے۔ ''اس لیے ایسا ماحول بنانے کی ضرورت ہے کہ ہمارے بچے بھی مذہبی قدروں والی تہذیب میں [illegible] ہم پلے بڑھے ہیں۔''

''جی ہاں، اسکول والا آئیڈیا بڑا اچھا ہے۔ کم سے کم بچے اگر پندرہ سولہ برس کی عمر تک ایسے ماحول میں رہیں تو پھر امریکی ماحول کا اثر نہیں پڑے گا۔'' اسد صاحب بولے۔

''طاہر صاحب، میں اپنی بڑی بیٹی کو خود قرآن شریف پڑھاتا ہوں۔ میں خود...''

سرور صاحب کی بات پر ڈاکٹر طاہر بولے: ''مگر سرور صاحب، کالج میں تو وہ سیکس ایجوکیشن پڑھتی ہی ہوگی۔ اس ملک میں لڑکیاں چودہ سال کی عمر میں ڈیٹنگ کرنے لگتی ہیں۔ پارکوں اور سڑکوں

پر جو کچھ ہوتا ہے، اخباروں اور ٹیلی وژن پر جو کچھ آتا ہے، اسے دیکھ کر ہمارے بچے کیا سیکھیں گے؟"

مسرور صاحب کچھ ڈری ہوئی آواز میں بولے: "نہیں نہیں، میں اسکول اور اسلامی ہاسٹل والے آئیڈیا سے بالکل ایگری کرتا ہوں۔ میں تو آپ کو صرف اپنی بات بتا رہا تھا۔"

"ابھی ہمارے بچے چھوٹے ہیں مسرور صاحب۔ ہم ان کو جیسا بنانا چاہیں گے ویسا وہ بنیں گے۔ لیکن میں کسی بھی صورت میں یہ گوارا نہیں کروں گا کہ میری بیٹی بغیر شادی کے کسی کے ساتھ رہنے لگے، جیسا کہ عام طور پر امریکہ میں ہوتا ہے۔" ڈاکٹر طاہر بولے۔

اسد صاحب بولے: "ڈاکٹر صاحب، میں سوچتا ہوں کہ شہناز گیارہ بارہ برس کی ہو جائے تو میں اسے ہندوستان نانا نانی کے پاس بھیج دوں۔"

"آئیڈیا برا نہیں ہے۔" ڈاکٹر طاہر بولے: "لیکن کیا آپ کے ساس سسر اس کی تعلیم وغیرہ کا اسی طرح خیال کریں گے جیسے آپ کرتے ہیں؟ یا کیا لڑکی گیارہ سال تک یہاں رہنے کے بعد ہندوستان کے کسی چھوٹے سے قصبے کے اسکول میں پڑھنا منظور کرے گی؟ میرے خیال سے شاید یہ نئی سچوئیشن سب سے برا ہوگا۔ لیکن ٹھیک ہے صاحب، کرنا ہی پڑے گا۔"

کچھ دیر تک ڈرائنگ روم میں خاموشی چھا گئی۔ لوگ تصور میں اپنی اپنی لڑکیوں کو امریکی لڑکوں کے ساتھ مباشرت کرتے دیکھ کر ڈر گئے تھے۔ احمد صاحب شکرگزار ہو رہے تھے۔ ان کی لڑکی ہندوستان میں ہے۔ کسی امریکی کے ساتھ مباشرت نہیں کر سکتی۔ کیا گارنٹی ہے کہ کسی اور کے ساتھ، یعنی کسی ہندوستانی کے ساتھ، مباشرت نہیں کر رہی ہوگی؟ لیکن شاید احمد صاحب اتنی دور کی کوڑی لانے میں یقین نہیں رکھتے۔

❋ ❋

پنکج بشٹ

ہندی سے ترجمہ: زیبا علوی

ایسٹ انڈیا کمپنی

وہ کل تین تو تھے، اس میں اگر دو بچوں کو بھی جوڑ دیا جائے تو کل تعداد گیارہ ہو جاتی ہے۔ [illegible] ویسے تو [illegible] درجے کا یہ ریل کا ڈبہ مسافروں سے ٹھسا ٹھس بھرا تھا، لیکن اس کے حصے میں وہ کل گیارہ تھے۔ ایک طرف بیٹھے ہوئے پانچ اور دوسری طرف چار، اور ساتھ میں دو بچے۔ ان گیارہ میں اسے [illegible] کھڑکی کے پاس کی جگہ مل گئی تھی۔ ایک رات ریل میں کھڑکی کے پاس جگہ مل جانے پر [illegible] ڈبے کے اندر کی دنیا سے کوئی سروکار نہیں رہتا۔ اس کا من بڑی تیزی سے دوڑ رہے کھیتوں [illegible] ندی نالوں، جنگل پہاڑیوں سے گھومتا ہوا [illegible] ساتھ دوڑنے لگتا ہے، اور ساتھ میں تال ملانے لگتی ہے ریل پٹریوں پر تھاپ دیتے پہیوں کی آواز [illegible] کھٹ... پٹک پٹک... پٹک پٹک... کھٹ کھٹ...'

آج اسے پہلے پہل تو کھڑکی کے پاس جگہ نہیں ملی تھی، لیکن چونکہ کھڑکی کے پاس بیٹھے شخص [illegible] کے ساتھ کچھ مکالمے ہوئے اور وہ اپنا سامان اٹھا کر [illegible] کے ساتھ چلے گئے۔ ویسے بھی وہ [illegible] ڈبے [illegible] دونوں ہی اس [illegible] ڈبے میں [illegible] تک رہے تھے۔ شاید [illegible] ریزرویشن [illegible] کی وجہ سے وہ یہاں بیٹھ گئے تھے۔ غریب لوگوں کے بھارت میں موقع ملتے ہی وہ اپنے جیسے لوگوں کے بھارت میں چلے گئے۔ اپنے جیسے

کی کھڑکی ایک غریب کو دے کر۔ ان کے وہاں سے ہٹتے ہی اس نے بجلی کی پھرتی سے کھڑکی کے پاس قبضہ کر لیا۔ کھڑکی کے پاس بیٹھتے ہی اسے لگا کہ اب سفر کتنا ہی لمبا ہو، کوئی فرق نہیں پڑتا، کیونکہ کھڑکی کے اس پار والے ایک پورے سنسار کے ساتھ اب وہ جڑ گیا ہے؛ سفر کی رفتار اب فطرت سے جڑ کر اور تیز ہو گئی ہے۔

تو وہ کل جمع گیارہ تھے۔ کچھ گھنٹوں کے لیے مجبوری میں بنا ایک دوسرے سے بالکل اجنبی لوگوں کا سماج۔ اس سماج میں نہ کوئی کسی کے ماضی کے بارے میں جانتا ہے نہ مستقبل کے، صرف حال کے کچھ گھنٹوں کو کاٹنے کے لیے یہ سماج بنا ہے۔ کھڑکی کے پاس آسن جمانے کے کافی دیر بعد وہ ڈبے کے اندر آیا۔ یہاں آنے سے مطلب ذہنی طور پر اندر آنا ہے — باہر کے قدرتی منظر کو چھوڑ کے وہ اندر آیا، تب اسے دس لوگ دکھائی دیے جو اس کے سمیت کل گیارہ تھے، اور اوپر بیان کیے گئے سماج کی تخلیق کر رہے تھے۔

سامنے کی سیٹ پر کونے میں ایک 'چھوٹا پریوار' براجمان تھا۔ ٹھیٹھ دیہاتی میاں بیوی اور ان کی دو چھوٹی چھوٹی بیٹیاں۔ یہ بیٹیاں اس بات کا اشارہ تھیں کہ یہ خاندان بہت دنوں تک چھوٹا اور سکھی خاندان نہیں رہے گا۔ اگر وہ بیٹے ہوتے تب شاید یہ رہ جاتا، لیکن میاں بیوی کی کم عمر اور دو بیٹیاں چھوٹا خاندان سکھی خاندان پر سوالیہ نشان لگا رہی تھیں۔ ان چار کے بعد سیٹ پر ایک خاتون اپنی جوان لڑکی کو لے کر بیٹھی تھیں۔ لڑکی چونکہ جوان تھی اس لیے ظاہر ہے کھڑکی کے قریب بیٹھی تھی، اس کے ٹھیک سامنے۔ ماں بیٹی دونوں ہی کھاتے پیتے گھر کی ہونے کی بات کو اپنی چربی سے ثابت کرنے کی پوری کوشش کر رہی تھیں۔ یہ تھا اس کی مخالف بینچ کا، یعنی اس کے ٹھیک سامنے کی سیٹ پر براجمان اس کے حصے کا آدھا سماج۔

اب اس نے اپنے ساتھ بیٹھے لوگوں پر نظر ڈالی۔ اس دیکھنے کے دوران اسے لگا کہ اپنی مخالف سمت پر نظر ڈالنا بہت آسان ہے، آنکھیں اٹھاؤ اور دیکھ لو، لیکن اپنے برابر بیٹھنے والوں کے لیے باقاعدہ کوشش کرنی پڑتی ہے۔ بات وہی کوشش کرنے اور کوشش نہ کرنے کی ہے۔ اپنے لوگوں میں خود کو چھوڑ کر باقی لوگوں کو دیکھا۔ سامنے کی بینچ کو جب اس نے دیکھا تھا تو کہیں سے کوئی ردعمل نہیں ہوا تھا۔ مگر جب گردن گھما کر، منھ جھکا کر، اس نے اپنے برابر بیٹھے لوگوں کو دیکھا تو ان لوگوں میں، خاص طور سے

عورتوں میں، ردعمل ان کی آنکھوں میں صاف دکھائی دیا، کچھ اس طرح کہ دیکھو، کیسے گھور رہا ہے۔

خیر، اس دیکھنے دکھانے کے عمل میں جو کچھ نظر آیا وہ اس طرح تھا: اس کے ٹھیک پاس دو عورتیں بیٹھی تھیں اور ان کے پاس پھر ایک عورت تھی اور پھر ایک مرد بیٹھا تھا۔ اب اسے اس طرح بھی کہا جا سکتا ہے کہ تین عورتیں اور ایک مرد بیٹھا تھا، لیکن ایسا اس لیے نہیں کہا جا رہا ہے چونکہ دو عورتیں ایک ساتھ تھیں اور تیسری عورت اور چوتھا مرد ایک ساتھ تھے، جیسا کہ ان کی بات چیت سے پتا چل رہا تھا۔ اس کے ٹھیک پاس کی دو عورتیں روایتی ہندوستانی عورتیں تھیں جن کا تعلق ممکن ہے کہ متوسط طبقے سے ہو۔ روایتی اس لیے کہ ان کی گفتگو میں کردار بھلے ہی رہ رہ کر بدل رہے ہوں لیکن موضوع وہی ایک تھا، یعنی غیبت اور یہ غیبت پوری شدت اور پوری ایمانداری سے نبھائی جا رہی تھی۔ حالانکہ کبھی کبھی یہ کانا پھوسی والی سطح پر پہنچ جاتی تھی۔ شاید ان عورتوں کا یہ ماننا تھا کہ بھلے ریل کے ڈبے کی دیواریں ہوں یا گھر کی، دیواریں تو دیواریں ہیں اور ان کے کان ہوتے ہی ہیں۔

ان دو عورتوں کے اس طرف جو عورت اور مرد تھے وہ بہت بوڑھے تھے، ایک سردار جی اور ان کی بیوی۔ سردار جی پوری طرح اپنے روایتی حلیے میں تھے اور اوپر ایک کرپان بھی لٹکائے ہوئے تھے۔ بیوی ان سے کچھ زیادہ بوڑھی بھی اور بیمار بھی تھیں۔ ایسا اس لیے کیونکہ سردار جی تھوڑی دیر بعد اٹھ کر نیچے فرش پر بیٹھ جاتے تھے اور ان دو لوگوں والی جگہ پر ان کی بیوی آرام سے لیٹ جاتی تھیں۔ ایسا رہ رہ کر ہو رہا تھا۔

پوری طرح نظر دوڑانے کے بعد اس نے دوبارہ سامنے نظر ڈالی تو اس کے ٹھیک سامنے بیٹھی لڑکی اس سے نظر ملتے ہی بلاوجہ شرما گئی۔ ویسے لڑکیوں کے ساتھ یہی مسئلہ ہوتا ہے۔ ایک ٹھیک ٹھاک سا آدمی جسے تھوڑی دور سے دیکھنے پر جوان ہونے کا دھوکا سا ہوتا ہو، اس کی موجودگی سے ہی انھیں کچھ کچھ ہونے لگتا ہے۔ صورت حال یہ ہو گئی کہ کچھ ہی دیر میں اسے کنکھیوں سے دیکھنا، دوپٹہ منہ میں دبانا، پیر کے انگوٹھے سے زمین کریدنا جیسی نایاب حرکات کا مشاہدہ کرنے کا قیمتی موقع مل گیا۔ اگرچہ ٹرین کے اس خوب ہموار فرش پر کریدنے جیسا کچھ نہیں تھا پھر بھی عورتیں اپنے روایتی انداز کو نبھانے میں پکا یقین رکھتی ہیں۔ اب روایت پیر کے انگوٹھے سے زمین کریدنے کی ہے تو کریدنا ہے۔ اُدھر کونے کا چھوٹا خاندان سکھی خاندان جس طرح سے بیوہار کر رہا تھا، اس سے صاف لگ رہا تھا

کہ اب یہ چھوٹا خاندان سفر ختم ہونے کے کچھ دن بعد ہی چھوٹے خاندان کا اضافہ ہو سکے گا، اگرچہ بچیوں کی وجہ سے دونوں میاں بیوی خاصے پریشان نظر آرہے تھے۔

تو اس طرح ڈبے کے چار گروپوں میں گیارہ افراد بات چیت میں مشغول اور ان سب کے بیچ ایک بلاوجہ کا مکالمہ اس کے اور سامنے والی لڑکی کے درمیان بھی ہو رہا تھا۔ حالانکہ یہ نگاہوں سے ہونے والا مکالمہ تھا اور قطعی یکطرفہ تھا۔ اور اسی یکطرفہ مکالمے کے باعث وہ دوبارہ کھڑکی سے باہر نکل گیا اور ایک بار پھر ندی، تالاب، پیڑ، پہاڑوں کے ساتھ دوڑنے لگا۔ اچھا ہوا اب کھڑکی کے پاس بیٹھنے کیونکہ کھڑکی کے پاس بیٹھنے والے کو یہی ایک بڑی سہولت ہوتی ہے۔ اگر ڈبے یا بس کے اندر کا ماحول کسی خاص شخص یا کسی خاص واقعے کی وجہ سے دلچسپ نہ رہے تو جسمانی طور پر اندر موجود رہ کر ذہنی طور پر باہر نکلا جا سکتا ہے، جو وہ ابھی کر رہا ہے۔

کافی دیر تک وہ کھڑکی کے باہر دوڑتا رہا، تب تک جب تک باہر اندھیرے نے ندیوں، پہاڑوں، تالابوں کو اپنی آغوش میں نہیں لے لیا اور باہر دوڑنا اس کے لیے قطعی ناممکن نہیں ہو گیا۔ گھور اندھیرا باہر پھیلا اور وہ اندر آ گیا۔ اندر آ کر اسے پہلی تسلی یہ ملی کہ اس کے سامنے والی لڑکی اپنی ماں کے کندھے پر سر ٹکائے سونے یا شاید اونگھنے کی حالت میں آ چکی تھی۔ باقی سب کچھ بدستور تھا۔ ہاں، ایک جنگ، ادھیڑ عمر کے ایک عورت مرد جو صرف اس لیے میاں بیوی کہے جا سکتے تھے کیونکہ ٹرین حرکت میں تھی۔ وہ دونوں جہاں دونوں سیٹیں ختم ہوتی ہیں ٹھیک اسی جگہ پر آ کر کھڑے ہو گئے تھے۔ مرد پورے طور پر روایتی ہندوستانی ادھیڑ تھا جس کے سر کے بال غائب تھے اور پیٹ توند نام کی ایک مخلوق میں تبدیل ہو چکا تھا۔ عورت اس سے بھی زیادہ ہندوستانی نظر آ رہی تھی۔

شوہر کی آنکھوں میں کچھ پا لینے کے لیے بے چینی نظر آ رہی تھی۔ اس نے دیکھا، کونے والے سردار جی کی بیوی نڈھال لیٹی ہوئی ہیں اور سردار جی سیٹ سے نیچے بیٹھے اونگھنے والی مدرا میں نظر آ رہے تھے۔ نو وارد کھڑے جوڑے کی نگاہیں ادھ لیٹی سردارنی کی گھیری ہوئی جگہ پر ٹکی ہوئی تھیں۔ اگر سردار جی پاس نہ بیٹھے ہوتے تو یقیناً وہ دونوں ابھی تک سردارنی کو اٹھا چکے ہوتے۔ رات کافی ہو چکی تھی لیکن پبلک ڈبے میں کیا رات کیا دن، کیونکہ بیٹھے بیٹھے اونگھنا ہی تھا اور وہ بھی لوہے کی سخت سیٹوں پر۔ اسے صرف ایک بات کا ڈر تھا کہ اس کے ٹھیک سامنے والی کی اونگھ کہیں ٹوٹ نہ جائے نہیں تو پھر

Scanned with CamScanner

اسے ریڈنا لی تا، یہ سب سہنا پڑے گا، کیونکہ اندھیرے میں کھڑکی سے باہر بھی تو نہیں جایا جا سکتا۔

سردارنی اچانک کچھ کراہیں اور اٹھ کر بیٹھ گئیں۔ سردار جی کو اس بات کا پتا ہی نہیں چل پایا کہ سردارنی خود بیٹھ گئی ہیں، اور وہ پہلے کی طرح اونگھتے رہے۔ سردارنی کو شاید [illegible] دکھائی دیتا تھا، وہ اٹھ کر چپ چاپ بیٹھ گئیں، اس بیچ انہوں نے دوپٹے کو سنبھال کر سر ڈھک لیا۔ سردارنی کے اٹھتے ہی جوڑے میں بیوی کے بیچ ہوا ایسا ہوا کہ جیسے خفی زبان میں آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارہ ہو گیا کہا جا سکتا ہے۔ اس بات کو صاف اسی نے دیکھا کہ جوڑے کے شوہر نے بھنوؤں کو اوپر اچکا کر، گردن کو سامنے کھینچ کر سردارنی کے بیٹھ جانے سے خالی جگہ کی طرف اشارہ کیا، اور جواب میں جوڑے کی بیوی نے [illegible] کی طرح تھی، بیچ میں سے ہی شوہر کے ہاتھوں سے بیگ لے لیا۔ یہ پورا سلسلہ اس کے لیے، چپ ہو گیا تھا، اسے اب ڈبے کے اندر بھی مزہ آ رہا تھا۔

ہاتھوں میں بیگ لے کر جوڑے کی بیوی کچھ دیر تک کھڑی رہی، پھر بلی کی طرح دبے پاؤں اس خالی جگہ کی طرف بڑھی۔ دبے پاؤں بڑھنے کی وجہ شاید یہی تھی کہ سردار جی کی نیند نہ ٹوٹ جائے، کیونکہ اس صورت میں سردار جی اس خالی جگہ کے پہلے حقدار ہونے کی بنیاد پر وہاں بیٹھ جاتے۔ لیکن جوڑے کی بیوی کی قسمت ساتھ دے گئی، وہ اپنا بیگ اور لگ بھگ [illegible] اس خالی جگہ پر بیٹھ گئی، [illegible] بیوی کہا جا سکتا تھا۔ جوڑے کی بیوی کے [illegible] ہی [illegible] سردارنی کی طرف سے نہیں ہوئی تھی [illegible] دیہاتی عورتوں کی طرف سے ہوئی۔

[illegible] عورتیں اتنی بھی [illegible] رغبت میں لگی ہوئی تھیں۔ [illegible] متعلق ہو گئے تھے، مثلاً [illegible] آ جاتی [illegible] تک سوتی رہتی ہے۔ ان دونوں عورتوں [illegible] کا روایتی پر گرم [illegible] جوڑے کی بیوی کے [illegible] پاس آ کر بیٹھتے ہی کچھ [illegible] کی [illegible] ہے۔ [illegible] کی سی ساگری، جانے تھیں [illegible] عورتوں [illegible] تھیں میں کہاں؟ یہی وجہ تھی شاید کہ دونوں عورتوں [illegible] جوڑے کی [illegible] دونوں آنکھیوں سے جوڑے کی بیوی کی طرف دیکھتیں۔

Scanned with CamScanner

اسی بیچ سردار جی کی اونگھ والی کیفیت ختم ہو گئی۔ انھوں نے اٹھ کر جیسے ہی اپنی جگہ پر اس عورت کو بیٹھے دیکھا تو فوراً بولے، ''او بہن جی، اٹھیے تو میں بیٹھا تھا۔'' عورت نے فوراً اپنے شوہر کی طرف دیکھا۔ ادھیڑ شوہر نے فوراً سردار جی کو جواب دیا، ''او سردار جی، مہیلا ہیں، کب تک کھڑی رہتیں۔ آپ تو اچھے بیٹھے ہی ہو نیچے۔'' سردار جی بوڑھے ہونے کے ساتھ شائستہ بھی تھے، اور پھر عورت کے بیٹھنے کی مخالفت بھی کیسے درج کراتے؛ کچھ نہیں بولے، مڑ کر سردارنی سے کچھ پوچھنے لگے۔ کھڑا شوہر اور بیٹھی بیوی دونوں مسکرا رہے تھے۔ وہ اس واقعے کے خلاف آواز اٹھانے کو ہوا، پھر سوچا، جانے دو۔ اپنا کیا گیا؟ جگہ تو سردار جی کی گئی۔

کچھ دیر تک اس نے کھڑکی کے باہر اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ کر دیکھنے کی کوشش کی لیکن باہر کچھ سوجھ ہی نہیں رہا تھا۔ وہ دوبارہ اندر آ گیا۔ اس کے ٹھیک سامنے ابھی بھی اونگھ کا ماحول تھا۔ وہ بھی اونگھنے لگا۔ کافی دیر تک وہ اونگھتا رہا۔ اس کی اس بے اختیار اونگھ کے کئی اسباب تھے، جیسے کہ اس کے ٹھیک سامنے کی نگاہوں کے مکالمے کا اونگھ جانا، چھوٹے اور سکھی خاندان کی بات چیت کا تھم جانا، اور ٹھیک پاس کی غیبت کا بھی تھم جانا۔ کافی دیر بعد جب اس کی آنکھیں تھوڑی کھلیں تو اس نے دیکھا کہ سارے ہم سفر اونگھ والی کیفیت سے گہری نیند کی آغوش میں جا چکے ہیں۔ اس کو لگا کہ صرف دو ہی لوگ ہی جاگ رہے ہیں، سردار جی، سردارنی، بیٹھی بیوی اور کھڑا شوہر۔ بیٹھی بیوی اپنے کھڑے شوہر کی فکر میں جاگ رہی تھی، اور سردار جی سرداری کی وجہ سے جاگ رہے تھے۔ یعنی دونوں جوڑے [illegible] مثال [illegible] تھے

[illegible] بیٹھے رہے تب پریشان ہو رہی تھی شاید [illegible] دوبارہ [illegible] پتے وہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد اٹھ لیتی [illegible] کھڑی ہوئی عورت [illegible] بیٹھے ہونے کی [illegible] ختم ہو گئی تھی [illegible] پریشان دیکھ سردار جی [illegible] پوچھ [illegible] ''[illegible] بیٹھنا ہے؟'' [illegible] کچھ سمجھ میں نہیں آیا [illegible] [illegible] بھی چپ رہے [illegible] دیکھ [illegible] [illegible] پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

جیتی ہوئی بیوی نے [illegible] میں مٹھاس گھولتے ہوئے سردار جی سے پوچھا: "کہاں [illegible]
[illegible] سمجھ [illegible] میں نہیں آ رہا ہے کیا؟" سردار جی [illegible] سوچا ایسا شاید [illegible]
[illegible] مقصد [illegible] پوچھ رہا ہے [illegible] لیے فوراً جواب [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible] جیتی بیوی نے [illegible] سردار جی کا بیگ [illegible] سے ایک [illegible]
[illegible] سردار جی سے کہا: "بیٹھیے بھائی صاحب، سردار جی کو یہاں بٹھا دیجیے، یہاں [illegible]
آ [illegible] جائے گا۔" سردار جی نے اٹھ کر سردارنی کا ہاتھ پکڑ کر اٹھایا اور نیچے کی برتھ پر لٹا دیے گئے۔
[illegible] سب کچھ شوہر کی مدد سے ہو رہا تھا۔ سردارنی کے لیٹتے ہی جیتا شوہر بھی فوراً سردارنی کے اٹھنے سے
خالی ہوئی جگہ پر [illegible] بیٹھے شوہر میں بدل گیا۔ سردار جی [illegible] سے بیٹھتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔
بولے [illegible] بھی نہیں، ان لوگوں کی برتھ پر ہی تو سردارنی کو لٹایا ہے۔ سردار جی نے سردارنی کے
پیروں کے پاس تھوڑی جگہ بنائی اور وہیں نیچے بیٹھ گئے۔ جیتی بیوی نے سردار جی سے کہا: "یہاں
تو بھی جی آرام سے [illegible] تک سو سکتی ہیں۔" جواب میں سردار جی نے بڑی نرمی سے صرف سر ہلا دیا۔

رات کافی بیت چکی تھی۔ ٹرین پوری رفتار سے بھاگ رہی تھی۔ اسے یاد آیا، بچپن میں تاریخ
کے استاد اسے بار بار سمجھاتے تھے کہ کس طرح ایسٹ انڈیا کمپنی بھارت میں آئی، پھر دھیرے
دھیرے بھارت میں پھیلی اور آخر میں پورے بھارت پر قبضہ کر لیا۔ تب اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا
کہ ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ تاریخ کا وہ سبق آج جا کے اس کی سمجھ میں آیا کہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے کس
طرح بھارت پر قبضہ کیا ہوگا۔ اس نے جیتی بیوی اور تازہ تازہ جیتے شوہر کی طرف دیکھا۔ اسے لگا، وہ
دونوں یونین جیک میں بدل گئے ہیں۔ وہ دھیرے سے مسکرایا اور آنکھیں بند کر کے اونگھنے لگا۔ باقی

مسافروں کے ساتھ اب بیٹا شوہر اور بیٹی بیوی اور سردو رمی اور سردارنی بھی دھکیلنے سے اب نیند کی طرف بڑھ رہے تھے، کیونکہ اب سبھی مطمئن ہو گئے تھے۔ یونین جیک سینہ پر پہرا رہا تھا، اور بھارت بیچ دنی پر سو رہا تھا۔ وہ بھی دھیرے دھیرے سو گیا۔

❀ ❀

پنکج سبیر
ہندی سے ترجمہ: زیبا علوی

کفر

ظفر آج بھی گھر نہیں لوٹا ہے۔ ایسا اکثر ہی ہوتا ہے۔ دن بھر کا تھکا ہارا ظفر دیر رات گھر لوٹتا ہے۔ گھر لوٹ کر ایک ہی بات کہتا ہے: "آج کھانا نہیں کھاؤں گا۔ دوست نہیں مانے تو ان کے ساتھ کھا لیا تھا۔" ممتاز بھی کچھ نہیں بولتی۔ معلوم ہے کہ اس کا شوہر اسے شرمندگی سے بچانے کے لیے ایسا کہہ رہا ہے، ورنہ زیادہ اتنا بھی نہیں جانتی کہ غریبی اور دوست، یہ دونوں چیزیں ایک ساتھ کبھی نہیں رہ سکتیں۔ بھوک کا پتہ جب پیٹ میں 'کا' ہو تو چہرہ خود ہی بتا دیتا ہے۔ ممتاز نے اس جھوٹ کو چپ چاپ گردن ہلا کر مان لیا ہے۔ ماں بیٹے نے مادہ چارہ بھی کیا ہے۔ جب غربت گھر میں بھائیں بھائیں کرتی ڈول رہی ہو تو بھوک بھی اس کی سہیلی بن کر سر پر تین تگاڑا کھیلتی ہے۔

بچوں کو تھوڑا بہت کھلا پلا کر سلا دیا ہے ممتاز نے۔ ظفر جان بوجھ کر دیر کرتا ہے۔ جانتا ہے، بچے سوئے ہوں گے۔ جب ہاتھ بھرے ہوتے ہیں تب شام ڈھلے ہی گھر لوٹ آتا ہے۔ مگر ہاتھ بھی روز کہاں بھرے ہوتے ہیں۔ اکثر تو دیر رات اپنے ہی گھر چوروں کی طرح آتا ہے۔ اگر پیٹ میں بھوک ہو تو آنکھوں میں نیند بھی کچی ہوتی ہے۔ پھر بچوں کو بھی کیا معلوم کہ ان کا باپ کس حال میں ہے۔ وہ تو بس یہ جانتے ہیں کہ ابا صبح سے کام پر نکل جاتے ہیں، کام کے بدلے میں پیسے آتے ہیں جس سے کھانا آتا ہے، اور یہ کھانا بھی بھوک کا مارا ہوا ہے۔ اب ان کو کون بتائے کہ کام تو آدمی جب [illegible]

کیسے آئے گا۔

تین بھائیوں کی پیٹھ پر پیدا ہوئی ممتاز کا نام ماں باپ نے ممتاز کیوں رکھا تھا، یہ تو اسے پتا نہیں۔ ہاں، نام جیسا کچھ نہیں مل پایا اسے۔ جو ملا وہ سب کچھ ان ناموں کے مطابق تھا جو دادی جھونٹے پکڑ کر چیختی ہوئی اسے دیتی تھیں: ''کرم جلی''، ''نصیب پھٹی''۔ ان کی ہی زبان چل گئی تھی۔ اگر وہ ایسا جانتیں تو شاید اسے ممتاز ہی کہہ کر بلاتیں۔

''بچے سو گئے کیا؟'' ظفر نے دھیرے سے پوچھا۔

''ہاں، ابھی سوئے ہیں۔ آج بڑی دیر کر دی؟'' ممتاز نے کہا۔

''ہاں، آج پھر کام نہیں ملا۔ ٹھیکیدار کہتا تھا کہ اگر اور ایسا چلا تو وہ واپس لوٹ جائے گا۔ یہاں اس کو بیٹھنے کی مزدوری بھی نہیں مل رہی ہے۔'' ظفر نے کرتا اتار کر ممتاز کو دیتے ہوئے کہا۔

''خدا سب ٹھیک کرے گا، اس پر بھروسا رکھو۔'' ممتاز نے شوہر کو ٹوٹا ہوا جان کر کہا۔

''ہاں، اب بس اسی کا آسرا ہے۔'' ظفر نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا۔ کرتا ٹانگ کر ممتاز باورچی خانے کی طرف چلی گئی۔ ہاتھ میں کھانے کی پلیٹ لیے لوٹی تو ظفر آنکھیں بند کیے لیٹا تھا۔ بھوک بھی کتنا عادی کر دیتی ہے آدمی کو! جانتا ہے کہ گر خالی ہاتھ گھر لوٹا ہے تو صرف سالن کے سوا یہ گھر اور کچھ بھی نہیں دے گا۔

''کھانا کھا لو۔'' ممتاز کی آواز سن کر ظفر چونک پڑا۔

''ارے میں تو...''

ظفر کی بات کاٹتے ہوئے ممتاز بولی: ''باہر سے کھا کر آئے ہو، پر تھوڑا بہت کھا لو، آج تمھاری پسند کا سالن بنایا ہے۔''

''تم نے کھا لیا؟'' ظفر نے ہاتھ میں پلیٹ پکڑتے ہوئے پوچھا۔

''کھاؤں گی۔ آپ کھائیے، تب تک میں اندر کا کام ختم کر لوں۔'' کہتے ہوئے جیسے ہی ممتاز اندر جانے کو مڑی ویسے ہی ظفر نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

''آؤ بیٹھو، ساتھ ہی کھا لیتے ہیں۔'' ظفر نے ممتاز کو پاس بٹھاتے ہوئے کہا۔ دونوں میاں بیوی چپ چاپ کھانا کھانے لگے۔ دونوں چھوٹے سے چھوٹا نوالہ کھانے کی کوشش کر رہے تھے۔

Scanned with CamScanner

دوسرا زیادہ کما سکے۔

'' ایسے کب تک چلے گا؟'' ممتاز نے شوہر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

'' وہی تو میں بھی سوچ رہا ہوں کہ کچھ تو کرنا پڑے گا... اب فیکٹری کا آسرا تو ہے نہیں۔'' ظفر نے ہاتھ سے نوالہ پلیٹ میں چھوڑتے ہوئے کہا

ظفر کو نوالہ چھوڑتے دیکھ کر ممتاز کو اپنی غلطی کا احساس ہوا کہ اس نے غلط وقت پر غلط بات کہہ دی۔

'' کھانا تو کھا لو۔ فکر کرنے کو تو عمر پڑی ہے۔'' ممتاز نے شوہر کے ہاتھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ظفر نے پھر سے کھانا شروع کر دیا۔

'' سوچتا ہوں کہ کل گجرات کی طرف چلا جاؤں۔ سنا ہے، وہاں کچھ فیکٹریوں میں بھرتی چل رہی ہے لیبر کی۔'' ظفر نے سر جھکائے جھکائے ہی کہا۔

'' ہاں، پچھلی بار جیسا نہ ہو، دیکھ بھال کے جانا۔'' ممتاز نے بھی اسی طرح سر جھکائے ہوئے کہا

'' اب جو ہونا ہے وہ ہوتا رہے، اس پر تو کسی کا بس نہیں ہے۔'' ظفر نے تھوڑے سخت لہجے میں کہا۔ کنپٹیوں کی نسیں کچھ ابھر آئیں۔

دو مہینے پہلے بھی ظفر نے ایک جگہ کام کے لیے کوشش کی تھی۔ فیکٹری کے منیجر نے مضبوط قد کاٹھی دیکھ کر اسے رکھنے پر اپنی رضامندی بھی دے دی تھی مگر جب یہ ڈائریکٹر کے سامنے پیش ہوئی تو ظفر کی قسمت اس کے مذہب کے سامنے ہار گئی۔ باہر نکلتے وقت ظفر کے کان میں وہ جملے بھی پڑے تھے جو پیچھے ڈائریکٹر منیجر سے کہہ رہا تھا: '' تم کو کچھ عقل بھی ہے کہ نہیں؟ یہ لوگ بھروسے کے قابل بھی ہوتے ہیں؟ سیٹھ ویسے ہی ان لوگوں سے چڑتا ہے۔ خود تو جاؤ گے، ساتھ میری نوکری بھی لے ڈوبو گے۔'' یہ ڈائریکٹر کی کہی بات ظفر کے کانوں میں لاوے کی طرح اتر گئی۔

آدمی نے اپنی بے ایمانی اور کمینے پن کو چھپانے کے لیے مذہب کا لفظ گڑھ لیا ہے۔ یہ لفظ حقیقت میں آدمی نے پوری آدمیت کے کمینے پن کو اجاگر ہونے سے بچنے کے لیے گڑھا ہے۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ وہ لوگ بے ایمان ہیں اور وہ لوگ کہتے ہیں کہ یہ بھروسے کے لائق نہیں ہیں۔ 'یہ لوگ' 'وہ لوگ' کے چکر میں پوری آدمیت اپنی بے ایمانی، اپنا کمینہ پن چھپا کر معصوم بنی رہتی ہے۔

Scanned with CamScanner

ممتاز نے ظفر کی کنپٹیوں اور ماتھے کی رگوں کو ابھرتے دیکھا تو دھیرے سے کہا: "سب لوگ ایک جیسے تھوڑے ہی ہوتے ہیں۔" کھانا ختم کر کے ظفر لوٹا ہاتھ میں لے کر باہر ہاتھ دھونے چلا گیا۔ ممتاز برتن سمیٹ کر اندر چلی گئی۔

اگلے دن صبح جب ظفر کام پر پہنچا تو وہاں کا ماحول پچھلے دنوں جیسا ہی تھا۔ سارے مزدور ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے تھے۔ ظفر بھی جا کر وِنے کے پاس بیٹھ گیا۔ وِنے پڑھا لکھا لڑکا ہے، ظفر سے عمر میں بھی کم ہے، پھر بھی دونوں میں خوب بنتی ہے۔

"آؤ ظفر بھائی، تم بھی دیکھو تماشا!" وِنے نے طنزیہ لہجہ میں کہا۔

"تماشا؟ آج کیا ہونے والا ہے؟" ظفر نے پوچھا۔

"سنا ہے آج سب فائنل ہو جائے گا، اپنے اپنے گھر جاؤ، کاندا (پیاز) روٹی کھاؤ۔" وِنے نے طنز کے ساتھ ہنستے ہوئے کہا۔

"کھاؤ تو تب نا جب گھر میں ہو!" ظفر نے طنز کا جواب طنز میں دیا۔

"پوری کویتا سنو، تمھارے سوال کا جواب مل جائے گا۔ اپنے اپنے گھر جاؤ، کاندا روٹی کھاؤ، کاندا روٹی نہ ملے تو چوہے کی پونچھ کتر کر کھاؤ۔" وِنے نے کویتا گا کر سناتے ہوئے کہا۔

"غریبوں کے گھر یہ چوہے کیا بھوکے مرنے آئیں گے؟ آخر چوہوں کا بھی تو پیٹ ہوتا ہے۔ جس گھر میں انسانوں کو ہی دو وقت کی میسر نہ ہو رہی ہو، وہاں کے چوہوں کو روزے نہیں رکھنا پڑیں گے تو اور کیا ہوگا" ظفر نے کہا۔

"ظفر بھائی، کویتا میں نے تو نہیں بنائی! جس نے بنائی اس نے چوہے کی پونچھ ہی کترنے کو کہا ہے۔" وِنے نے ہنستے ہوئے کہا۔

"ضرور کسی بھرے پیٹ والے نے لکھی ہوگی یہ کویتا، جس کے گھر میں چوہے ہوتے ہوں گے۔ یہاں تو بچے ہی دو وقت کے لیے ترس رہے ہیں۔" ظفر نے کچھ حقارت کے ساتھ جواب دیا۔

"اب کرو گے کیا؟ یہاں تو سنا ہے آج ہی سب کچھ فل اور فائنل ہونے والا ہے۔" وِنے نے ظفر کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"دیکھوں گا، جہاں مجھے مسلمان ہونے کے باوجود کام مل جائے۔" ظفر کے لہجے میں

Scanned with CamScanner

کڑواہٹ تھی۔

"ظفر بھائی، ہندو مسلمان تو کوئی دھرم ہے ہی نہیں، اصل دھرم تو دنیا میں دو ہی ہیں: امیری اور غریبی۔ بھرے پیٹ والوں کا دھرم اور خالی پیٹ والوں کا دھرم۔ جب تک آدمی کا پیٹ خالی ہے تب تک اسے نہ تو یہ یاد رہتا ہے کہ میں ہندو ہوں، اور نہ یہ کہ سامنے والا مسلمان ہے۔ مگر جہاں پیٹ بھرا، وہاں فوراً یہ یاد آ جاتا ہے کہ میں ہندو ہوں یا مسلمان۔" ونے نے ظفر کے لہجے کی کڑواہٹ کو محسوس کرتے ہوئے دلائل کے انداز میں یہ بات کی۔

ظفر نے کوئی جواب نہیں دیا۔ چپ چاپ زمین کریدتا رہا۔

"جب پیٹ میں روٹیاں چھم چھم کر کے ناچ رہی ہوں، تب ہوتا ہے آدمی ہندو یا مسلمان، ورنہ تو ہم ایک ہی ذات کے ہیں، بھک مروں کی ذات کے۔ ہندو یا مسلمان ہونے کا رئیسانہ شوق پالنا ہماری اوقات سے باہر کی چیز ہے۔" ونے نے ظفر کے غصے کو کم نہ ہوتے دیکھ کر اپنی بات کو بڑھایا۔

"تو پھر میں کہاں جاؤں؟ غریبوں کی فیکٹریاں تو ہوتی نہیں ہیں، ہوتی تو رئیسوں کی ہی ہیں، اور رئیسوں کے لیے میں یا تو مسلمان ہوں یا ہندو۔ وہ لوگ جن پر بھروسا نہیں کیا جا سکتا۔" ظفر نے پھر طنز کا تیر چلایا۔ ونے لاجواب ہو کر اسے دیکھتا رہا۔

"جیسے ہی اپنا نام بتاتا ہوں، ویسے ہی لوگوں کے ماتھے پر شکن پڑ جاتی ہے، جیسے میں مسلمان نہ ہو کر کوئی جانور ہوں۔ کیا مجھے سب دکھائی نہیں دیتا ہے؟ اور بے ایمانی تو آدمی کی سرشت میں ہے لیکن یہ بے ایمانی ہمیشہ بھرے پیٹ والے ہی کرتے ہیں۔ ہم جیسے بھک مرے لوگوں کو روٹی کا مسئلہ حل کرنے سے ہی فرصت کب ملتی ہے جو بے ایمانی جیسے امیروں کے شوق پالیں۔" ظفر نے ونے کو خاموش دیکھ کر کہا۔

"اور، بچے کیا کرتے ہیں دن بھر؟" ونے نے بات کو گمبھیر ہوتے دیکھ کر موضوع بدلا۔

"کرتے کیا ہیں! جب تک یہاں کا کام چلتا تھا، اسکول بھی جاتے تھے، پر اب تو حالت یہ ہے کہ دن بھر مارے مارے محلے میں پھرتے ہیں۔" ظفر نے جواب دیا۔

"اتنے کام پر کیوں نہیں لگا دیتے؟ چار پیسے لائیں گے تو تم کو بھی سہارا ہو جائے گا۔" ونے نے کہا۔

''ہاں اب تو یہی کرنا پڑے گا۔ سوچتا تھا کہ فیکٹری میں کام چالو ہو جائے گا تو پھر سے اسکول بھیجنا شروع کر دوں گا۔ بچوں کے ہاتھوں میں پیچ کش اور پانے پکڑانا نہیں چاہتا تھا، پر ایسا لگتا ہے کہ یہی قسمت میں لکھا کر آئے ہیں۔ وہ تو بھلا ہو ممتاز کا کہ اسے کچھ سینا پرونا آتا ہے، تھوڑا بہت ادھر ادھر کا کام کر کے گھر کا چولہا سلگا لیتی ہے۔'' ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے ظفر نے کہا۔

''کوئی ضروری ہے کہ بچوں کو مکینک ہی بناؤ؟ اور بھی تو کام ہیں۔'' وہ نے بولا۔

''جو لوگ مجھے مسلمان ہونے کی وجہ سے کام نہیں دے رہے ہیں، وہ میرے بچوں کو دیں گے کیا؟'' ظفر نے پھر تلخی سے کہا۔

''ایک کام ہے تو سہی، اور روز روز کا بھی نہیں ہے، بس ہفتے میں ایک دن کرنا ہے۔ تینوں بیٹے ایک دن میں ہی اتنا کما لیں گے کہ گھر بھی چل جائے گا اور اسکول بھی جانے لگیں گے۔'' وہ نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

''کوئی غلط کام ہی ہوگا۔'' ظفر نے کہا

''غلط کا مطلب چوری وغیرہ تو نہیں، ہاں تمہارے مذہب کے حساب سے وہ ضرور ہے جسے تم وہ۔۔۔ کیا کہتے ہو۔۔۔ ہاں کفر۔ کفر ضرور ہے۔'' وہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''کفر کی تو تب سوچیں جب پیٹ میں روٹیاں ہوں۔ خالی پیٹ والوں کے لیے کیا کفر اور کیا اس کا ڈر!'' ظفر نے کہا۔

''تو چلو میرے ساتھ۔'' وہ نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''کہاں؟ پہلے یہاں کا فیصلہ تو سن لیں۔'' ظفر نے حیرانی ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

''فیصلہ تو ہو چکا ہے۔ اب ہمارے سننے یا نہ سننے سے کوئی فرق نہیں پڑنے والا۔ تم چلو تو میرے ساتھ۔'' وہ نے ہاتھ پکڑ کر ظفر کو اٹھاتے ہوئے کہا۔

''پر چلنا کہاں ہے؟''

''چلو تو سہی، تمہیں کچھ سامان دلاتا ہوں۔'' وہ نے بولا۔

''سامان؟ یہاں تو روٹیوں کے لالے پڑے ہیں اور تم سامان خریدنے کی بات کر رہے ہو۔'' ظفر نے پھر حیرانی سے پوچھا۔

"ابھی ادھار دلوا دیتا ہوں، پرسوں آ کر پیسے [illegible] جانا۔"

"کہاں [illegible] جاؤں گا؟ کیا کل پیسے آسمان سے ٹپک پڑیں گے؟" ظفر نے پھر سوال کیا۔

"آسمان سے کیوں، ابھی رئیسوں کے پاس سے آئیں گے [illegible]" [illegible] نے کہا۔

"کیسے آئیں گے؟" چلتے ہوئے ظفر نے پوچھا۔

"[illegible] معلوم ہو جائے گا۔ تم چلو تو سہی۔" کہتے ہوئے [illegible] نے ظفر کو بازو سے پکڑ کر کھینچ لیا۔

شام [illegible] سامان کا تھیلا لیے ہوئے ظفر گھر پہنچا تو [illegible] حیرت میں پڑ گئی۔

"یہ [illegible]؟" ہاتھ کا بوجھ پکڑتے ہوئے اس نے پوچھا۔

"گھر کا سامان ہے [illegible] نے دلوایا ہے۔ کل [illegible] بچوں کو کام پر بھیجنا ہے۔ اور ہاں، ایک تھیلی میں کچھ [illegible] بھی ہے۔ [illegible]" ظفر نے جواب دیا۔

"کام پر بھیجنا ہے؟ کہاں؟" ممتاز نے پوچھا۔

"[illegible] کل [illegible]" [illegible] مختصر سا جواب دے کر بات کو ختم کر دیا۔

[illegible] ظفر نے بچوں کو [illegible] ہوں۔

ممتاز [illegible] ظفر بچوں کو [illegible] تھا۔

ممتاز نے دیکھی تو [illegible] بولی "[illegible] خدا [illegible]"

"کچھ غرض نہیں ہے۔ بس ایک دن کا [illegible]" ظفر نے لاپروائی سے کہا۔

"ذرا تو خدا کا خوف کرو!" ممتاز نے کہا۔

Scanned with CamScanner

"اس میں برا کیا ہے جو ڈروں؟ کوئی چوری ڈکیتی جیسا کام تو کروا نہیں رہا میں اپنے بچوں سے۔" ظفر نے جواب دیا۔

"مگر پاس پڑوس والے کیا کہیں گے؟" ممتاز نے پھر سوال کیا۔

"کوئی کچھ نہیں کہے گا منہ اندھیرے ہی نکلیں گے ہم تو شام ڈھلتے ہی واپس آئیں گے۔ کوئی دیکھے گا ہی نہیں تو بولے گا کیا!" ظفر نے بڑی لاپرواہی سے کہا۔

"مگر..." ممتاز نے کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن ظفر نے ہاتھ کا اشارہ کر کے بات کاٹتے ہوئے کہا "بس اب اس بارے میں کوئی بات نہیں ہوگی۔"

ممتاز نے خاموشی سے سر جھکا لیا اور کچھ نہیں بولی۔

ظفر نے چھوٹے بیٹے کے گال تھپتھپائے اور بولا "تم دونوں ویسا ہی کرنا جیسا میں نے بتایا ہے۔ اس میں شرم کی کوئی بات نہیں، ہمت کرو گے تو سب معاملہ ٹھیک ہو جائے گا۔"

بڑے بیٹے نے جواب دیا "جی ابو..."

"ایک بار اپنی امی کے سامنے چل کر پریکٹس کر لو۔" ظفر نے کچھ مسکرا کر ممتاز کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

دونوں بچے ممتاز کی طرف بڑھے اور اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی اسٹیل کی لٹکن کو اوپر اٹھاتے ہوئے ایک آواز میں بولے "بے تی مہاراج!"

❁❁

پنکج سبیر

ہندی سے ترجمہ: ثریا علوی

گھیراؤ

واقعے کو دیکھا جائے تو کوئی اتنا بڑا واقعہ نہیں تھا جس پر اتنا واویلا مچایا جائے، ایک ہنگامہ کھڑا کر دیا جائے۔ لیکن اگر شہر کی تاریخ دیکھیں تو یہی چھوٹا سا واقعہ بارود کے گھر میں چھوٹی سی آگ ثابت ہو سکتا ہے۔ شہر کے کچھ آوارہ شہدے اسکول سے لوٹتی ہوئی دو بہنوں کو روز چھیڑتے تھے۔ بہنوں کے ساتھ مشکل یہ تھی کہ ان کے گھر میں مرد نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ ان کے باپ بینک میں نوکری کرتے تھے جن کے اچانک گزر جانے کے بعد ماں کو بینک میں نوکری مل گئی تھی۔ اس گھر میں یہ لڑکیاں تھیں ماں اور دو بیٹیاں۔ دونوں بہنیں چپ چاپ سر جھکائے ان آوارہ لڑکوں کی چھیڑ چھاڑ کو برداشت کرتی گھر لوٹ آتی تھیں۔

ایک مرتبہ اسکول کے پرنسپل سے بھی دونوں نے شکایت کی، جس پر پرنسپل نے پولیس میں شکایت بھی درج کر دی، لیکن اگر کہاوت کی زبان میں بات کی جائے تو حالات ویسے کے ویسے ہی رہتے۔ پولیس نے آکر ان دونوں بہنوں سے ایسے ایسے سوال پوچھے کہ اس کے بعد ان کی ہمت ہی نہیں ہوئی کہ کہیں اور شکایت درج کرواتیں۔ پولیس کی طرف سے گویا جب ہری جھنڈی مل گئی تو شہدوں کی ہمت اور بڑھ گئی۔ بہنوں کے پاس سے تیز رفتار سے موٹر سائیکل گزارنا، [illegible] جیسی حرکتیں اور بڑھ گئیں۔

یہ جو واقعہ ہوا اس کی کڑیاں بھی وہیں سے جڑتی تھیں، اور وہ بات صرف [illegible] تک تھی [illegible]

والے مسلمان تھے۔

ہاں، تو ہوا اس طرح کہ راستے میں دوپٹہ کھینچنا، چھیڑنا جیسے واقعات کوئی ایک لڑکا نہیں کرتا تھا، یہ سبھی کی ملی جلی کوششیں تھیں، مگر وہ لڑکا کچھ زیادہ جوش میں آ گیا تھا۔ اتوار کے روز جب صبح صبح جب وہ لڑکی کے گھر کے سامنے سے موٹر سائیکل پر جا رہا تھا تو اس نے دیکھا کہ بڑی بہن گھر کے باہر رسی پر کپڑے پھیلا رہی ہے۔ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، موٹر سائیکل کھڑی کی اور دوڑ پڑا۔ جب تک وہ لڑکی کچھ سمجھتی، تب تک اس نے اسے بانہوں میں بھرا اور جگہ جگہ چوم لیا۔ چومنے کے بعد موٹر سائیکل اٹھائی اور یہ جا وہ جا۔ روتی ہوئی لڑکی اندر پہنچی اور ماں کو ساری بات بتائی۔ ماں بھی شاید اسی دن کی تاک میں تھی؛ چونکہ چھیڑنے والے لڑکے آدھے ہندو تھے آدھے مسلمان، اس لیے اس کا کوئی بھی داؤ نہیں لگ رہا تھا، مگر آج جو آیا تھا وہ تو صرف اور صرف مسلمان تھا، اور لڑکی ہندو تھی۔

ماں نے باہر نکل کر چھاتی پیٹ پیٹ کر رونا شروع کر دیا۔ بات کی بات میں لوگ جمع ہو گئے۔ ماں نے جو تصویر لوگوں کے سامنے پیش کی اس میں یہ کہیں نہیں تھا کہ آوارہ لڑکا آ کر میری لڑکی کے ساتھ غلط حرکت کر کے چلا گیا۔ تصویر تو کچھ اس طرح سے سامنے آئی کہ ایک مسلمان لڑکا ہندوؤں کے محلے میں آ کر ایک ہندو لڑکی کے ساتھ غیر مہذب سلوک کر کے چلا بھی گیا۔ ماں جانتی تھی کہ جب تک لڑکے کے آوارہ پن کو نمک مرچ لگاتے ہوئے مسلمان نہ بتایا جائے تب تک کچھ نہیں ہونے والا ہے۔

لڑکیوں کی ماں کا تیر بالکل نشانے پر بیٹھا۔ بھیڑ میں شامل جوان لڑکوں کی مچھلیاں ماں کی بات سنتے ہی پھڑک اٹھیں۔ کب بنا، کس نے بنایا یہ منصوبہ، یہ تو کوئی نہیں جانتا، لیکن ہوا یوں کہ وہ جو ہونا تھا، ہو گیا۔ رات کو وہ لڑکا اپنے ایک دوست کو لے کر پھر آیا۔ مگر اس کی بدقسمتی کہ صبح سے رات ہونے تک وہ آوارہ لڑکا نہیں رہا تھا، وہ اب مسلمان ہو چکا تھا۔ اور ادھر ایک بھرا پڑا ہندو دھرم اس کی وجہ سے اپنے کو، اپنی عزت و آبرو کو خطرے میں محسوس کر رہا تھا۔ حالانکہ یہ سوال اب بھی لاجواب ہے کہ اگر اتوار کی اس صبح وہ لڑکا جوش میں نہ آتا اور اس کے ساتھ والا کوئی ہندو لڑکا جوش میں آ کر وہی حرکت کر جاتا تو کیا ہوتا!

خیر، تو ہوا یہ کہ صبح کے خمار میں ڈوبا وہ لڑکا شام کو پھر لوٹا، مگر اس شام اس کا آنا ایسا رہا کہ پھر اس کا ہونا نہیں ہوا۔ ادھر اس نے اپنی موٹر سائیکل کو لڑکی کے گھر کے سامنے روکا اور ادھر کسی نے

Scanned with CamScanner

ٹرانسفارمر کا کٹ آؤٹ نکال کر پورے محلے کی بجلی گل کر دی۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ کیا ہوا؟ یہ کوئی نہیں جانتا۔ ہر کوئی یہی کہتا ہے کہ وہ تو اس وقت اندھیرے میں تھا۔ شور شرابا، مار پیٹ، چلانے کی، کراہنے کی آوازیں، ہڈیوں کے چٹخنے کی آوازیں یہی سب کچھ پندرہ بیس منٹ تک ہوتا رہا۔ پھر کچھ بھگدڑ سی مچی اور خاموشی چھا گئی۔ یہ اندھیرے کی خاصیت ہے کہ اس میں ہونے والے واقعات کا خاتمہ خاموشی پر ہی ہوتا ہے۔ کافی دیر تک خاموشی چھائی رہی، خونی تو پولیس کے آنے پر۔ واقعے کا خاص کردار تو جائے وقوع پر ہی ختم ہو چکا تھا، مگر اس کا ساتھی صرف اس لیے زندہ تھا کیونکہ ابھی اس کی سانسیں چل رہی تھیں۔ مرنا اس کو بھی تھا، سو وہ بھی اسپتال میں رات بھر زندہ رہنے کے بعد صبح سدھار گیا۔

دیکھا جائے تو واقعہ یہیں پورا ہو جانا چاہیے تھا کیونکہ جو ہونا تھا وہ ہو چکا تھا۔ مگر در اصل واقعہ یہیں سے شروع ہوتا ہے۔ دونوں لڑکوں کے مرنے کے بعد وہ اور زبردست طریقے سے مسلمان ہو گئے۔ زبردست سے مراد ہے کہ ان کے مرنے سے پہلے ہندوؤں کو لگا تھا کہ یہ مسلمان ہیں، مگر مرنے کے بعد مسلمانوں کو بھی لگا کہ ارے، وہ تو مسلمان تھے۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ اس تیرہ سال کے لڑکے سنی نے ہی اپنے باپ کے موٹر سائیکل کے شوروم سے پرانا سائلنسر اٹھا کر اس سے دونوں لڑکوں کے سر پر وار کیے تھے، جس سے وہ مر گئے۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ سنی کا واقعے کے دو بڑے کرداروں یعنی دونوں لڑکیوں میں سے چھوٹی کے ساتھ چکر تھا اور اپنی محبوبہ کے سامنے اپنی بہادری دکھانے کا یہ سب سے اچھا موقع جب اسے ملا تو اس نے اسے ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ اس بات کو کچھ لوگ یہ کہہ کر کاٹ دیتے ہیں کہ بھلا تیرہ سال کے بچے کا بھی ایسا کوئی چکر ہو سکتا ہے۔ تو اس پر جواب ملتا ہے، ٹی وی سیریل دیکھنے والے بچے ہیں بھئی! ادھر ماں کا دودھ چھوڑتے ہیں اور ادھر جوان ہو جاتے ہیں۔

اس پورے معاملے پر (یقیناً ہندو) کہتے ہیں کہ مرنے والا دوسرا لڑکا سنی کے باپ کے شوروم پر کام کرتا تھا، جہاں سے اسے نکال دیا گیا تھا، بس اسی عداوت میں اس نے مارنے والوں میں سنی کا نام بھی لکھوا دیا اور مر گیا۔ کچھ لوگ (یقیناً مسلمان) کہتے ہیں کہ مرنے والے لڑکے کے ساتھ سنی کی بہن کا کچھ چکر ہو گیا تھا اور اسی وجہ سے سنی کے باپ نے اسے اپنے یہاں سے ہٹا دیا تھا، اور اسی بات کا بدلہ سنی نے اس سے اس روز لیا، اسے اتنا مارا کہ وہ مر ہی گیا۔ جتنے منہ اتنی باتیں، اس لیے بھی کہ

واقعے کے وقت اندھیرا بھی تھا اور بھیڑ بھی تھی۔ یہ دونوں ہی اندھی چیزیں ہیں؛ نہ تو بھیڑ کی آنکھیں ہوتی ہیں اور نہ اندھیرے کی — یہ دونوں چیزیں اکیلے اکیلے ہی بہت خطرناک ہوتی ہیں، اگر دونوں مل جائیں تو پھر کیا کہنا!

خیر، تو دونوں لڑکے مرنے کے بعد مسلمان ہو گئے۔ دونوں کے گھر قریب ہی قریب واقع تھے۔ جب دونوں کی لاشیں گھر لائی گئیں تب تک اس محلے کے سارے لڑکے اسی طرح سے مسلمان ہو چکے تھے جس طرح سے پچھلی رات اُس محلے کے لڑکے ہندو ہو گئے تھے۔ بات کی بات میں 'خون کا بدلہ خون' جیسے نعرے اچھلنے لگے۔ شہر میں اس سے پہلے ہی تین فرقہ وارانہ فسادات ہو چکے تھے، اس لیے پولیس بھی فوراً حرکت میں آ گئی۔ اور ساتھ ہی ساتھ حرکت میں آ گئی صحافی برادری، جن میں سمیر بھی تھا — یک ٹی وی چینل کا نیوز اسٹرنگر۔

شہر میں تناؤ کب ہو گیا، کسی کو پتا ہی نہیں چلا۔ رات میں ٹھیک ٹھاک سوتے لوگوں نے جب صبح آنکھیں کھولیں تو شہر تناؤ کی فضا میں تھا۔ جیسے جیسے دن چڑھنے لگا، لوگ دھیرے دھیرے لوگوں سے ہندوؤں اور مسلمانوں میں بدلنے لگے۔ پولیس انھیں واپس لوگوں میں بدلنے کی کوشش میں لگ گئی تو صحافی لوگوں میں آئی تبدیلی کو سرخیوں میں ڈھالنے میں جٹ گئے۔ سمیر کا اپنے چینل پر تین بار 'فونو' ہو چکا تھا۔ تینوں بار نیوز کاسٹر نے اس سے ایک ہی بات پوچھی تھی: "ہاں سمیر جی، بتائیے، کیا صورت حال ہے وہاں؟" اور تینوں بار سمیر نے ایک ہی سا جواب دیا تھا: "جی ہاں، کافی تناؤ ہے، حالانکہ ابھی کسی بھی ناخوشگوار واقعے کی اطلاع نہیں ملی ہے کہیں سے، اور پولیس صورت حال کو قابو میں رکھنے کی کوشش کر رہی ہے، پھر بھی چاروں طرف دہشت کا ماحول ہے۔"

دلّی میں بیٹھے نیوز ایڈیٹر بے چینی سے انتظار کر رہے تھے کہ کچھ ہو جائے، مگر یہاں کا تناؤ واقعات میں بدل نہیں پا رہا تھا۔ خبروں کی دنیا ہی ایسی ہے — یہاں روز کچھ چاہیے ہوتا ہے۔ کل جو کچھ بھی ہوا وہ پچھلے اہم ہی ہوا اور ہو گیا ہو، مگر وہ آج کی سرخی نہیں بن سکتا۔ آج تو کچھ نہ کچھ نیا ہی چاہیے، کچھ ایسا جو آج کا ہی ہو۔

پولیس سرگرم تھی تو صرف اس بات کو لے کر کہ دونوں مرے ہوئے لڑکوں کو جلد از جلد دفنا دیا جائے۔ پولیس کو پتا تھا کہ لاشیں سیاست کرنے کا بہترین ذریعہ ہیں۔ جب تک لاشیں گھر میں رکھی

Scanned with CamScanner

رہیں گی تب تک یہ تناؤ بھی رہے گا۔ ڈی ایس پی خود گھر والوں سے کئی بار منتیں کر چکے تھے کہ جلدی سے جنازے اٹھائے جائیں، لیکن لڑکوں کے گھر والے ہر بار ٹکا سا جواب دے کر لوٹا رہے تھے۔ "خون کا بدلہ خون" کے نعروں کے بیچ اب چہ میگوئیاں شروع ہو چکی تھیں کہ جب تک سنی کے خلاف تین سو دو کا مقدمہ درج نہیں کیا جائے گا تب تک جنازے نہیں اٹھیں گے۔ ڈی ایس پی ماتھے کا پسینہ پونچھتے ہوئے کبھی وائرلیس پر چنگھاڑتے ہوئے ایس پی کو جواب دیتے تو کبھی نیوز چینل والوں کو سیل فون پر موقعے کی جانکاری دے رہے تھے۔

دوپہر ہونے تک بھی جب جنازے نہیں اٹھے تو آخر میں ایس پی کو آنا پڑا۔ ایس پی روندکر کی گھٹی ہوئی پلومیٹ تھا۔ اس نے لڑکوں کے خاندان والوں کو اس بات کی یقین دہانی کرائی کہ سنی کے خلاف تین سو دو کا مقدمہ درج ہوگا، آپ جنازے اٹھائیے۔ اور آخرکار جنازے اٹھے۔ بڑی تعداد میں پولیس کے جوان ڈی ایس پی کے ساتھ تھے تو پیچھے بھی اتنی ہی پولیس سنی کوتوالی کے تھانہ انچارج کے ساتھ۔ دوران کے ساتھ تھے صحافی، پل پل کی خبریں سیل فون کے ذریعے نشر کرتے: "ہاں خالق، یہاں سے جنازے نکل گئے ہیں، پولیس کی بھاری نفری ساتھ ہے۔"

ویسے تو پولیس کو بھی پتہ رہا تھا کہ سب پلاننگ کے مطابق ہی ہو رہا ہے، لیکن کہتے ہیں نا۔ بھیڑیے اور بھیڑ کا کوئی بھروسا نہیں۔ جس نے بھیڑ کا اعتبار کیا اس سے بڑا بیوقوف کوئی نہیں۔ تو جوں ہی ڈی ایس پی کی یہاں پر مار کھا گیا۔ جنازے کی نماز کے بعد جنازہ مسجد سے آگے بڑھا تو بھیڑ کے تیور بدل چکے تھے۔ جس وقت ڈی ایس پی کو وائرلیس پر باخبر رکھا جا رہا تھا کہ "سر، یہاں سب ٹھیک ہے۔" ٹھیک اسی وقت جنازہ شہر کے صدر چوراہے پر رکھا جا چکا تھا اور بھیڑ نے باقاعدہ پہیہ جام بھی شروع کر دیا تھا۔

چوراہا ٹھیک اس جگہ پر تھا جہاں سے دونوں محلے الگ ہوتے ہیں۔ یعنی مرنے والوں کا محلہ اور مارنے والوں کا محلہ۔ نعرے بازی اور شور شرابے کے بیچ آناً فاناً دکانوں کے شٹر گرے اور افراتفری کا ماحول پیدا ہو گیا۔ گھروں میں دبکے لوگ سانس تھامے، اب کچھ ہوا تب کچھ ہوا کا انتظار کرنے لگے۔ چینلوں کے اینکر سیل فون پر چیخنے لگے:

"ہاں پریہ ورش، یہاں پر جیسا کہ خدشہ تھا ویسا ہی ہوا ہے۔ جنازے کو چوراہے پر رکھ کر پہیہ

Scanned with CamScanner

جام کر دیا گیا ہے۔ ساری دکانیں بند کر دی گئی ہیں۔'' ''جی اخلاق، تناؤ گہرا ہے۔ پورے بازار کی دکانیں بند ہو چکی ہیں۔'' اور انھی سب کے بیچ سمیر بھی تھا۔ پندرہ دن پہلے ہی دلّی سے اسٹر نگر تعینات ہوا تھا۔ اس کے لیے یہ بڑا واقعہ تھا۔

ایس پی نے خود پہنچ کر پہیہ جام کرنے والوں کو سمجھانے کی کوشش کی مگر بھیڑ ڈی ایم سے بات کرنا چاہ رہی تھی۔ انھیں سنی کی گرفتاری کے ساتھ ساتھ پانچ پانچ لاکھ کا معاوضہ بھی چاہیے تھا۔ ایس پی نے ڈی ایم وندنا سکسینہ سے بات کی۔ تھوڑی نا ں ہاں کے بعد وہ جائے وقوعہ پر آ گئیں۔ ڈی ایم کو دیکھ کر بھیڑ پورے جوش میں آ گئی۔ مانگوں کے نعرے لگنے لگے۔ ڈی ایم نے معاوضے سے متعلق اپنی مجبوری بتائی کہ ڈی ایم کے اختیار میں جتنا ہوتا ہے میں اس سے زیادہ نہیں دے سکتی۔ بھیڑ دوبارہ سنی پر مقدمہ درج کرنے کی مانگ پر اڑ گئی۔ ''جب تک سنی پر تین سو دو کا مقدمہ درج نہیں ہوتا، تب تک جنازوں کو نہیں اٹھایا جائے گا۔''

''نہیں سر، ایسی کوئی گمبھیر صورت حال نہیں ہے،'' ڈی ایس پی، روندکمار نے سیل فون پر آئی جی کو جواب دیا۔

''کیا گمبھیر نہیں ہے؟ ابھی کسی چینل سے بتایا جا رہا تھا کہ صورت حال کشیدہ ہے، کچھ بھی ہو سکتا ہے!'' اُدھر سے آئی جی کی پھٹکار آئی۔ ''جلدی حالات قابو میں لائیے اور مجھے بتائیے،'' کہتے ہوئے آئی جی نے فون کاٹ دیا۔

ایس پی نے پاس سے گزرتے ہوئے سمیر کو روک کر پیشانی پر آئے پسینے کو پونچھتے ہوئے کہا، ''سمیر جی پلیز! تھوڑا لو پروفائل رکھیے معاملے کو... آخر آپ بھی تو شہر کا ہی بھلا چاہتے ہیں۔''

''بس، تو آپ کر سکتے ہیں اس پہیہ جام کو ناں کر انہیں تو ابھی کچھ کا کچھ ہو جائے گا،'' سمیر نے جواب دیا۔

''وہ تو ہم کر ہی رہے ہیں، پر آپ دیکھ رہے ہیں کہ وہ لوگ ڈی ایم کی بھی نہیں سن رہے ہیں،'' ایس پی نے سمجھانے کے انداز میں کہا۔

''اروند جی، آپ صحافیوں کو منع کرنے کے بجائے جا کر بھیڑ کو منع کیجیے، وہ زیادہ بہتر ہے،'' سمیر نے جواب دیا۔ اروندکمار نے گہری نظروں سے سمیر کی طرف دیکھا۔ سمیر آگے بڑھ گیا۔

Scanned with CamScanner

"ایس پی صاحب، آپ ان لوگوں کے سامنے بچی پر مقدمہ درج کرنے کی کارروائی کریں۔ یہ لوگ جنازہ اٹھا لیں گے۔" ڈی ایم وندنا سکسینہ نے، جو بزرگ نظر آنے والے لوگوں کے ساتھ جائے وقوعہ سے آئی تھیں، اروند کمار سے کہا۔

"جی میڈم۔" اروند کمار نے جواب دیا۔

"چلیے، آپ لوگ بھی بچی کو توالی تک چلیں۔ آپ لوگوں کے سامنے ہی ساری کارروائی ہو جائے گی۔" وندنا سکسینہ نے ساتھ آئے لوگوں کی طرف دیکھتے ہوئے نرم لہجے میں کہا۔

"بہت اچھا میڈم۔" ان میں سے ایک نے جواب دیا۔

بچی کو توالی میں اروند کمار نے خود اپنے ہاتھ سے بچی کا مقدمہ درج کیا۔ وندنا سکسینہ نے ان لوگوں کو روزنامچہ دکھایا۔ مطمئن ہو کر وہ لوگ واپس چلے گئے۔ تھوڑی دیر میں پہیہ جام ختم ہو گیا اور جنازے بڑھ گئے۔

"جی، یہاں صورت حال اب ٹھیک ہے۔ ایس پی اروند کمار نے خود اس تیرہ سالہ لڑکی کے خلاف قتل کا مقدمہ درج کر لیا ہے۔" سمیر اپنے سیل فون پر کہہ رہا تھا۔

فون ختم کر کے پلٹتے وقت اروند کمار نے طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا، "صحافی صاحب، اگر آپ تیرہ سالہ لڑکا نہیں لکھتے تو شاید وہ خبر سنسنی خیز نہ ہو پاتا؟"

"اس میں سنسنی خیزی کی کیا بات ہے؟ یہ تو سچ ہے۔" سمیر نے بھی مسکرا کر جواب دیا۔

"وہی تو میں کہہ رہا ہوں کہ سچ بھی آپ کو وہی اچھا لگتا ہے جو سنسنی خیز ہو۔" اروند کمار نے پھر طنز کرتے ہوئے کہا۔

"کیا کریں صاحب یہ تو آپ کی اور ہماری مجبوری ہی ہے کہ ہم دونوں چاہ کر بھی اچھائیوں کی دنیا میں نہیں رہ سکتے۔ ہمارا سامنا اسی سچ سے ہوتا ہے جو برا ہے۔" سمیر نے جواب دیا۔

"چلیے اب فضول بحث کرنے سے کوئی فائدہ نہیں ہے۔ معاملہ ختم ہو گیا، کوئی ناخوشگوار واقعہ نہیں ہوا، یہی بڑی بات ہے۔" وندنا سکسینہ نے دونوں کے بیچ دخل دیتے ہوئے کہا۔

"کیا آپ ایسا سوچتی ہیں کہ معاملہ ختم ہو گیا ہے؟" سمیر نے کچھ گمبھیر لہجے میں وندنا سکسینہ سے کہا۔

Scanned with CamScanner

بھنوؤں کو کچھ تر چھا کرتے ہوئے وندنا سکسینہ نے پوچھا، ''کیا آپ ایسا نہیں سمجھتے؟''

''کوئی بھی سمجھدار شخص ایسا نہیں سوچ سکتا۔ اور خاص کر وہ جو اس شہر کی فطرت سے واقف ہو۔'' سمیر نے بہت نپے تلے انداز میں کہا۔

''کیوں؟'' اس بار سوال اروند کمار نے کیا۔

''وہ اس لیے کیونکہ ابھی آپ نے ایک دھرم والوں کو مطمئن کرتے واقعے کو ٹال دیا ہے۔ اسی دوسرا دھرم تو باقی ہے، جس کا وہ تیرہ سال کا لڑکا ہے جس کے خلاف آپ نے مقدمہ درج کر لیا ہے۔'' سمیر نے جواب دیا۔

''اس سے کیا ہوتا ہے؟'' وندنا سکسینہ نے سوال کیا۔

''اس سے دھرم خطرے میں پڑ جاتا ہے۔'' سمیر نے طنزیہ لہجے میں جواب دیا۔

''مطلب؟'' وندنا سکسینہ نے دوبارہ سوال کیا۔

''مطلب یہ کہ لڑکے کے باپ کو صرف یہی تو کہنا ہے کہ یہ مقدمہ میرے بیٹے کے خلاف نہیں بلکہ پورے ہندو دھرم کے خلاف ہے۔ مذہب خطرے میں ہے۔ اور ہمارے دیش میں بھیڑ اکٹھا کرنے کے لیے سب سے اچھا طریقہ یہی ہے کہ مذہب کو خطرے میں ڈال دو۔'' سمیر نے کچھ لاپروائی کے انداز میں کہا۔

''نہیں نہیں، ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ ایس پی صاحب، آپ حالات پر کڑی نگاہ رکھیں۔ کہیں کوئی افواہیں پھیلانے کی کوشش نہ کرنے پائے۔ اور سمیر جی، آپ بھی تھوڑا دیکھتے رہیے گا، آپ لوگوں کے ہاتھوں میں تو شہر کی نبض ہوتی ہے۔'' کہتے ہوئے وندنا سکسینہ نے ڈرائیور کو اشارہ کر دیا۔ ڈرائیور نے کار آگے لگائی اور وندنا سکسینہ بیٹھ کر اس میں روانہ ہو گئیں۔

''اچھا سر، میں بھی چلتا ہوں۔'' سمیر نے اروند کمار کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

اروند کمار نے گرم جوشی سے ہاتھ ملاتے ہوئے اپنا دوسرا ہاتھ بھی ہاتھ رکھتے ہوئے کہا، ''اچھا سمیر جی، بس تھوڑا ہم لوگوں کا خیال رکھ لیجیے گا۔''

اگلے دن جب صبح لوگ سو کر اٹھے تو شہر بھر میں مذہب کے خطرے میں ہونے سے متعلق خبریں پوری طرح سے بکھر چکی تھیں۔ کمپیوٹر پر کمپوز اور فوٹو کاپی کر کے بانٹے گئے ان پرچوں میں کل

ملا کر ایک ہی بات تھی کہ دھرم خطرے میں ہے اور یکجہتی کی ضرورت ہے۔ اب ان پرچوں کے بارے میں بھی مختلف رائیں ہیں۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ یہ پرچے لڑکے کے باپ نے ہی اپنے شوروم کے کمپیوٹر پر نکلوا کر بھوائے تھے۔ کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ کٹر ہندوتوا کا پرچار کرنے والے اخبار کے مالک سے لڑکے کے باپ کی کل رات خفیہ ملاقات ہوئی تھی اور صبح سویرے اخبار بانٹنے والے ہرکاروں نے ان پرچوں کو گھر گھر پہنچا دیا تھا۔

وجہ چاہے جو بھی رہی ہو لیکن ادھر آسمان سے صبح کی سیندوری سرخی کا رنگ ہٹا اور اُدھر سارے شہر میں یہی رنگ پھیل گیا۔ سارے شہر میں زعفرانی رنگ کی چندری گلے میں ڈالے ہوئے لوگ نظر آنے لگے۔ جیسے جیسے دن چڑھنے لگا، چندریوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا۔ رات کو بانٹے گئے ان پرچوں میں ایک ہوا کی تشکیل کی گئی تھی، اس سے وہ بہادر دستہ حرکت میں آ چکا تھا۔

''نہیں سمیر، فرقہ واریت سوچ رکھنے والی تنظیموں کی کوئی خبر ہمارے چینل سے نشر نہیں ہوتی،'' نیوز ایڈیٹر نے فون پر جواب دیا۔

''لیکن اودھیش جی، یہاں پر کافی تناؤ ہے اور یہ ہندو تنظیمیں اس لڑکے کے باپ کے اشارے پر پورے شہر کو آگ میں جھونکنے کے لیے تیار بیٹھی ہیں،'' سمیر نے پریشانی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

''چاہے جو ہو، ہمارا اصول ہے کہ ہم فرقہ واریت کو ہوا دینے والی کوئی خبر نشر نہیں کرتے، نہ اچھی نہ بری،'' نیوز ایڈیٹر اودھیش چترویدی نے دوٹوک الفاظ میں یہ بات کہی۔

''تو پھر میں کیا کروں؟''

''آپ صورت حال پر نظر رکھیے، کچھ بھی ہوتا ہے تو ہمیں فوراً بتایئے۔''

''ٹھیک ہے اودھیش جی، ہم کچھ ہونے کا انتظار کرتے ہیں،'' سمیر نے طنزیہ لہجے میں کہا اور فون کاٹ دیا۔

گھر کی کھڑکی سے سمیر باہر کی طرف دیکھنے لگا جہاں سیندوری رنگ گاڑھا ہوتا جا رہا تھا۔ کہیں کہیں سے نعروں کی آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔

''چاچو، آپ جا نہیں رہے وہاں؟'' بارہ سال کے بھتیجے نے آ کر پوچھا۔

Scanned with CamScanner

''نہیں بیٹا، ابھی نہیں، جب دنگا ہوگا تب جاؤں گا۔'' سمیر نے اسی طرح کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے کہا۔ بھتیجا چپ چاپ واپس لوٹ گیا۔

کھڑکی کے پاس سے گزرتے ایک جان پہچان کے بجرنگی کو دیکھ کر سمیر نے پوچھا، ''کیوں بھئی، کیا چل رہا ہے؟''

''بس ابھی تو بڑے بازار میں سب کو جمع کیا ہے۔ پھر وہیں فیصلہ ہوگا کہ کیا کرنا ہے۔'' اس شخص نے جواب دیا۔

''پھر بھی کیا پلان ہے؟'' سمیر نے ٹٹولا۔

''ابھی کچھ طے تو نہیں ہے، پھر بھی بازار سے کلکٹریٹ تک ریلی تو نکلے گی۔ مظاہرے اور گھیراؤ کا طے ہونا بھی باقی ہے۔'' اس شخص نے پھر جواب دیا۔

''کتنے لوگ ہو جائیں گے اندازاً ریلی میں؟''

''تین چار ہزار تو ہونے ہی چاہییں۔ ہم نے اس کو سیاسی رنگ نہیں دیا ہے، ہر سچے ہندو کو بلایا ہے۔ یہ بھی سچ ہے کہ مسلمانوں کے اشارے پر ایک تیرہ سال کے معصوم ہندو بچے پر قتل کا مقدمہ درج کرنا ہماری عزت اور وقار پر ایک کاری ضرب ہے، وہ ہمارے ساتھ آئے، ہم نے بھی گزارش کی ہے۔'' اس شخص کا چہرہ کچھ تن گیا۔

''لڑکے کی گرفتاری ہو گئی؟'' سمیر نے سوال کیا۔

''ایسے کیسے ہو جائے گی؟ آگ نہیں لگا دیں گے تھانے کو؟'' اس شخص کا چہرہ مکمل طور پر تن چکا تھا۔

''آپ نہیں آ رہے کورٹ کرنے؟'' اس شخص نے سمیر سے پوچھا۔

''بس آتا ہوں، آپ چلیے۔'' سمیر نے مسکرا کر جواب دیا۔

اس شخص کے جاتے ہی سمیر بھی اٹھ کر جوتے کے تسمے باندھنے لگا۔

جانا تو ہوگا ہی... پتا نہیں کب کیا ہو جائے۔

بڑے بازار کا ماحول کافی جوشیلا تھا۔ ہزاروں لوگ تھے جن میں سے زیادہ تر کے گلوں میں پیلی چندیاں بہادری کی نشانی کے طور پر پڑی تھیں۔ سب کے چہرے تنے ہوئے تھے۔ کچھ نوجوان

نعرے بازی بھی کر رہے تھے۔

"سر جی، سنا ہے وہ لوگ بھی جمع ہو رہے ہیں ادھر سامنے میں۔" ایک نوجوان چندی نے اس سے آکر پوچھا۔

"کون لوگ؟" سمیر نے جانتے ہوئے بھی انجان بنتے ہوئے کہا۔

"وہی بڑے لوگ!... ابھی بھی چھاتی ٹھنڈی نہیں ہوئی ان کی تیرہ سال کے لڑکے کو پھنسوانے کے بعد۔" لڑکے کی سانسوں کے ساتھ اس کو ایک جانی پہچانی بو آئی۔ اس نے مسکرا کر لڑکے کا کندھا تھپتھپایا اور آگے بڑھ گیا۔

"دیکھیے فیصلہ ہو گیا ہے۔ ہم لوگ اپنی پوری طاقت کے ساتھ مظاہرہ کریں گے۔ تب تک عدالت کے دروازے سے نہیں ہٹیں گے جب تک ضلعی انتظامیہ خود ہمیں تحریری طور پر یقین دہانی نہیں کروا دے گی کہ رتنی کے خلاف درج مقدمہ واپس لے لیا جائے گا۔ آپ لوگ یاد رکھیں، ہمیں کل کے واقعے کا کسی طور سے جواب دینا ہے۔ اگر وہ لوگ دباؤ ڈال کر رتنی کے خلاف مقدمہ درج کروا سکتے ہیں تو ہمیں بھی دباؤ ڈالنا آتا ہے۔ یہ کسی ایک بچے کی بات نہیں ہے، یہ دھرم کی بات ہے۔ آج ان لوگوں نے دباؤ ڈال کر ایک بات منوا لی ہے، کل کچھ اور بھی کر سکتے ہیں۔ اچھا ہے ابھی اسی وقت انہیں انہی کی زبان میں جواب دے دیا جائے۔" اخبار دینک سماچار کے ایڈیٹر ایک مکان کے باہر بنے چبوترے پر کھڑے ہو کر ایک مجمعے سے خطاب کر رہے تھے۔ سمیر وہیں پاس کھڑے اسکوٹر پر بیٹھ کر اپنی نوٹ بک میں نوٹ کرنے لگا۔

"نمستے بھائی صاحب۔" آواز سن کر سمیر نے سر اٹھایا تو دیکھا رتنی کا چاچا سنیل کھڑا ہے۔ سنیل بھی صحافی ہے۔ راجدھانی سے نکلنے والے ایک گمنام اخبار کی پچیس کاپیاں شہر میں مفت تقسیم کرتا ہے اور جیب سے ان کاپیوں کا پیسہ بھر دیتا ہے۔ عوض میں اس کو صحافی ہونے کا کارڈ ملا ہے۔

"اور سنیل، کیا حال ہے؟" سمیر نے پوچھا۔

"بس بھائی صاحب، میں تو یہاں آنا ہی نہیں چاہتا تھا پر صحافی ہونے کے ناتے آ گیا۔" سنیل نے جواب دیا۔

"یعنی تم یہاں رتنی کے چاچا کی حیثیت سے نہیں آئے ہو؟" سمیر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

Scanned with CamScanner

سنیل کچھ جواب دیتا، اس سے پہلے ہی ایک لڑکے نے آ کر کہا: "سنیل بھیا، بینر والا بتا پیسے کے بینر نہیں دے رہا ہے۔" سنیل نے جیب سے اسے سو روپے کا نوٹ نکال کر دیا اور وہ چلا گیا۔

"کیا پوچھ رہے تھے بھائی صاحب؟" سنیل نے کہا۔

"نہیں، کچھ نہیں۔" سمیر نے ہنستے ہوئے کہا۔

"تھوڑا دیکھیے گا بھائی صاحب، ٹھیک ٹھاک کوریج مل جائے۔ چینل وغیرہ پر آتا ہے تو سرکار پر دباؤ پڑتا ہے۔" سنیل نے چاپلوسی والے لہجے میں کہا۔

"تم فکر مت کرو۔" سمیر نے جواب دیا۔

جلوس روانہ ہو چکا تھا۔ سمیر نے سنیل کو چلنے کا اشارہ کیا اور خود بھی ساتھ چل دیا۔ سمیر نے دیکھا، راستے بھر یہی ہوتا رہا کہ کوئی نہ کوئی چیلا چندی سنیل کے پاس آ کر چندہ کی اور سنیل کچھ نہ کچھ جیب سے نکال کر اسے دے دیتا۔ بہت پر جوش نعرے لگاتا ہوا بجرنگ دل کا دستہ بھیڑ کی شکل میں بڑی بہادری سے کلکٹریٹ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ سیل فون وائبریٹ ہوا تو سمیر نے جیب سے نکال کر دیکھا۔ دلی سے چینل کے آفس سے فون تھا۔ اس نے اپنی رفتار تھوڑی دھیمی کر دی۔

"ہاں سمیر، کیا صورت حال ہے؟" لائن پر اودھیش چترویدی تھے۔

"ابھی تک تو کچھ ہوا نہیں ہے اودھیش جی، لیکن جس طرح کے نعرے لگ رہے ہیں اس سے میں پرامید ہوں کہ کچھ نہ کچھ تو ہوگا۔" سمیر نے اپنے لہجے میں بھرے طنز کو دباتے ہوئے جواب دیا۔

"پرامید مطلب؟" اُدھر سے اودھیش چترویدی کی آواز آئی۔

"مطلب، پرامید اس بات کو لے کر ہوں کہ آپ کو کچھ نہ کچھ خبریں تو آج مل ہی جائیں گی۔" سمیر نے کہا۔

"ٹھیک ہے، میں ابھی چار بجے تک تو ہوں۔ اگر آفس کا فون بزی ہے تو فوراً میرے سیل پر کال کرنا۔ ایسا نہ ہو کہ کچھ ہو جائے اور پہلے دوسرے چینل پر فلیش ہو جائے۔" اودھیش چترویدی نے کہا۔

"ٹھیک ہے اودھیش جی۔" سمیر نے اپنے اندر اٹھ رہے جذبات کو دباتے ہوئے مختصر سا جواب دیا اور فون کاٹ دیا۔

Scanned with CamScanner

جلوس اپنی منزل کی طرف پُرجوش طریقے سے بڑھ رہا تھا۔ اشتعال انگیز نعرے بازی چل رہی تھی۔ سمیر نے دیکھا، وندنا سکینہ اور اروند کمار پولیس کی بھاری نفری کے ساتھ میں گیٹ کے اندر ہیں۔ گیٹ باہر سے بند ہے اور باہر بھی پولیس بڑی بھاری تعداد میں ہے۔

"آپ لوگوں میں سے چار پانچ لوگ چل کر میڈم سے بات کر لیجیے۔" ڈی ایس پی نے مجمع کو خاموش رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"کیوں؟ ان لوگوں سے بات کرنے تو میڈم جنازے تک چلی گئی تھیں، ہم میں کیا کانٹے لگے ہیں؟" ایک بزرگ نے کڑوے لہجے میں جواب دیا۔

"دیکھیے، میڈم آپ لوگوں کے لیے ہی یہاں آئی ہیں۔ پلیز، چل کر اپنی بات رکھ دیجیے۔" ڈی ایس پی نے پھر سمجھانے والے انداز میں کہا۔

"ٹھیک ہے، چلیے کر لیتے ہیں بات۔" کہتے ہوئے کچھ لوگ مین گیٹ کی طرف بڑھے۔ مجمع نے گیٹ کے چاروں اطراف گھیرابندی کر رکھی تھی۔ سمیر نے بھی گیٹ کی طرف بڑھنے کی کوشش کی مگر پولیس نے روک دیا۔ کچھ ہی دیر میں بات کرنے گئے لوگ بڑبڑاتے ہوئے اور ہاتھوں کو ہلاتے ہوئے واپس آگئے۔

"بھائیو، ضلعی انتظامیہ نے سنگھ کے خلاف مقدمہ واپس لینے سے انکار کر دیا ہے، اس لیے مجبوراً اب ہمیں گھیراؤ اور مظاہرے کا راستہ اختیار کرنا پڑے گا۔۔۔" سمیر کو اتنا تو سنائی دیا، اس کے بعد ان کی آواز نعرے بازی میں گم ہو گئی۔ چند لوگ ڈسٹرکٹ کلکٹریٹ کے صدر دروازے سے جوتے اور پتھر مارنے لگے۔ جب پولیس کا لاٹھی چارج ہوا تب سمیر ہٹ کر کچھ دور کھڑا ہو گیا اور سیل فون سے وہ چینل ہیڈ ویدی جی کو بریف کرنے لگا۔ اطلاع دینے کے بعد اس نے دیکھا، بھیڑ منتشر ہو چکی تھی۔ سیل فون وائبریٹ ہوا تو سمیر نے اسے آن کیا۔ فون نیوز آفس سے تھا۔

"سمیر جی، ہم کال کو نیوز روم میں ٹرانسفر کر رہے ہیں، نیوز کاسٹر اخلاق ہے جو آپ سے سوال پوچھے گا۔" اور اس کے بعد لائن نیوز روم میں ٹرانسفر ہو گئی۔ "ہاں سمیر، بتائیے، کیا صورت حال ہے وہاں؟" اخلاق کی آواز سنائی دی۔

"جی اخلاق، قریب دو ہزار لوگوں نے آج جلوس نکال کر مظاہرہ کیا تھا۔ یہاں کلکٹریٹ پر

آ کر انھوں نے نعرے بازی کی۔ بعد میں جب کلکٹر نے سنی کے خلاف مقدمہ لینے سے انکار کر دیا تو بھیڑ نے کلکٹریٹ کا گھیراؤ کر لیا، جس پر پولیس نے لاٹھی چارج کر کے بھیڑ کو تتر بتر کر دیا،'' سمیر نے جواب دیا۔

''ابھی کیا صورت حال ہے وہاں؟'' اخلاق کی آواز آئی۔

''جی اخلاق، ابھی شہر میں تو صورت حال کشیدہ ہے پر یہاں لاٹھی چارج کے بعد حالات قابو میں ہیں،'' سمیر نے جواب دیا۔

''سمیر، یہ گھیراؤ کی صورت حال اچانک ہی بن گئی یا پہلے سے اس کے لیے کوئی جواز پیدا کیا گیا تھا؟'' اخلاق کی آواز آئی۔

''اخلاق، یہ سب کچھ پہلے سے طے شدہ تھا کہ اگر مانگیں نہیں مانی گئیں تو پھر گھیراؤ کیا جائے گا،'' سمیر نے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے سمیر، آپ حالات پر نظر رکھیے۔ ہم آپ سے جانکاری لیتے رہیں گے،'' اخلاق کی آواز آئی اور فون کٹ گیا۔

فون کٹنے کے تھوڑی دیر بعد پھر وائبریٹ ہوا۔ اس بار ڈی ایم وندنا سکسینہ لائن پر تھیں۔

''سمیر جی، آپ یہ جھوٹی خبریں کیوں دے رہے ہیں؟'' تلخ لہجے میں وندنا سکسینہ نے کہا۔

''کون سی میڈم؟'' سمیر نے سوال کیا۔

''یہی کہ کلکٹریٹ کا گھیراؤ ہوا؟'' وندنا سکسینہ نے کہا۔

''اس میں جھوٹ کیا ہے؟'' سمیر نے پوچھا۔

''تو کیا آپ سچ بولیں گے؟'' وندنا سکسینہ نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

''جی میں سمجھتا ہوں کہ میرا تعلق ایسے ہی پیشے سے ہے،'' سمیر نے جواب دیا۔

''اور یہ دو ہزار لوگ کہاں تھے؟'' وندنا سکسینہ نے جھنجھلاتے ہوئے کہا۔

''بھیڑ میں تھے میڈم، اور کہاں تھے؟'' سمیر نے جواب دیا۔ سمیر کے جواب کے ساتھ فون ڈس کنیکٹ ہو گیا۔

گھر پہنچ کر سمیر نے ٹی وی کھولا ہی تھا کہ سیل فون پھر تھرتھرا اٹھا۔

"ہیلو سمیر، یہ کیا کر رہے ہو بھئی؟" ادھر سے اودھیش چترویدی کی سہمی ہوئی آواز آئی۔

"کیا ہو گیا اودھیش جی؟" سمیر نے پوچھا۔

"ابھی ابھی تم نے کیا اب ویڈیو فوٹو پر کلکٹریٹ کا گھیراؤ ہوا ہے؟ ہماری ڈی ایم بول رہی ہیں کہ ایسا کچھ نہیں ہوا ہے ابھی۔" اودھیش چترویدی نے گھبرایا جتاتے ہوئے کہا۔

"تو کیا وہ ٹھیک کہہ رہی ہیں؟" سمیر کے لہجے میں لاپروائی کا عنصر تھا۔

"گھیراؤ کا مطلب سمجھتے ہیں آپ؟" اودھیش چترویدی نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"اودھیش جی، گھیراؤ تو ہوا تھا..." سمیر نے بولنے کی کوشش کی مگر اودھیش چترویدی نے بیچ میں ہی بات کاٹتے ہوئے کہا، "اب رہنے دیجیے آپ! ہم آپ سے یہاں کی ڈی ایم کو فون کر رہے ہیں تاکہ اصل صورت حال معلوم کی جا سکے۔" سمیر نے موبائل آف کر دیا۔

سامنے ٹی وی پر وندنا سنہا کا فوٹو چل رہا تھا کہ "شہر میں صورت حال بالکل معمول کے مطابق ہے، کہیں کوئی تناؤ نہیں ہے۔ کلکٹریٹ کے گھیراؤ جیسی کوئی صورت حال پیش نہیں آئی۔ کچھ تنظیموں نے آج اپنی مانگیں رکھی ہیں جن پر ہم غور کر رہے ہیں۔" ٹی وی کا سوئچ آف کر کے سمیر کھڑکی کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔

ساری دکانیں بند تھیں۔ چاروں طرف سناٹا چھایا ہوا ہے۔ جس طرح ابھی تھوڑی دیر پہلے وندنا سنہا اپنے بیان میں بتا رہی تھیں، یہ شاید ان کے بیان کی صداقت تھی کہ پورا شہر خاموش ہے۔ سچ کا سناٹا کتنا خوفناک ہوتا ہے؟ جب وہ کانوں سے ٹکراتا ہے تو بہت بھیانک لگتا ہے۔ جب تک اس پر صداقت کی مہر نہیں لگتی تب تک سب اسے پسند کرتے ہیں مگر وہ جیسے ہی سچ بن جاتے ہیں تو پسند کرنے والے لوگ ہی واویلا مچانے لگتے ہیں۔ کافی دیر تک سمیر وہیں کھڑا رہا اور خاموشی کی وحشت کو محسوس کرتا رہا۔ چاروں طرف دن دہاڑے ہی خاموشی پھیل جائے تو وہ خاموشی بھی عجیب سی وحشت پیدا کرتی ہے دلوں میں۔ واپس آ کر ٹی وی آن کیا تو دیکھا کہ اس بار پھر ڈی ایم وندنا کا فوٹو چل رہا ہے جو کہ بار بار ایک ہی بات دہرا رہی ہیں کہ "شہر کی صورت حال معمول کے مطابق ہے، کہیں کوئی تناؤ نہیں ہے۔ کلکٹریٹ پر کوئی مظاہرہ یا گھیراؤ نہیں ہوا، نہ ہی کسی طرف سے طاقت کا استعمال ہوا۔"

سمیر کو لگا کہ اسے چاروں طرف سے ایک بھیڑ گھیرتی جا رہی ہے۔ بھیڑ کا کچھ حصہ پیلا ہے تو کچھ حصہ ہرا ہے۔ ایک طرف سے آ رہی پوری بھیڑ خاکی رنگ کی ہے۔ یہ بھیڑ اس کا گھیراؤ کرتی جا رہی ہے۔ سب لوگ اپنے اپنے رنگ کے حساب سے نعرے لگا رہے ہیں۔ سب کے چہرے تنے ہوئے ہیں اور مٹھیاں بھنچی ہوئی ہیں۔

سمیر نے بند پڑے سیل فون کو آن کیا اور میز پر رکھ دیا اور انتظار کرنے لگا چینل کے ہیڈ آفس سے آنے والے فون کا: ''مسٹر سمیر، یو آر فائرڈ۔''

گھیراؤ ہو چکا تھا۔ اور شہر ابھی بھی پر امن تھا...

❋ ❋

لکھنے والوں کا تعارف

پھنیشور ناتھ رینو

پھنیشور ناتھ رینو (1921-1977) ہندی کے ان جدید کہانی کاروں میں نمایاں مقام رکھتے ہیں جنھوں نے پریم چند کی درخشاں روایت کو آگے بڑھایا اور اس میں قیمتی اضافے کیے۔ انھوں نے ہندی میں آنچلک یا علاقائی کہانی کی شروعات کی جس کے ذریعے مختلف خطوں سے آنے والے ہندی فکشن نگاروں نے اپنے اپنے علاقے کی مخصوص فضا، لہجے، کرداروں اور انسانی صورت حال کو زبردست اعتماد کے ساتھ ہندی فکشن کے مرکزی دھارے میں شامل کیا۔ رینو بہار کے ضلع ارریا کے قصبے فوربس گنج کے قریب اوراہی ہنگنا نامی گاؤں میں پیدا ہوئے۔ ان کی ابتدائی تعلیم نیپال میں ہوئی جس کے بعد انھوں نے بنارس کی ہندو یونیورسٹی میں داخلہ لیا لیکن 1942 میں وطن کی آزادی کی جدوجہد میں شامل ہو گئے۔ بعد میں، 1950 کی دہائی میں، انھوں نے نیپال کی انقلابی تحریک میں بھی حصہ لیا جس کے نتیجے میں وہاں جمہوریت کی بنیاد پڑی۔ 1970 میں انھیں ہندوستان کا اعلیٰ ترین شہری اعزاز پدم شری پیش کیا گیا جو انھوں نے چند سال بعد جے پرکاش، ان کی رہنمائی میں چلنے والی سیاسی تحریک کے دوران احتجاجاً واپس کر دیا۔

رینو کا پہلا ناول میلا آنچل 1954 میں شائع ہوا جسے پریم چند کے گئودان کے بعد کے دور کا ایک اہم ہندی ناول سمجھا جاتا ہے۔ ان کے دیگر ناولوں میں پرتی پری کتھا، جلوس اور جنازہ، کتنے چوراہے اور پلٹو بابو روڈ شامل ہیں۔ ان کی کہانیوں کے کئی متعدد مجموعے شائع ہوئے جن میں سے چند کے نام مارے گئے گلفام، لال پان کی بیگم، ٹھیس، لکشمی، اگنی خور، اچھے آدمی، ایک شراونی دوپہری، پری اور میمو کی کہانیاں ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے اپنی یادداشتیں بھی تحریر کیں جو کئی جلدوں میں شائع ہوئیں۔ موجودہ انتخاب میں شامل کہانیاں رینو کے مجموعے اچھے آدمی سے لی گئی ہیں۔

مدرارا کھشس

ہندی کی معاصر کہانی اور تھیٹر میں ممتاز مقام رکھنے والے مدرارا کھشس (اصل نام سبھاش چندر آریہ) 1933 میں لکھنؤ کے قریب بیہتا نامی قصبے میں پیدا ہوئے۔ لکھنؤ یونیورسٹی سے ایم اے کرنے کے بعد انھوں نے ادبی صحافت کو پیشے کے طور پر اختیار کیا اور اس کا آغاز کلکتہ سے شائع ہونے والے گیان ادے کی نائب مدیری سے کیا۔ کئی رسالوں کی ادارت کے بعد انھوں نے آل انڈیا ریڈیو کے اسکرپٹس کے شعبے میں ملازمت کر لی۔ ڈرامے کے میدان میں ان کے اولین استاد ان کے باپ شیو چرن لال پریم تھے جو اتر پردیش کے اس علاقے کے مقبول عام سوانگ تھیٹر میں حصہ لیتے تھے۔ ادب کے میدان میں انھوں نے اپنے نانا آچاریہ چترسین شاستری کا اثر قبول کیا جو ایک نمایاں ادبی شخصیت تھے۔ مدرارا کھشس نے پچاس برس سے زیادہ کی تخلیقی زندگی میں بہت سی کہانیاں، ناول، ڈرامے اور مضامین لکھے۔ ان کے مشہور ڈراموں میں مرجیوا، یورود، فیحہ قلی، تیندوا، تلچٹا، گھاتیں، ڈاکو اور اعلیٰ افسر شامل ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے دس ناول اور کہانیوں کے متعدد مجموعے شائع ہوئے۔ مدرارا کھشس کی کہانیاں اس سے پہلے آج کے کئی شماروں میں شائع ہو چکی ہیں۔ اس بار ان کی کہانیوں کا ایک نسبتاً جامع انتخاب شامل کیا جا رہا ہے جس سے ان کے موضوعات کے تنوع اور کثرت سمت کے اہتمام دونوں کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

اصغر وجاہت

اصغر وجاہت 1946 میں اتر پردیش کے ضلع فتح پور میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ہندی میں ایم اے اور پی ایچ ڈی کیا اور تدریس کو پیشے کے طور پر اختیار کیا۔ 1971 سے وہ جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی، کے ہندی کے شعبے سے وابستہ ہیں۔ اصغر وجاہت کی بیس سے زیادہ کتابیں شائع ہو چکی ہیں جن میں پانچ ناول، چھ ڈرامے، کہانیوں کے پانچ مجموعے اور ایک سفرنامہ شامل ہے۔

Scanned with CamScanner

پنکج سبیر

پنکج سبیر ہندی کہانی کاروں کی نئی نسل سے تعلق رکھتے ہیں جس نے پچھلے دس پندرہ سال میں لکھنا شروع کیا۔ وہ 1975 میں پیدا ہوئے اور بھوپال کی برکت اللہ یونیورسٹی سے سائنس میں ماسٹرز کیا۔ وہ کئی ہندی اخباروں میں مضامین لکھتے رہے ہیں اور اب اپنی نیوز ایجنسی چلاتے ہیں۔ ان کے ناول یہ وہ سحر تو نہیں کو 2010 میں بھارتیہ گیان پیٹھ کا نوجوان ایوارڈ دیا گیا۔ ان کی کہانیوں کا پہلا مجموعہ ایسٹ انڈیا کمپنی تھا جس سے اس انتخاب میں شامل تینوں کہانیاں لی گئی ہیں۔

Scanned with CamScanner

جعفر زٹلی

زٹل نامہ

(کلیات)

مرتب: رشید حسن خان

قیمت: 300 روپے

اردو زبان اور ادب کے تاریخ نگاروں سے دو بڑی غلط فہمیاں ہو گئیں۔ ایک یہ کہ شمالی ہند میں اردو شاعری کا آغاز غزل گوئی سے ہوا اور دوسری یہ کہ شمالی ہند میں غزل ہی اردو شاعری کا اصل سرمایہ ہی ہے۔ جعفر زٹلی کا تعلق ولی ہی کے زمانے سے ہے، اور زٹل نامہ کے عنوان سے جعفر کا دیوان ولی کے دلی آنے سے برسوں پہلے مرتب کیا جا چکا تھا۔ جعفر کے کلیات میں ایک بھی غزل نہیں۔ اس طرح یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ دلی میں اردو کی شعری روایت کی بنیاد رکھنے والوں میں جعفر کو اولیت حاصل ہے، اور یہ کہ دلی میں اردو شاعری کا آغاز غزل گوئی سے نہیں، سماجی حقیقت نگاری سے معمور شاعری سے ہوا جو تمام تر نظموں پر مشتمل ہے۔

جعفر زٹلی کا کلام ایک طرف شمالی ہند میں ارتقائے زبان کی پہلی کڑی کی حیثیت رکھتا ہے اور دوسری طرف سماجی مسائل، معاملات کے پرزور اور پرشور بیان سے، وہ ایسا شاعر ہے جس نے اپنے عہد کی ترجمانی کی ہے۔ کلام جعفر کی یہ بڑی اہمیت ہے کہ اس کی بنیاد پر ہم دعویٰ کر سکتے ہیں کہ شروع ہی سے اردو شاعری میں سماجی مسائل و مشکلات کا بے لاگ بیان موضوع سخن رہا ہے۔ موضوع کی مناسبت سے لہجے میں بے باکی ہے اور تلخی بھی۔ جعفر کی روایت کا یہ حصہ گزشتہ سماجی حالات، بیکاری، بدنظمی، فلاکت اور سب کے بیچ کہے بیانات اس کی شاعری میں محفوظ ہو گئے ہیں۔ وہ وقت اور وہ حالات جن کے نتیجے میں یہ صورت پیدا ہوئی تھی، ان کا نام لے کر ان کو اس کا ذمے دار بتانا، یہ صاف گوئی اور بے باکی بھی اس شاعری کا حصہ رہی ہے۔ وہ زمانہ مطلق العنان شخصی حکومت کا تھا، آج کل جیسی جمہوریت کا نہیں تھا۔ اس زمانے میں واقعات پر زبان کھولنی بھی ایسے زمانے میں یہ بے باک بلند گفتاری داد کے قابل ہے۔ اردو دلی کی اس روایت سے جس کا سب سے بڑا نمائندہ جعفر ہے، ایک بڑا کام یہ بھی کیا کہ اس نے اٹھارویں صدی میں اس عہد سے پہلے فروغ پایا جس کے غیر حقیقی شاعرانہ رجحانات نہیں ہو پاتی، لہجے کے بھاری پن کو برقرار رکھا، پرشور نعتیات کا لہجہ ہم سب بیان اور شیرینی پن سے محفوظ رکھا اور اس آہنگ کی تشکیل کی جو روایت سے دور ہے۔

جعفر زٹلی کا کلام شمالی ہند میں رہتا ہے، زبان کی ابتدائی شکل صورت کو پیش کرتا ہے۔ اس میں ریختہ کی ابتدائی مثالیں محفوظ ہیں اور نعتیات کا اتنا بڑا ذخیرہ ہے جس کو ادب، زبان، لغت اور لسانیات کا کوئی سنجیدہ طالب علم نظرانداز نہیں کر سکتا۔

Scanned with CamScanner

صادق ہدایت

بوف کور

فارسی سے ترجمہ: اجمل کمال

قیمت: 200 روپے

[illegible] دھارے سے جوڑ دیتا ہے۔

[illegible]

[illegible] The Blind owl کو بھی پیش نظر رکھا گیا ہے۔

Scanned with CamScanner

ارشد محمود

ثقافتی گھٹن اور پاکستانی معاشرہ

قیمت: 200 روپے

ہم نے اپنے ماحول اور انفرادی و اجتماعی زندگی کو اس حد تک جامد، خشک، بور، بے کیف، حسن اور لطف سے عاری بنا لیا ہے کہ بحیثیت حیوان جن جبلی خوشیوں پر ہمارا حق ہو سکتا تھا، یہ کہہ کر کہ ہم حیوان نہیں انسان ہیں، ان سے خود کو محروم کر لیا، اور انسان ہونے کے ناتے جن خوشیوں پر حق ہو سکتا تھا انہیں یہ کہہ کر رد کر دیا کہ ہم انسان نہیں مسلمان ہیں۔ یہ ہے ہمارا ثقافتی المیہ۔ نتیجہ یہ کہ ہم اجتماعی طور پر حسن کے احساس اور خوشیوں کی لذت سے آشنا ہی نہیں ہیں، بلکہ اس کے بیری بن چکے ہیں۔ اب سنجیدگی کا مارا، تاریکی پسند اور جمالیاتی حسوں سے محروم انبوہ، سماجی تہذیب نو سے اپنی ثقافتی، سیاسی اور معاشی دشمنی میں مشغول بے چارہ ہو رہا ہے۔ زندان اور موت کی علامتوں سے اپنی شناخت بنانے میں فخر محسوس کرتا ہے۔ خوش نیتی حقیقت ہے کہ پچاس سال کے بعد ہمارے ماحول میں فرد کی گھٹن اور بے زاری اس حد تک پیدا ہو گئی ہے کہ لوگوں کے اندر زندگی اور دنیا کو خوبصورت بنانے یا اسے ترقی دینے کی لگن اور دلچسپی کہیں دکھائی نہیں دیتی۔ ایک طرف ہماری طاقتور ایلیٹ (elite) حکمران کلاس ہے، جو ثقافتی اور سماجی سطح کی سب جبلی لذتوں سے بہرہ مند ہے۔ اس نے اخلاقیات اور پاک دامنی کے سب اسباق عام آدمی کے لیے رکھ چھوڑے ہیں، تاکہ عوام سے چھینی خوشیوں پر قبضہ جاری رکھا جا سکے۔ دوسری طرف کروڑوں عوام کا وہ جم غفیر ہے جہالت اور غربت جس کا مقدر ہے اور یہ مقدر بھی طاقتور طبقے کا لکھا ہوا ہے۔ وہ خوبصورتی اور لذتوں کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے۔ کسی بھی سوسائٹی کی ساری تڑپ، جدوجہد اور امید کی کرن صرف متوسط طبقہ ہوتا ہے۔ وہ کون سا انسان ہے جسے اپنے لیے اور اپنی آئندہ نسلوں کے لیے خوبصورتی اور خوشیاں درکار نہیں۔ اگر ایسا ہے تو پھر ہمیں اپنے اوپر سے مسلط شدہ اداسی کا چولا اتار پھینکنا چاہیے اور خوبصورت بننے، ماحول کو خوبصورت کرنے اور ہر ایک نے اپنے انداز سے خوش ہونے کے حق کا مطالبہ کرنا چاہیے۔ اگر اس طبقے کی مزاحمت نہیں کریں گے جو ثواب اور پارسائی کے نام پر پورے معاشرے کو بلیک میل کرتا ہے، اسے پیچھے رہنے، گھٹن زدہ اور بیمار زندگی گزارنے پر مجبور کرتا ہے تو ہمارے اس وطن میں تہذیب و تمدن کے بچے کھچے آثار بھی ختم ہو جائیں گے۔ یہ کتاب اسی سمت کی کاوش ہے۔

Scanned with CamScanner

رشارد کاپوشنسکی

شہنشاہ

انگریزی سے ترجمہ: اجمل کمال

قیمت: 200 روپے

[illegible] 1979 [illegible] (Ryszard Kapuscinski) [illegible] shah of shah [illegible] 1993 [illegible] 14 [illegible] 1997 [illegible]

[illegible]

[illegible]

نیر مسعود کی کتابیں

عطر کافور
(کہانیاں)
قیمت: 80 روپے

ایرانی کہانیاں
(ترجمے)
قیمت: 90 روپے

انیس
(سوانح)
قیمت: 375 روپے

مرثیہ خوانی کا فن
(تنقید و تحقیق)
قیمت: 150 روپے

منتخب مضامین
(تنقید و تحقیق)
قیمت: 280 روپے

کافکا کے افسانے
(افسانے)
قیمت: 70 روپے

معرکۂ انیس و دبیر
(تنقید و تحقیق)
زیر طبع

گنجفہ
(کہانیاں)
قیمت: 200 روپے

Scanned with CamScanner

آج کی کتابیں

کہانیاں

آئینۂ حیرت اور دوسری تحریریں	سید رفیق حسین	Rs. 375
عطر کافور	نیر مسعود	Rs. 80
ترید اور دوسری کہانیاں	اسد محمد خان	Rs.180
خط مرموز	فہمیدہ ریاض	Rs.100
ایک اور آدمی	حسن منظر	Rs.85
عاقبت کا توشہ	نکہت حسن	Rs.85
دور کی آواز	فیروز مکرجی	Rs.150
صحرا کی شہزادی	سکینہ جلوانہ	Rs.120

کہانیوں کے ترجمے

ایرانی کہانیاں	انتخاب اور ترجمہ: نیر مسعود	Rs.90
عربی کہانیاں	ترتیب: اجمل کمال	Rs.180
ہندی کہانیاں (جلد 1)	ترتیب اجمل کمال	Rs.180
ہندی کہانیاں (جلد 2)	ترتیب: اجمل کمال	Rs.180
ہندی کہانیاں (جلد 3)	ترتیب: اجمل کمال	Rs.180
کارل اور انا	(منتخب ترجمے) محمد سلیم الرحمن	Rs.80
گم شدہ خطوط	(منتخب ترجمے) محمد عمر میمن	Rs.90
مہر سکوت	(منتخب ترجمے) زینت حسام	Rs.120
کلی منجارو کی برفیں	(منتخب ترجمے) محمد خالد اختر	Rs.120

Scanned with CamScanner

انتخاب

منتخب تحریریں	گابریئل گارسیا مارکیز	ترتیب: اجمل کمال	(زیرِ طبع)
منتخب تحریریں	نرمل ورما	ترتیب: اجمل کمال	Rs.280
منتخب کہانیاں	ویکوم محمد بشیر	ترتیب: مسعود الحق	Rs.180
پریم وانی	میرا بائی	ترتیب: سردار جعفری	Rs.395
کبیر بانی	کبیر	ترتیب: سردار جعفری	Rs.395

ناول

بیس سو گیارہ	محمد خالد اختر	Rs. 70
گنگا جمنی میدان	اختر حامد خاں	Rs.120
دائرہ	محمد عاصم بٹ	Rs.100
نمبردار کا نیلا	سید محمد اشرف	Rs.60

ناولوں کے ترجمے

حبس	بھیشم ساہنی	ترجمہ: شہلا نقوی	Rs.180
قلبِ ظلمات	جوزف کونریڈ	ترجمہ: محمد سلیم الرحمن	Rs.80
بوفِ کور	صادق ہدایت	ترجمہ: اجمل کمال	(زیرِ طبع)
خیمہ	میرال طحاوی	ترجمہ: اجمل کمال	Rs.75
نوکری کی قمیص	ونود کمار شکل	ترجمہ: عامر انصاری، اجمل کمال	Rs.100
پہلی بارش	خولیو لیاماز ارِس	ترجمہ: اجمل کمال	Rs.95
سرزمینِ مصر میں جنگ	یوسف القعید	ترجمہ: اجمل کمال	Rs.125
درخت نشین	اتالو کلوینو	ترجمہ: راشد مفتی	Rs.175
شہزادہ احتجاب	ہوشنگ گلشیری	ترجمہ: اجمل کمال	Rs.70
انگلی کے دیس میں	والاس سارنگ	ترجمہ: گوری پٹوردھن، اجمل کمال	Rs.150
امید اور دوسرے خطرناک مشاغل	لیلیٰ العلمی	ترجمہ: محمد عمر میمن	Rs.100

Scanned with CamScanner

شاعری

پریم وانی	میرابائی	ترتیب: سردار جعفری	Rs.395
کبیر بانی	کبیر	ترتیب: سردار جعفری	Rs.395
کلیات اختر الایمان	اختر الایمان	ترتیب: سلطانہ ایمان/بیدار بخت	Rs.350
مٹی کی کان	افضال احمد سید	(کلیات)	Rs.500
روکوکو اور دوسری دنیائیں	افضال احمد سید		Rs.50
آدمی کی زندگی	فہمیدہ ریاض		Rs.70
ساری نظمیں	ذی شان ساحل	(کلیات)	(زیرِ طبع)
جنگ کے دنوں میں	ذی شان ساحل		Rs.125
ای میل اور دوسری نظمیں	ذی شان ساحل		Rs.150
نیم تاریک محبت	ذی شان ساحل		Rs.100
رات	سعید الدین		Rs.50
سارے چراغ کے	احمد عظیم		Rs.150
مٹی کا مضمون	فرخ یار		Rs.150
سویرے کا سیاہ دودھ	پاؤل سیلان	ترجمہ: آفتاب حسین	Rs.150
بارہ ہندوستانی شاعر	(انتخاب)	ترتیب: اجمل کمال	(زیرِ طبع)
خودکشی کے موسم	زاہد امروز		Rs.120

Scanned with CamScanner

۴۷

خصوصی شمارہ: ہندی کہانیاں

قیمت

۳۰۰ روپے

آج کی کتابیں

۳۱۶ مدینہ سٹی مال، عبداللہ ہارون روڈ،

صدر، کراچی ۷۴۴۰۰

Scanned with CamScanner